عرش صہبائی نمبر
شیرازہ
جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ماہنامہ

شیرازہ

سری نگر، کشمیر

جلد:۵۶ | عرشؔ صہبائی نمبر | شمارہ:۳۔۴

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ناشر: سیکریٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

کمپیوٹر کمپوزنگ / سرورق: عادل کمپیوٹرس، سرینگر

ISSN نمبر : 2277-9833

اشاعت : مارچ۔اپریل 2018ء

قیمت : ۵۰/ روپے

''شیرازہ'' میں جو مضامین اور تخلیقات شائع ہوتی ہیں اُن میں ظاہر کی گئی آراء سے اکیڈیمی کا کلاًّ یا جزواً اتفاق ضروری نہیں۔

(ادارہ)

☆......خط و کتابت کا پتہ:

مدیر ''شیرازہ'' اُردو

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

لال منڈی، سرینگر، کشمیر۔ 190008

ای میل: salimsalik2012@gmail.com

فون نمبرات: 9419711330 - 9419072288

فہرست

عرش صہبائی - مشاہیر کی نظر میں: ۲۱۰

انتخابِ کلامِ عرش

....

●●●

حرفِ آغاز

حسبِ وعدہ شیرازہ کا عرشؔ صہبائی نمبر آپ کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے ہم ایک اہم ذمہ داری سے سبکبار ہو رہے ہیں۔ عام شکایت ہے کہ علمی، ادبی اور ثقافتی شخصیات پر خصوصی اشاعتوں کا اہتمام تب کیا جاتا ہے جب وہ ہمارے درمیاں نہیں رہتیں لیکن ہماری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اِس شکایت کا ازالہ کیا جائے۔ زیرِ نظر خصوصی شمارے کی اشاعت ہماری اِن ہی کوششوں کا حصّہ ہے۔

عرشؔ صاحب اُردو کے قصرِ ادب کے مینار ہیں۔ اُن کی شاعری میں فکر و جذبہ کا اظہار موجود ہے۔ اُن کے کلام میں مسرّتِ درد کی جو شعاع ریزی چمکتی دِکھائی دیتی ہے وہ اذیت نہیں دیتی اور نہ قنوطیت کی راہ دکھاتی ہے البتہ دل سوزی اور گرفتگی پیدا کرتی ہے۔ اُنہوں نے عصری تقاضوں اور اِس کے مسائل کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ اُنہیں وقت کے ساتھ ہم رشتہ ضرور کر دیا ہے۔ عرشؔ صاحب آلامِ زندگی اور آلامِ عشق کے لطیف احساس کو بڑی فنکاری کے ساتھ پیش کرنے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں، جس سے اُن کے اشعار میں بلاغت کے ساتھ ساتھ نغمگی پیدا ہوتی ہے۔

دِل کا لہو نچوڑ، نہ فن کی تلاش کر
اِس بے شعور دَور میں فکرِ معاش کر

عرشؔ صاحب کے کلام میں رومانی اور عشقیہ خوشبو کے ساتھ کرب واَذیت کا سایہ بھی
جا بجا پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن اِس میں ہلکی لطافت بھی ہے۔ اشعار میں درد وغم کی اُٹھنے والی
کسک قنوطیت کی پروردہ نہیں بلکہ رجائیت سے ہم رشتہ ہیں۔ حسرت ویاس کے پسِ پردہ فریاد
بھی ہے، آنسو بھی ہیں اور خواہشات بھی۔۔۔!

مجھے خلوص سے بڑھ کر نہیں ہے کچھ درکار
میں بِک رہا ہوں، مری زندگی کا سودا کر

قصہ طویل ہے، اس کو مختصر کرتے ہوئے اِدارہ اُن تمام مقالہ نگار حضرات کا شکر گزار
ہے جنھوں نے ہماری گزارشات کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے ہمیں اپنی نگارشات ارسال کیں اور
مفید مشوروں سے نوازا۔ اُردو شعبے سے وابستہ محمد سلیم سالکؔ، سلیم ساغرؔ اور محمد اقبال لون نے
حسبِ روایت عرق ریزی سے کام لیتے ہوئے اِس اہم پروجیکٹ کو پایۂ تکمیل تک پہنچادیا جس
کے لئے وہ شاباشی کے مستحق ہیں۔

اِس سعیِ جمیلہ کے لئے ہمیں قارئین کی آرا کا انتظار رہے گا۔ بقولِ عرشؔ صہبائی۔

اچھی ہیں رحمتیں میرے پروردگار کی
دن ہی قرار کے ہیں نہ راتیں قرار کی
دو چار گھونٹ کے لئے پیرِ مے کدہ
لینا نہ بد دُعائیں کسی بادہ خوار کی

☆

☆......محمد اشرف ٹاک

☆......ڈاکٹر اعجاز حسین شاہ

زندگی نامہ۔ عرشؔ صہبائی

اصل نام : ہنس راج ابرول

تخلص : عرشؔ

ولادت : ۳ر دسمبر ۱۹۳۰ء

جائے ولادت : گاؤں سیری پلائی (باختنؔ) تحصیل اکھنور، جموں (ننہال میں)

آبائی وطن : گاؤں جب۔ ضلع اودھم پور (جموں)

مستقل سکونت : جموں (پہلے کچی چھاونی، ۱۹۷۴ء کے بعد ریشم گھر کالونی جموں)

والد : شری مادھو رام ابرول (فوج میں بطورِ حوالدار اسکول ماسٹر تھے)

والدہ : رام رکھی (وفات ۲۵ر دسمبر ۱۹۳۰ء)

تعلیم:

ابتدائی تعلیم : گورنمنٹ پرائمری اسکول کچی چھاونی و دھونتھلی (جموں)

دسویں جماعت : ۱۹۴۸ء (گورنمنٹ رنبیر ہائی اسکول (اب ہائر سیکنڈری) جموں)

گیارھویں جماعت: ۱۹۴۹ء (گاندھی میموریل کالج، جموں)

ملازمت

ملازمت اوّل : ۱۹۵۱ء (ریجنل ریسرچ لیبارٹری میں بطور کلرک)

ملازمت اول سے مستعفی: ۱۹۵۴ء (یہ ملازمت ان کی طبیعت کے موافق نہ تھی)

ملازمت دوم : ۴ر اپریل ۱۹۵۵ء (ریڈیو میں بطور کلرک)

ملازمت سے سبکدوشی: ۱۹۸۸ء بحیثیت ایڈمنسٹریٹیو آفیسر

ازدواجی زندگی

شادی : ۳ر فروری ۱۹۵۵ء (جالندھر (پنجاب) کے ایک معزز خاندان میں ہوئی)

شریکِ حیات : کملا ابرول (وفات ۲۰ر فروری ۲۰۰۸ء)

اولاد : تین لڑکیاں اور ایک لڑکا

بڑی بیٹی : گیتا سہانی (ایم۔اے انگلش)..

دوسری بیٹی : ریکھا گندوترہ (ایم۔اے سنسکرت)

بیٹا : ارون کمار ابرول (بی۔کام، سرکاری ملازم)

چھوٹی بیٹی : امیتا سوری (بی۔اے) (سبھی شادی شدہ ہیں)

ادبی زندگی:

شاعری کا باقاعدہ آغاز: ۱۹۵۰ء سے

بیرون ریاست پہلا مشاعرہ: ۱۹۵۱ء (پٹھان کوٹ (پنجاب) میں اپنا کلام سنایا)

اُستاد : جوش ملسیانی (عرش اپنا کلام اصلاح کے لئے اُن کے پاس بھیجتے رہے۔)

رسالہ میں پہلی غزل: پہلی بار ۱۹۵۴ء میں رسالہ ''بیسویں صدی'' میں ان کی غزل شائع ہوئی۔

شعری مجموعے

۱۔ شکستِ جام ۱۹۵۸ء (پہلا شعری مجموعہ)

۲۔ شگفتِ گل ۱۹۶۱ء (ریاستی کلچرل اکیڈمی سے انعام یافتہ)

۳۔ صلیب ۱۹۷۱ء

۴۔ یہ جھونپڑے یہ لوگ ۱۹۷۲ء

۵۔ اسلوب ۱۹۹۱ء (ریاستی کلچرل اکیڈمی سے انعام یافتہ)

۶۔ ریزہ ریزہ وجود ۱۹۹۵ء (ریاستی کلچرل اکیڈمی سے انعام یافتہ)

۷۔ اساس ۲۰۰۱ء ۸۔ نایاب ۲۰۰۴ء

۹۔ توازن ۲۰۰۵ء ۱۰۔ دسترس ۲۰۰۷ء

۱۱۔ چشم نیم باز ۲۰۰۷ء ۱۲۔ عکس جمال ۲۰۰۷ء

۱۳۔ خدوخال ۲۰۰۸ء

۱۴۔ خوشبو ترے بدن کی ۲۰۰۹ء (ہندی)

۱۵۔ تجھ بن چین کہاں ۲۰۰۹ء

۱۶۔ سائے تری یادوں کے ۲۰۱۰ء (ہندی/اُردو)

۱۷۔ جواز ۲۰۱۱ء

۱۸۔ شبنم تری یادوں کی ۲۰۱۳ء

۱۹۔ آگہی ۲۰۱۷ء

تذکرے

۱۔ انجم کدہ ۱۹۶۳ء

۲۔ یہ جانے پہچانے لوگ ۱۹۶۶ء

عرشؔ صہبائی پر تنقیدی و تحقیقی کتابیں:

۱۔ دل کے خواب ادھورے (مقبول عام اشعار) ڈاکٹر کرن سنگھ کرن

۲۔ عرشؔ صہبائی۔ شخصیت اور شاعری پروفیسر شاذ شرقی

۳۔ عصری آگہی کا شاعر۔ عرش صہبائی غلام جیلانی یکتاؔ

۴۔ عرشؔ صہبائی: اردو غزل کی عہد ساز شخصیت ڈاکٹر کوشل کرن ٹھاکر

☆☆☆

☆......پروفیسر شاذ شرقی

عرشؔ صہبائی: حالاتِ زندگی

ریاست جموں و کشمیر اپنے قدرتی مناظر کے لئے مشہور و معروف ہے اور قدرت نے اسے خاص تہذیب و تمدن سے بھی مالا مال کیا ہے۔ امن و استقلال اِس ریاست کا خاصا رہا ہے، یہاں کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہاں شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے تھے۔ عالمی برادری، اخوت اور بھائی چارہ یہاں کی تاریخ رہی ہے، یہاں قدرتی مناظر سے شاعروں اور ادیبوں کو ایک تحریک ملتی ہے۔ یہ سرزمین صوفیوں اور سنتوں کے لئے قرار کی جگہ رہی ہے۔ یہ ریاست شعروادب، عقل و حکمت اور علم و عرفان کا گہوارہ رہی ہے۔ اِس سرزمین میں متعدد قد آور اور بُلند مرتبہ شاعروں اور ادیبوں کا جنم ہوا، جنھوں نے جموں و کشمیر کا نام برصغیر میں روشن کیا ہے اور تاریخِ ادب میں بھی نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ اِس کارواں کے عالموں، فاضلوں، دانشوروں، شاعروں اور نقادوں کا ذکر کرتے وقت جناب عرشؔ صہبائی کی نگارشات اور ادبی خدمات کو ہرگز فراموش نہیں کر سکتے۔ ادبی دُنیا میں وہ اپنا ایک ممتاز اور قابلِ قدر مقام رکھتے ہیں اور اِن کا تعلق اِسی جنت نظیر ریاست جموں و کشمیر کے صوبہ جموں سے ہے۔

پیدائش:

دسویں جماعت کے دستاویز (سرٹیفکیٹ) کے مطابق عرشؔ صہبائی کا یومِ ولادت ۳؍دسمبر ۱۹۳۰ء ہے جبکہ اِن کی جنم کنڈلی کے مطابق یہ ۴؍دسمبر ۱۹۳۰ء ہے، وہ جموں سے کافی دُور

اپنے ننھیال میں پیدا ہوئے۔ یہ جگہ سیری پلائی (باختن) کے نام سے جانی جاتی ہے۔

باختن میں عرشؔ نے اپنی زندگی کے ابتدائی سال گزارے۔ قدرت کی ستم ظریفی کہ موصوف ابھی ۲۲ دِن کے ہی تھے کہ اِن کی والدہ محترمہ رام رکھی اس جہانِ فانی سے انتقال کر گئیں اور یوں والدہ کی شفقت سے محروم ہو گئے۔ انہیں اس بات کا احساس بھی نہیں کہ والدہ کی محبت کیا چیز ہوتی ہے، ان کے والد صاحب جناب مادھو رام ابرول جموں میں رہتے تھے۔ عرشؔ صاحب کے بڑے بھائی ودیا پرکاش ابرول جموں میں والد صاحب کے پاس رہتے تھے اور وہیں زیرِ تعلیم بھی تھے۔ اِس زمانے میں سرکاری اسکولوں میں داخلے کے لئے کم سے کم سات سال کی عمر درکار ہوتی تھی۔ عرشؔ اس لئے بھی اپنی نانی کے پاس رہے کہ اِن کی مناسب دیکھ بھال ہوتی رہے۔ عرشؔ صاحب کے مطابق اُن کی نانی محترمہ پاروتی نہایت ہی نیک دِل خاتون تھی، گھر میں نوکر چاکر بھی تھے، کسی چیز کی کمی نہیں تھی وہ خود ہی اِن کا پوری طرح خیال رکھتی تھیں۔

عرشؔ کی نانی نے عرشؔ کا نام ہنس راج ابرول رکھا تھا۔ عرشؔ کہتے ہیں کہ پوری وادی میں یہ پہلا نام تھا جو ڈھنگ کا تھا ورنہ وہی سیدھے اُلٹے نام جو آج سے کئی برس پہلے رکھے جاتے تھے۔

موصوف اپنے بچپن کے سات سال کا عرصہ پورا ہونے کے بعد اپنے والدِ محترم کے پاس جموں چلے آئے، کیونکہ ان اُن کی پڑھائی کا معاملہ تھا اور ننھیال میں کوسوں دور تک کوئی اسکول نہیں تھا۔

آغازِ تعلیم:

عرشؔ جب پہلی جماعت میں داخل ہوئے تو ان کا سکول ان کے گھر کے ساتھ ہی تھا۔ بعد میں یہ سکول ان کے گھر کے نزدیک دھونتھلی بازار میں منتقل ہو گیا اور دھونتھلی پرائمری سکول کہلایا۔ غربت کے باوجود عرشؔ کے گھر کا ماحول بڑا شگفتہ تھا، اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ان کے والد صاحب نہایت خوش طبع شخصیت کے مالک تھے۔ جو مصیبت بھی آتی اس سے خندہ پیشانی سے جھیل لیتے تھے۔

پرائمری سکول کی پڑھائی سے فارغ ہونے کے بعد عرشؔ گورنمنٹ رنبیر ہائی سکول

جموں میں مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے داخل ہو گئے۔ چھٹی جماعت سے لیکر آٹھویں جماعت تک ان کے فارم ماسٹر لالہ کرپا رام مینگی تھے، جو بے حد اچھے انسان تھے اور طالب علموں کو اپنے بچوں سے عزیز رکھتے تھے۔ ان کے پڑھانے کا طریقہ بھی الگ تھا۔ وہ طالب علموں میں بے حد مقبول تھے۔ عرشؔ ذہین بھی تھے اور صحت مند بھی۔ موصوف کھیلوں میں بھی کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ بقول عرشؔ کھیلوں نے کبھی اُن کی پڑھائی متاثر نہیں کی۔

۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کی وجہ سے ملک بھر میں حالات غیر یقینی تھے۔ کوئی بھی چیز اپنے ٹھکانے پر نہیں تھی، ہر چیز میں بکھراؤ تھا۔ اس صورت حال نے زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کیا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات کی وجہ سے وہ پڑھائی کی طرف پوری توجہ نہ دے پائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دسویں جماعت کا امتحان دوسرے سال پاس کر سکے۔ اس زمانے میں سرکاری سکولوں میں اردو زبان عام طور پر پڑھائی جاتی تھی، لیکن جو طلبہ ہندی پڑھنا چاہتے ان کے لئے کوئی پابندی نہیں تھی۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ ہندی پڑھنے والے طلبہ کی تعداد کافی کم ہوا کرتی تھی۔ عرشؔ صاحب کے والد صاحب چونکہ خود بھی اردو خواندہ تھے اور فوج میں اردو مدرس رہے تھے اس لئے عرشؔ صاحب نے بھی سکول میں اردو مضمون کو اپنایا۔ اس سلسلے میں ان کے والد صاحب ان کی رہنمائی بھی کیا کرتے تھے۔ ان دنوں سکول سے گھر آ کر تختی لکھنا ایک لازمی جزو ہوتا تھا۔ لہٰذا وہ اپنے والد صاحب کی نگرانی میں تختی لکھتے اور سکول کا باقی کام کرتے تھے۔

آغازِ شاعری:

عرشؔ صاحب میں شاعری کا شوق آٹھویں جماعت سے ہی پیدا ہونے لگا تھا۔ اس سلسلے میں ان کے محرک اُن کے اردو مدرس مولوی محمد عبداللہ تھے جنہوں نے طالب علموں کو شاعری کی طرف راغب کیا تھا۔ وہ مہینے میں ایک آدھ بار طالب علموں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیتے اور بیت بازی شروع کراتے۔ طلباء بھی اس میں کافی دلچسپی دکھاتے تھے۔

رنبیر ہائی سکول میں عرشؔ صاحب مختلف ادبی و نیم ادبی نوعیت کی تقریبات میں حصہ لیتے رہتے۔ وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اگر وہ ہنس راج ابرول سے عرشؔ صہبائی بنے تو

یہ سب کچھ اُن کے اردو کے مدرس جناب محمد عبداللہ کی وجہ سے تھا۔ جنہوں نے سکول میں بیت بازی کا سلسلہ طلباء میں شروع کر کے عرشؔ کے اندر کے فنکار کو ابھارا۔ آٹھویں جماعت سے لے کر دسویں جماعت تک عرشؔ کے ادبی ذوق میں کافی پیش رفت ہو چکی تھی۔ یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہیں ہوگا کہ موصوف نے کالج کے دوران بطور شاعر اپنی پہچان بنانی شروع کر دی تھی۔ اس کے بعد اُن کی شہرت میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔

عرشؔ صاحب کی تعلیم کے تمام اخراجات بھی اُن کے بڑے بھائی صاحب برداشت کرتے تھے۔ اُن کی زبردست خواہش تھی کہ عرشؔ زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کریں اور ایک اطمینان بخش زندگی بسر کر سکیں۔ لیکن عرشؔ کے کہنے کے مطابق اُن کے بڑے بھائی صاحب کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

گھریلو زندگی:

عرشؔ صاحب کچی چھاؤنی محلہ میں جس مکان میں رہتے تھے وہ کچا تھا۔ جب برسات کے موسم میں بارش کا پانی چھت سے ٹپکنے لگا اس کی لپائی عین ضروری ہوتی تھی۔ اس مقصد کے لئے بازار سے کچی مٹی اور بھوسا خرید لیا جاتا اور چھت کی لپائی کے کام کا فرض عرشؔ صاحب خود سرانجام دیتے تھے، وہ گھر کا کام کاج کرنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ والد صاحب کی خدمت میں بھی مصروف رہتے اور اُن کی دُعائیں حاصل کرتے۔ انہوں نے کبھی کسی گھریلو کام میں شرم محسوس نہیں کی اور اسے فرض سمجھ کر ادا کیا۔

عرشؔ صاحب زیادہ وقت کھیل کود میں گزارتے تھے۔ وہ بے حد ذہین تھے بلکہ بعض ہم جماعتوں کی رہنمائی بھی کرتے تھے۔ کبڈی اُن کا من پسند کھیل تھا۔ بچپن میں وہ بے حد صحت مند تھے۔ اُن کے کہنے کے مطابق کبڈی کھیلنے والوں کی جس پارٹی میں وہ شامل ہوتے اس کی جیت یقینی ہوتی تھی۔

عرشؔ کہتے ہیں کہ اگرچہ وہ پڑھائی کے دوران ذہین طلباء میں شمار کئے جاتے تھے لیکن حساب میں وہ بے حد کمزور تھے اگر وہ دسویں کا امتحان پاس کر سکے تو محض اس لئے کہ وہ جیومیٹری

میں طاق تھے۔ حساب میں نمبروں کی جو کمی تھی وہ جیومیٹری کی وجہ سے پوری ہوگئی۔ یہاں اِس بات کا ذکر بے محل ہوگا کہ سری رنبیر ہائی اسکول میں جناب محبوب الحق جو پاکستان کے وزیرِ خزانہ بھی رہے، اُن کے ہم جماعت تھے۔ دونوں میں گاڑھی چھنتی تھی۔ محبوب کے والد جناب عبدالعزیز اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے جو پاکستان وجود میں آنے کے بعد وہاں منتقل ہوگئے۔

یہ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ عرشؔ صاحب کو کسی واقعہ کی کوئی تاریخ یاد نہیں۔ لیکن یہ غنیمت ہے کہ زندگی کے 88 سالوں میں پھیلے ہوئے واقعات اُنہیں اس طرح یاد ہیں گویا یہ کل کی بات ہو۔ جناب عبدالعزیز کے وقت اسکول میں جناب تیج رام کھجوریہ بے حد مقبول مدرس تھے۔ عرشؔ صاحب اُن سے تاریخ کا مضمون پڑھا کرتے تھے۔ عرشؔ آج بھی اُن کی بے حد عزت کرتے ہیں اور ملاقات کے وقت دونوں ہاتھ جوڑ کر اُن کے سامنے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ کھجوریہ صاحب بھی عرشؔ صاحب کی ذات پر فخر محسوس کرتے ہیں اور نہایت محبت اور خلوص سے ملتے ہیں۔

عرشؔ صاحب سے جب ماضی کے واقعات سُنتے ہیں، تو صرف ایک ہی کمی کا احساس ہوتا ہے کہ اِن میں کوئی ترتیب نہیں ہوتی پھر بھی یہ غنیمت ہے۔ جب ۱۹۴۷ء میں پاکستان نے جموں صوبہ میں دیوا بٹالہ پر حملہ کیا تو عرشؔ صاحب ریڈیو پر یہ خبر سُنتے ہی اپنے ننھیال کے لئے روانہ ہوگئے تاکہ وہ اپنی نانی کو جموں لے آئیں۔ اُن کا ننھیال دیوا بٹالہ سے ایک طرف تھا۔ موصوف دو دِن کا پیدل سفر طے کر کے ننھیال پہنچے۔ لیکن اُن کی نانی نے آنے سے انکار کر دیا اور اپنے اِس فیصلے پر بضد رہیں کہ وہ جہاں رہتی ہیں اُسی مٹی میں مل جائیں گی۔ ۱۹۶۵ء میں بھی یہی صورتِ حال رہی۔ وہ جموں آکر پھر واپس چلی گئیں اور بعد میں وہیں اُن کا انتقال ہوا۔ عرشؔ صاحب اُن کے انتقال سے چند روز قبل تک اُن کی تیمارداری میں مصروف رہے۔ عرشؔ ابھی ہنس راج ابرول ہی تھے کہ اُن کی نانی صاحب داغِ مفارقت دے گئیں۔

عرشؔ اور اُن کے بڑے بھائی صاحب اسکول کی تعلیمات کے دوران جب کبھی ننھیال جاتے تو اپنے قیام کے دوران گھر کے نوکر کو کوئی کام نہیں کرنے دیتے۔ یہاں تک کہ کھیت سے

بھینس کے لئے چارہ خود کاٹ کر لاتے۔ اُن کی نظروں میں سب اِنسان ایک جیسے تھے۔ یہ تو کمزور صورتِ حال ہوتی ہے جو اِنسان کو کسی دوسرے اِنسان کے پاس نوکری کرنا پڑتی ہے۔

جذبۂ خدمتِ والدین:

عرشؔ صاحب کا ایک اہم گھریلو واقعہ قابلِ ذکر ہے، جس سے ظاہر ہوگا کہ اِن کے دِل میں اپنے والدین کی خدمت کرنے کا کتنا جذبہ تھا۔ اِن کے والد صاحب عمر رسیدہ تھے۔ اِن کی زبردست خواہش ہوتی تھی کہ رات کو کھانے کے ساتھ پینے کے لئے کنویں کا پانی ہو۔ اِس غرض سے عرشؔ صاحب شام ڈھلے توی کے نزدیک ایک مشہور کنواں ہے، وہاں پانی لینے کے لئے چلے جاتے۔ وہاں بہت بھیڑ ہوتی تھی کیونکہ شہر میں کئی جگہ اُس کنویں کا پانی فروخت بھی ہوتا تھا۔ اِس لئے بعض اوقات رات کے آٹھ بھی بج جاتے۔ عرشؔ صاحب تقریباً رات ساڑھے آٹھ بجے گھر پہنچتے۔ اِس کے بعد رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف ہو جاتے۔ موصوف اِس سے بہت خوش ہوتے کہ وہ والد صاحب کی خدمت کر رہے ہیں۔ اُن کے والد صاحب کو حقّہ پینے کی بھی عادت تھی اِس لئے صبح اُٹھنے کے بعد عرشؔ کا سب سے پہلا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ حقہ صاف کریں اور اِس کے لوازمات کا انتظام کریں۔ اِن کے والد صاحب محسوس کرتے تھے کہ بچوں کو اِس سے پریشانی ہوتی ہے اور اِس مقصد کے لئے اُنہیں صبح جلدی جاگنا پڑتا ہے۔ وہ اپنے بچوں کو تاکید کرتے تھے کہ وہ تمباکو نوشی سے ہمیشہ دور رہیں۔ اِس کا اثر یہ ہوا کہ عرشؔ اور اُن کے بڑے بھائی صاحب تمباکو نوشی سے ہمیشہ دور رہے۔

عرشؔ صاحب کہتے ہیں کہ یہ اُن کے والد صاحب کا ہی اثر تھا کہ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اگر اُن سے کبھی گھر کی کسی چیز کا نقصان ہو جاتا تو وہ فوراً اِس کا اعتراف کر لیتے۔ چونکہ وہ خود برائی سے پرہیز کرتے اِس لئے اگر دوسرے اُن سے برائی کرتے تو وہ اُسے پسند نہیں کرتے۔ زندگی میں عرشؔ کا نظریہ ہمیشہ تعمیری رہا ہے۔ اِس بات کا ثبوت اُن کی زندگی میں قدم قدم پر ملتا ہے۔

ملازمت:

عرشؔ صاحب نے کالج کو خیر باد کہنے کے بعد اپنی ملازمت کا آغاز ریجنل ریسرچ لیبارٹری جموں سے کیا۔ لیکن یہاں وہ بڑی مشکل سے تین سال کا عرصہ گزار پائے ہوں گے کہ استعفیٰ سے انہیں کوئی باز نہ رکھ سکا۔ جب راقم الحروف نے اُن سے اِس استعفیٰ کی وجہ دریافت کی تو وہ یوں گویا ہوئے۔ ''ریجنل ریسرچ لیبارٹری چونکہ ایک سائنسی تجربہ گاہ تھی، جہاں ہر وقت جانوروں وغیرہ پر تجربات ہوتے رہتے تھے۔ اِس طرح معصوم جانوروں کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا۔ یہ منظر مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا اِس لئے میں کسی ایسے موقعہ کی تلاش میں تھا کہ ملازمت سے استعفیٰ دے سکوں''۔

اِس واقعے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ موصوف دِل کے کتنے نرم واقع ہوئے ہیں۔ اگر ایک حساس دِل شاعر نہیں ہوگا تو کون ہوگا؟ ملازمت سے استعفیٰ دینے سے قبل ریڈیو کشمیر جموں نے ایک کُل ہند مشاعرہ کا اہتمام کیا اِس میں لسان الآعجاز، پنڈت میلا رام وفاؔ جیسی عظیم شخصیتیں بھی مدعو تھیں۔ اِس وقت عرشؔ کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ انہیں بھی مشاعرہ میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ اس وقت وہ اس وہم میں بھی مُبتلا تھے کہ ریڈیو ایک ادبی ادارہ ہوگا۔ اس وقت ریڈیو میں جو سٹاف آرٹسٹ کے طور پر لئے جاتے تھے انہیں تین ماہ کا کنٹریکٹ دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد اِس کنٹریکٹ میں توسیع کی جاتی تھی۔ اِس لحاظ سے یہ ملازمت غیر یقینی تھی۔ عرشؔ بڑی محنت اور ایمانداری سے کام کرتے تھے۔ اِس لئے توسیع کا سلسلہ جاری رہا، لیکن وہ اِس سے مطمئن نہیں تھے۔ کیونکہ اِس سلسلے میں کسی قسم کی ضمانت نہیں تھی۔

اِتفاق سے اپریل ۱۹۵۵ء میں ریڈیو اِسٹیشن میں کچھ مستقل اسامیاں نکل آئیں اور عرشؔ کو مستقل کیا گیا۔ اِن کی ڈیوٹی اکونٹس سیکشن میں لگائی گئی۔ موصوف ریڈیو کے اُردو پروگرام میں بھی برابر شریک ہوتے رہتے تھے۔ حالانکہ اِس وقت اُنہیں کوئی معاوضہ نہیں دیا جاتا تھا۔ پھر ایک ایسا وقت آیا جب ریڈیو پروگرام میں اگر کوئی سٹاف ممبر جس کا تعلق پروگرام سیکشن سے نہ ہو، شرکت کرے، تو ڈائریکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی کی اجازت حاصل کرنے کے بعد اسے معاوضہ دیا جاتا تھا۔

ازدواجی زندگی:

۱۳ر فروری ۱۹۵۵ء کو عرشؔ ازدواجی زندگی میں بندھ گئے۔ اُن کی اہلیہ کملا ابرول جالندھر سے تعلق رکھتی ہیں۔ شادی کا اہتمام جموں میں ہوا تھا۔ عرشؔ کی شادی سے پہلے اُن کے والد صاحب اُن کو داغِ مفارقت دے چکے تھے۔ اِس لئے اُن کی شادی کی تمام ذمہ داریاں اُن کے بڑے بھائی کے سر تھیں۔ جو انہوں نے نہایت ذمے داری سے انجام دیں۔

اولاد:

عرشؔ سے جب اُن کی اولاد کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے بتایا کہ اُن کی اہلیہ کے بطن سے اُن کی چار اولادیں ہوئیں، جن میں تین لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے۔ اُن کی دو لڑکیوں نے ایم اے کی تعلیم حاصل کی اور ایک لڑکی اور لڑکے نے بی۔ اے اور بی۔ کام کی ڈگری حاصل کی۔ وہ مزید تعلیم اس لئے جاری نہ رکھ سکے کہ لڑکیوں کی شادیاں ہوگئیں۔ اُن کے فرزندِ ارجمند شری اورن کمار ابرول مرکزی حکومت کے محکمہ سی ڈی اے میں ملازم ہیں اور ایک اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ عرشؔ نے پوری ایمانداری سے بچوں سے متعلق اپنے فرائض سرانجام دیئے اور اپنے محدود ذرائع کے باوجود گھر کے وقار کو قائم رکھا۔ اپنے تمام بچوں کو حسبِ توفیق اعلیٰ تعلیم دِلوائی۔ اُن کی سب لڑکیاں اپنے اپنے سسرال میں خوش ہیں اور آسودہ حال ہیں۔

عرشؔ زندگی میں قدم قدم پر ذہنی تذبذب سے گزرے ہیں۔ لیکن مایوس نہیں ہوئے اور زندگی کی جدوجہد میں مصروف رہے۔ یہ غالباً ۱۹۵۵ء کی بات ہے جب اُن کے بڑے بھائی سرینگر میں تھے۔ انہوں نے ٹیلیفون پر عرشؔ کو تاکید کی کہ وہ فوری طور پر ایک درخواست انفارمیشن آفیسر کے عہدے کے لئے بذریعہ ریڈیو اسٹیشن ڈائریکٹر انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ جموں وکشمیر کو ارسال کریں۔ درخواست میں ادبی نوعیت کے کام کی تفصیل درج ہو، کیونکہ جناب ڈی۔ پی۔ دھر انہیں ریاستی حکومت کے محکمہ انفارمیشن میں انفارمیشن آفیسر کے عہدے پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اِس درخواست کی ایک نقل وہ براہِ راست انہیں بھی بھیج دیں۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ دھر صاحب کو یہ کیسے علم ہوا کہ عرشؔ صاحب شری وی پی ابرول کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ابرول صاحب نے دھر

صاحب کو بتایا تھا کہ عرشؔ ریڈیو کشمیر جموں سے ۱۹۵۵ء سے وابستہ ہیں۔ اگر انہیں ریاستی حکومت کی ملازمت میں لیا جائے تو اُن کی مرکز کی تین سال کی ملازمت ضائع ہو جائے گی۔ لیکن دھر صاحب نے اُنہیں یقین دلایا تھا کہ وہ مرکزی حکومت کی سروس کا عرصہ بذریعہ کیبنٹ ریاستی سروس میں شامل کروائیں گے۔ جناب ڈی۔ پی۔ دھر ان دنوں ریاست میں King Maker تصور کئے جاتے تھے۔ اِسے عرشؔ کی بدقسمتی کہئے کہ جب اُن کی درخواست سرینگر کے محکمہ انفارمیشن میں موصول ہوئی تو دھر صاحب اُسی روز ہندوستان کے سفیر بن کر روس چلے گئے۔

عرشؔ نے بھی عجیب قسم کی طبیعت پائی ہے۔ جب بخشی غلام محمد ریاست کے وزیرِ اعظم تھے (بعد میں یہ عہدہ وزیر اعلیٰ کے لقب سے جانا گیا) عرشؔ کو تین بار اُن کے ہاں ڈنر پر بلایا گیا۔ وہ موصوف کی بڑی عزت کرتے تھے۔ اُن سے ملاقات بھی مشاعروں میں ہوئی تھی۔ انہوں نے ہر بار عرشؔ سے دریافت کیا کہ کِسی چیز کی ضرورت تو نہیں لیکن عرشؔ نے ہمیشہ شکریہ کہہ کر بات ختم کردی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہیں کِسی کے آگے دستِ طلب دراز کریں۔ انہوں نے تنگ دستی میں بھی کسی صورت میں خودداری کا دامن نہیں چھوڑا اور اِسی غیرت میں تمام زندگی گزاری۔ وہ اِس وقت بھی ایک بااصول زندگی گزار رہے ہیں۔ اگرچہ اُنہیں قدم قدم پر کئی مشکلات پیش آتی ہیں لیکن کسی سے ذکر تک نہیں کرتے اور مشکلات سے سینہ سپر رہتے ہیں، لیکن ہونٹوں پر وہی دائمی مسکراہٹ رہتی ہے۔

عرشؔ زندگی میں عمل پر یقین رکھتے ہیں۔ اتنے ذہین ہو کر بھی نہایت انکساری سے ہر ایک سے پیش آتے ہیں۔ ادبی خدمات کے لئے ہر وقت کمربستہ رہتے ہیں۔ وہ ریڈیو کی ملازمت کے دوران کئی لوگوں کی سازشوں کے شکار رہے لیکن کبھی دِل شکستہ نہیں ہوئے۔ سازشی لوگوں سے مسکرا کر ملتے اور انہیں یہ احساس تک نہ ہونے دیتے کہ وہ اُن کے عمل سے واقف ہیں۔ اگر کسی جانکار سے کوئی سفارش کرنا ہوگی تو ضرور کریں گے لیکن دوسروں کے لئے، اپنے لئے نہیں۔ عرشؔ ملازمت کے دوران ہمیشہ اِس نظریہ کے حق میں رہے کہ اُن کی ذات سے دوسروں کو فائدہ پہنچے۔ اُن کا یہ جذبہ ہر لحاظ سے قابلِ تعریف ہے۔ ملازمت کے دوران بے حد

مقبول رہے۔ وہ چاہے کلرک تھے، چاہے اکاونٹنٹ، چاہے ایڈمنسٹریٹیو آفیسر، اُن کے اس نظریہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ جیسے کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ ریڈیو کشمیر جموں میں رہے، انہیں اُردو کے پروگرام میں بھی دخل حاصل رہا اور وہ اُن میں شرکت بھی کرتے رہے اور کئی دفعہ اُن سے رہنمائی بھی حاصل کی جاتی رہی۔ وہ ایسی باتوں سے خوش ہوتے تھے۔ اِس کے باوجود مطمئن نہیں تھے۔ انہوں نے یہاں بھی دوبار استعفٰے پیش کیا لیکن منظور نہ ہوسکا۔ انہیں ایسا لگتا تھا کہ غلط جگہ پر آگئے ہیں۔ جیسے جیسے عرشؔ کی عمر بڑھتی گئی استعفٰے کا خیال ترک کرلیا۔ یہ ایک قانونی مجبوری تھی۔ عمر کی حد بڑھنے کی وجہ سے مزید سرکاری ملازمت نہیں مل سکتی اور سر پر گھریلو ذمہ داریاں بھی آن پڑی تھیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ کسی بھی ذمے داری سے غافل نہیں تھے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ شاعری ذمہ داریوں سے انحراف نہیں بلکہ شاعری سے اِنسان زیادہ حساس بن جاتا ہے اور اِس سے وہ زندگی کو زیادہ اچھی طرح سمجھنے لگتا ہے۔

دہلی، جودھپور اور پنجاب میں تبادلے:

غالباً ۱۹۶۶ء میں اُن کا تبادلہ دہلی ہوگیا۔ دہلی سے وہ عارضی دورے پر جودھپور چلے گئے۔ یہاں اُن کا قیام تین ماہ تک رہا۔ اُن کی وجہ سے اس عرصہ میں ادبی ہنگاموں کا ایک سلسلہ جاری رہا۔ جودھپور کے مقامی شعراء نے انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔ ہر تیسرے روز وہاں ایک مشاعرہ ہوتا تھا۔ ہر شاعر انہیں اپنا سمجھتا تھا۔ ایسا دراصل عرشؔ کی انکساری کے باعث بھی تھا۔ بطورِ شاعر اُن کی شہرت ملک کے ہر حصے میں تھی۔ لیکن انہیں کبھی اِس کا احساس نہ ہوا۔ جودھپور پہنچنے کے بعد اُن کی ملاقات شری گندھرب لعل شرما سے ہوئی۔ موصوف گوڑ گاؤں سے تعلق رکھتے تھے اور ملازمت کے سلسلے میں وہاں مقیم تھے۔ نہایت باذوق انسان تھے۔ اِن کے پاس عرشؔ کے کلام کے تراشے موجود تھے۔ اُن کے کنبہ کے افراد گوڑ گاؤں میں رہتے تھے۔ عرشؔ انہیں کے پاس مقیم رہے۔ جودھپور کی ادبی محفلوں میں عرشؔ صاحب کے ساتھ وہ بھی شریک ہوتے اور اُن سے بے حد لطف اندوز ہوتے۔ وہ بے حد خوش تھے کہ عرشؔ کے ساتھ اُن کا ذکر بھی ہوتا ہے۔ وہ بڑے خوش خلق اِنسان تھے۔ چند روز میں عرشؔ کے ساتھ گھل مِل گئے۔ اگرچہ ریڈیو اسٹیشن پر

بھی باہر سے آنے والے سرکاری ملازموں کے لئے ایک مہمان خانہ تھا لیکن عرشؔ شری شرما صاحب کے ساتھ ہی مقیم رہے۔ جہاں عرشؔ مقیم تھے وہاں سے شہر ڈھائی کلومیٹر کی دوری پر تھا لیکن وہ دوستوں سے ملنے روزانہ شہر جاتے تھے۔ اس زمانے میں جودھپور میں میٹاڈور وغیرہ کی سہولیات دستیاب نہیں تھیں، بے حد پسماندہ شہر تھا۔

ایک بار عرشؔ اکیلے ہی کسی ادبی تقریب میں شامل ہونے کے بعد گھر کی طرف آرہے تھے۔ وقت کافی ہو چکا تھا کہ راستے میں پولیس انہیں پکڑ کر تھانے لے گئی۔ اتفاق سے وہاں کے ایک پولیس آفسر نے عرشؔ کو کسی مشاعرہ میں سُنا تھا۔ انہوں نے بڑے احترام کے ساتھ انہیں کرسی پیش کی اور ایک سپاہی کو اُن کے ساتھ روانہ کیا کہ وہ انہیں گھر پہنچادے اور ہدایت کی کہ اگر آئندہ یہ دیر سے آئیں تو انہیں گھر تک پہنچا دیا جائے۔

اگرچہ جودھپور میں ستّر کے قریب مقامی شاعر تھے لیکن اِن میں سب سے سُلجھے ہوئے اور بلند قامت شاعر جناب آزادؔ بہاولپوری تھے۔ موصوف اسٹیٹ بنک آف انڈیا میں کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ عرشؔ سے اُن کی خوب بنتی تھی لیکن انہیں عرشؔ سے ایک گلہ بھی تھا اور وہ انہیں ہر مُلاقات میں کہتے تھے کہ ''آپ کی آمد سے میرا قد کم نہیں ہوا بلکہ ختم ہو گیا ہے۔'' عرشؔ مُسکرا کر کہہ دیتے کہ ''یہاں میرا مستقل قیام نہیں ہے'' اور ہوا بھی یہی کہ تین ماہ کے بعد عرشؔ کا تبادلہ جودھپور سے گورایا (پنجاب) ہو گیا۔ وہ اپنے جودھپور کے قیام کے دوران ایک مشاعرے میں شرکت کی غرض سے سونی پت بھی آئے۔ اس مشاعرے کا اہتمام اُردو کے ذہین شاعر جناب پورن کمار ہوشؔ نے کیا تھا۔ جناب نریش کمار شادؔ بھی اس میں شریک ہوئے تھے۔ عرشؔ دوستوں کو کسی صورت میں بھی ناراض نہیں کرتے تھے، چاہے انہیں جتنی مرضی تکلیف کیوں نہ اُٹھانا پڑے۔ ہوشؔ صاحب اِن کے بڑے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ عرشؔ کے اِس شعر کو حاصلِ مشاعرہ قرار دیا گیا ؎

اہلِ قلم، مفتی، مصور، صنم تراش
ملتے ہیں مے کدے میں بلا کے ذہین لوگ

وہ خاص طور پر جناب نریش کمار شادؔ کی داد کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ گورایا میں چند ماہ کے قیام کے بعد عرشؔ کا تبادلہ پھر جموں ہو گیا۔

نئی زندگی:

سری نگر کے ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے گئے کہ ایک جان لیوا بیماری نے گھیر لیا۔ واپسی پر بڑی مشکل سے گھر پہنچے۔ پھر روز بروز تکلیف میں اضافہ ہوتا گیا۔ اگر چہ علاج جموں کے ایک شہرت یافتہ حکیم کا تھا لیکن بدقسمتی سے تکلیف جگر کی تھی اور علاج گردے کی تکلیف کا ہوتا رہا۔ معلوم ہوا کہ اُن کے خون میں زہر پھیل چکا تھا۔ یہ Liver abses کی بیماری تھی۔ دو ماہ سرکاری اسپتال میں داخل رہے۔ اُن کے جگر سے دو قسطوں میں ایک کلو پس نکالی گئی۔ نقاہت بے حد بڑھ چکی تھی۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق عرشؔ کے ایک عزیز شری بھوش کمار گندوترہ (ریاسی) نے اپنا خون دیا۔ ڈاکٹر اُن سے ایک بات کے لئے بے حد پریشان تھے کہ وہ اپنا بستر چھوڑ کر وارڈ میں کئی چکر لگاتے ہیں اور اُن بیمار لوگوں کی مزاج پُرسی میں مصروف رہتے ہیں جو بے حد تکلیف میں مبتلا تھے، جب کہ اُن کی اپنی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اُنہیں اس سے گریز کرنا چاہیئے تھا۔ آخر کار دو ماہ کے بعد اسپتال سے فراغت مل گئی۔

ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ عرشؔ اِس بیماری کے جراثیم جودھپور سے لائے ہیں۔ جب وہ اسپتال سے فارغ ہوئے تو ڈاکٹر نے سب کی موجودگی میں کہا ''بے شک علاج نے اپنا کافی اثر دکھایا لیکن انہیں اُن کی خود اعتمادی نے دوسری زندگی دی ہے'' ایسا لگتا ہے کہ قدرت نے بھی عرشؔ سے کافی کام لینا تھا اور یہ خیال سو فیصدی درست ثابت ہو رہا ہے۔ عرشؔ نے اپنے مجموعہ کلام ''صلیب'' میں بھی ڈاکٹر ایس ایل ورما اور اُن کے معاون ڈاکٹر بھاردواج کا ذکر کیا ہے اور اُن کی اِس توجہ کا شکریہ ادا کیا ہے جس سے اُنہیں نئی زندگی نصیب ہوئی۔

فراخ دِلی اور فرائض:

عرشؔ صاحب کے بڑے بھائی صاحب کا ۱۹۶۶ء سے کئی برس پہلے دہرہ دون تبادلہ ہو چکا تھا۔ ۱۹۷۶ء میں وہیں بیمار ہوئے، آل انڈیا نسٹی چیوٹ دہلی میں انہیں داخل کروایا گیا

لیکن دو آپریشنوں کے باوجود وہ جانبر نہ ہو سکے۔ اِس کے بعد اُن کی اہلیہ اور بچے جموں آ گئے۔ اُن کا جدی پشتنی مکان صرف کچا ہی نہیں تھا بلکہ اِس قابل بھی نہیں تھا کہ اِس میں دو کنبے گزارہ کر سکیں۔ لہٰذا انہوں نے یہ مکان بھاوج اور بچوں کے حوالے کر دیا اور خود ریشم گھر کالونی چلے آئے۔ وہاں اُن کی ساس مقیم تھیں۔ وہ پہلے بھی کئی بار کہہ چکی تھی کہ وہ وہاں اکیلی ہیں اس لئے اُن کے داماد اپنے کنبے سمیت وہاں آجائیں۔ موصوف کچی چھاونی والے پشتینی مکان کے حصہ سے بھی دست بردار ہو گئے انہوں نے بھاوج سے کہا کہ اُن کے پاس جو روپیہ ہے وہ اِس سے اِس مکان کا پختہ بنوالیں انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اپنے فرائض کا کِس قدر احساس تھا۔

اہلیہ کی علالت اور بنگال میں تعیناتی:

اسے بدقسمتی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ جب عرشؔ ریشم گھر کالونی منتقل ہوئے، اُن کی اہلیہ گٹھیا کی تکلیف میں مبتلا ہو گئیں۔ عرشؔ صاحب اس سے کئی برس پہلے اکاؤنٹنٹ بن چکے تھے۔ کام کا بوجھ بھی زیادہ تھا گھریلو ذمہ داریوں میں بھی برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اگر چہ اُن کے دفتر کے اوقات دس بجے تھے پھر بھی وہ صبح ۹ بجے دفتر پہنچ جاتے تھے۔ اس طرح شام دیر تک کام میں مصروف رہتے۔ ہر قسم کے علاج کے باوجود اُن کی اہلیہ کی تکلیف میں ذرا بھی افاقہ نہ ہوا۔ اس تکلیف سے پہلے اُن کی سب سے بڑی لڑکی کی شادی ہو چکی تھی۔ اس تکلیف سے اُن کی اہلیہ چودہ برس صاحب فراش رہیں۔ ۱۹۸۴ء میں عرشؔ صاحب کو Promotion ملی اور وہ بطور ایڈمنسٹریٹیو آفیسر آل انڈیا ریڈیو سلی گوری مغربی بنگال میں تعینات ہوئے جہاں کے لئے جموں سے یک طرفہ سفر چار دِن کا تھا۔ وہ پریشان تھے کہ کیا کیا جائے۔ اُن کے بچے بڑے ہو چکے تھے۔ انہوں نے اُن کا حوصلہ بڑھایا، جس میں اُن کی اہلیہ بھی شامل تھیں اور یوں وہ سِلی گوری چلے گئے۔ وہاں سب سے اُن کا حسن سلوک بھی اُن کی مقبولیت کا باعث بنا۔ موصوف سِلی گوری سے دوبارہ سرکاری کام کے سلسلے میں کولکتہ گئے۔ وہاں بھی اُن کی اہلیت کا اعتراف کیا گیا۔ سِلی گوری میں ابھی ایک سال کا عرصہ ہو گیا کہ اُنہیں کام کی غرض سے جموں آنا پڑا۔ ابھی وہ

جموں میں ہی تھے کہ اُن کا تبادلہ آل انڈیا ریڈیو روہتک ہوگیا۔ سِلی گوری میں کوئی بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ وہاں سے اور کہیں جائیں۔ اُن کے ساتھ سب کا بہت اچھا سلوک تھا۔ وہ بھی سب کو چاہتے تھے لیکن ایک ہی دِقت تھی کہ وہ گھر سے بہت دور تھے۔ وہاں خط بھی دو ہفتوں کے بعد ملتا تھا۔ اِس پر اہلیہ کی تکلیف الگ سے پریشان کُن تھی۔ وہ چارپائی پر پڑی رہتیں۔ تکلیف نے مکمل طور پر اُنہیں جکڑ لیا تھا۔ اِس پر بھی وہ مایوس نہیں تھیں بلکہ سب سے خندہ پیشانی سے پیش آتیں۔

سِلی گوری میں عرشؔ صاحب صرف ایک بات کی گھٹن محسوس کرتے تھے کہ وہاں اُردو کا کوئی شاعر یا ادیب نہیں تھا۔ ایک روز وہ وہاں کی بڑی مسجد میں چلے گئے۔ وہاں سے بھی یہی معلوم ہوا کہ یہاں اُردو کا کوئی شاعر یا ادیب نہیں۔ البتہ کشن گنج میں کچھ شاعر اور ادیب ہیں۔ کشن گنج سِلی گوری سے کافی دور تھا۔ سِلی گوری میں اُردو کی کوئی تقریب بھی نہیں ہوتی تھی کہ کوئی وہاں آئے۔

کولکتہ میں غربت وافلاس کے مناظر کا شعری ردِعمل:

عرشؔ صاحب کے مطابق کولکتہ کے عام ہوٹلوں میں بھی پینے کا صاف پانی دستیاب نہیں ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ سیلاب کا پانی ہے۔ عرشؔ صاحب جب بھی کولکتہ جاتے، ایک عام ہوٹل میں قیام کرتے۔ ایک عام آدمی نہایت خستہ زندگی گزارتا تھا۔ غربت انتہا تک تھی۔ دولت کی فراوانی صرف اُن لوگوں تک محدود تھی جو عوام کے رہنما کہلاتے ہیں اور ان پر حکومت کرتے ہیں۔ موصوف جس ہوٹل میں ٹھہرتے تھے وہ سیالدہ ریلوے اسٹیشن کے پاس تھا۔ اس کے ساتھ ایک بہت بڑا افلائی اوور تھا جس کے نیچے رات کو کم سے کم پانچ ہزار مزدور رات گزارتے تھے۔ یہ وہاں کی عوامی زندگی تھی۔ واپسی پر جب کولکتہ سے سِلی گوری کے لئے ریلوے ٹکٹ حاصل کرنا ہوتا تھا تو رشوت دیئے بغیر ایسا ممکن نہیں تھا۔ عرشؔ صاحب کا کہنا ہے کہ اس سے کمیونزم کی اصلی شکل ابھر کر سامنے آتی تھی۔ کیونکہ وہاں کیمونسٹوں کی حکومت تھی۔ سِلی گوری میں قیام کے دوران عرشؔ صاحب کھانے کے لئے کبھی پریشان نہیں ہوئے کیونکہ وہ خود بہت اچھا کھانا بناتے ہیں اور اِس میں کبھی کسی قسم کی دقت محسوس نہیں کرتے۔

روہتک میں تعیناتی:

عرشؔ صاحب کے مطابق، اُنھوں نے روہتک میں جو وقت گزارا، وہ اُن کی زندگی کا بدترین وقت تھا۔ لیکن ایک پہلو جو قابلِ تعریف تھا اور اطمینان بخش بھی کہ وہاں شاعر اور ادیب کافی تعداد میں تھے۔ جب مختلف شاعروں اور ادیبوں کو یہ معلوم ہوا کہ عرشؔ صاحب روہتک میں تعینات ہیں تو وہ جگہ جگہ ادبی تقریبات میں انہیں مدعو کرنے لگے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی مشاعرہ میں عرشؔ صاحب کی شرکت مشاعرہ کی کامیابی کی ضامن ہوتی ہے۔ لیکن غائبانہ طور پر وہ کسی جگہ متعارف نہیں تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک بار ایسا بھی ہوا کہ ایک ہی تاریخ کو وہ فرید آباد کے مشاعرہ میں بھی مدعو تھے اور کھتیل کالج میں بھی۔ جب کہ انہوں نے کھتیل کی ادبی تنظیم کے منتظمین کو مطلع کر دیا تھا کہ وہ فرید آباد کے مشاعرہ میں مدعو ہیں اس لئے کھتیل نہیں آسکیں گے۔ لیکن اِس کے باوجود خبروں میں وہ دونوں مشاعروں میں شریک تھے۔ انہوں نے اِسے بڑی غیر ذمہ دارانہ حرکت بتایا۔ اُن کا کہنا تھا کہ اگر اُنہیں کوئی حادثہ پیش آجاتا تو کیا صورت ہوتی۔ وہ خود سے بھی مذاق کرنے سے باز نہیں آتے ہیں۔ اُن کی لطیفہ گوئی اُن کے کلام کی طرف مقبول ہے۔

روہتک سے جموں، جموں سے روہتک اور سری نگر میں منتقلی:

عرشؔ صاحب کہتے ہیں ایک روز بڈگجر نام کے ایک صاحب ڈائریکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو دہلی سے حکم نامہ لے کر روہتک آگئے کہ انہیں ایڈمنسٹریٹو آفیسر بنایا گیا ہے۔ اس لئے وہ (عرشؔ) چارج انہیں دے دیں اور عرشؔ صاحب کو revert کر کے پھر جموں بھیج دیا گیا۔ بڈگجر صاحب نے یہ سب کچھ کیسے کیا، یہ وہی جانتے ہیں۔ جرأت کی بات یہ تھی کہ جو ایڈمنسٹریٹو آفیسر کے طور پر کام کر رہا تھا اسے revert کر دیا گیا اور دوسرے کو ترقی دے دی گئی اور اس کا کوئی جواز بھی نہیں بتایا گیا۔ خیر موصوف جموں آگئے یہاں انہیں دفتر میں کافی پریشان کیا گیا لیکن یہ پریشانی وقتی تھی۔ انہیں دوبارہ ترقی دے کر پھر روہتک بھیج دیا گیا۔

۱۹۸۷ء میں عرشؔ صاحب کی تبدیلی ریڈیو کشمیر سرینگر میں کر دی گئی لیکن اِس کے ساتھ انہیں بتا دیا گیا کہ اُس کے بعد انہیں آل انڈیا ریڈیو شملہ جانا ہوگا۔ دہلی میں جب اُن سے پوچھا

جاتا کہ اتنی رسائی ہونے کے باوجود جموں کے لئے تبادلہ کیوں نہیں کرواتے۔ موصوف مسکرا دیتے اور صرف اتنا کہتے کہ تمام ہندوستان مرا گھر ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ کسی کے آگے جھکنا نہیں چاہتے تھے۔ جہاں تک اُن کی رسائی کا تعلق ہے، اس میں شک نہیں ہے۔

جب ۱۹۸۷ء میں وہ ریڈیو کشمیر سرینگر سے وابستہ رہے، اُن دنوں وہاں کے ڈائریکٹر شری لسہ کول تھے۔ ۱۹۸۸ء میں ان کا تبادلہ دوردرشن سرینگر میں کر دیا گیا۔ اُن کے لئے یہ ماحول اجنبی نہیں تھا پھر وہ ہمیشہ اُس کوشش میں رہتے کہ دوسروں کو فائدہ کس طرح پہنچے۔ ریڈیو کشمیر سرینگر کا سٹاف اِس بات سے بے حد رنجیدہ تھا کہ انہوں نے ایک ہمدرد اور اہل افسر کھو دیا ہے۔

بہر حال عرشؔ صاحب کو دوردرشن سرینگر میں بھی اچھا ماحول مِلا۔ یہاں بھی اُن کا بے حد احترام تھا۔ دراصل دفتر کے کام کے علاوہ اُن کے قلمی نام نے بھی اُن کی عزت میں کئی گُنا اضافہ کیا۔ یہاں ریڈیو کشمیر سرینگر کی نسبت دفتر کا کام بہت زیادہ تھا۔ کارکنوں کی تعداد پانچ سو سے زیادہ تھی لیکن کیا مجال کہ کسی کے کام میں کوئی تاخیر ہو۔

ملازمت سے سبکدوشی:

عرشؔ صاحب نے ۳۱ ر دسمبر ۱۹۸۸ء کو ملازمت سے سبکدوش ہونا تھا لیکن اُن کے ڈائریکٹر پی سی ہیمبرم چاہتے تھے کہ اُن کی ملازمت میں توسیع ہو۔ انہوں نے موصوف کو بتایا کہ وہ اس سلسلے میں ڈائریکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی کو ایک ڈی او لکھ چکے ہیں اور ٹیلیفون بھی کر چکے ہیں۔ لیکن عرشؔ صاحب نے انہیں صاف الفاظ میں کہا کہ ایسا نہیں ہو سکے گا۔ ڈائریکٹر صاحب پُراُمید تھے، کیونکہ اس سے پہلے دو ایڈمنسٹریٹیو آفسرز کی ملازمت میں توسیع ہو چکی تھی۔

عرشؔ صاحب نے ڈائریکٹر صاحب پر واضح کیا کہ انہیں سیاسی رسائی حاصل ہوگی، ورنہ اس ملک میں اہلیت، ایمانداری اور قابلیت کی کوئی قیمت نہیں۔ آخر کار وہی ہوا جو موصوف نے کہا تھا اور وہ ۳۱ ر دسمبر ۱۹۸۸ء کو ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔

☆☆☆

☆......عرشؔ صہبائی

میرا ادبی سفر

میں اپنے ادبی سفر سے پہلے قدرت کی طرف سے اپنی تخلیق کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں گا جو ضروری بھی ہے۔ میرا یومِ ولادت ۳ر دسمبر ۱۹۳۰ء ہے۔ میری پیدائش میرے ننھال میں ہوئی۔ یہ جگہ سیری بٹل پلائی کے نام سے مشہور ہے۔ اِس میں ایک جگہ "باختن" بھی ہے جہاں مجھے پیدا ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ جگہ چھمب سیکٹر سے کافی دور ہے۔ چھمب سیکٹر تحصیل اکھنور کا ایک حصّہ ہے جو اب پاکستان کا حصہ ہے۔ میرا بچپن "باختن" میں گُزرا۔ میں ابھی ۲۲ دن کا تھا کہ میری والدہ صاحبہ انتقال کر گئیں۔ اِس طرح مَیں ان کی شفقت سے محروم ہو گیا۔ ابتدائی سات سال تک باختن میں نانی صاحبہ نے پرورش کی۔ میرے والد صاحب جمّوں میں مقیم تھے۔ ایک طرف میرے ننھال آسودہ حال تھے تو دوسری طرف والد صاحب کے ہاں غربت اور افلاس کا مستقل قیام تھا۔ گھر میں برادرِ اکبر موجود تھے جو زیرِ تعلیم تھے۔ میرے ننھال میں کوئی اسکول نہیں تھا اِس لئے مجھے حصولِ تعلیم کے لئے والد صاحب کے پاس جمّوں آنا پڑا۔ اُس زمانے میں سات سال سے کم عمر کا بچّہ اسکول میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں پانچویں جماعت تک دھونتھلی پرائمری اسکول میں پڑھتا رہا۔ یہ اسکول میرے گھر کے پاس تھا۔ مجھے اچھّی طرح یاد ہے کہ جب مَیں رنبیر ہائی اسکول میں چھٹی جماعت میں داخل ہوا تو میرے کپڑوں میں پیوند لگے ہوتے تھے لیکن کپڑے صاف ستھرے ہوتے تھے۔ یہ صورتِ حال اُس وقت تبدیل ہوئی جب میرے

بڑے بھائی کو سرکاری ملازمت ملی اور اُن کی شادی ہوئی۔ اُس وقت مَیں نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ چونکہ سرکاری زبان اُردو تھی اِس لئے اُردو کی تعلیم لازمی تھی۔ مَیں شروع سے ہی ذہین تھا اِس لئے دسویں جماعت تک مانیٹر رہا۔ آٹھویں جماعت میں اُردو مولوی محمد عبداللہ صاحب پڑھاتے تھے۔ وہ اکثر طلبا کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور پھر بیت بازی شروع ہو جاتی تھی۔ اِس طرح مجھے اُردو شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ ظاہر ہے مجھ میں شعر و شاعری کے جراثیم موجود تھے۔ کالج پہنچتے پہنچتے بے ہنگم مصرعہ بازی شروع ہو چکی تھی۔ اس وقت جو شاعری کی اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا ضرور ہے کہ ۱۹۵۰ء میں مَیں باقاعدہ شعر کہتا تھا۔ چند افسانے بھی تحریر کئے تھے جو ایک مسودہ کی شکل میں تھے۔ وہ کہاں رکھے گئے اور اُن کا کیا ہوا اِس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ۱۹۵۱ء میں جب میں بارہویں جماعت کا طالب علم تھا، گاندھی میموریل کالج کو چھوڑ کر نہر پہ واقع ریجنل ریسرچ لیبارٹری میں سرکاری ملازمت حاصل کر لی۔ تعلیم ترک کرنے کا آج تک دِلی افسوس ہے۔ میں اب بھی محسوس کرتا ہوں کہ مَیں نے یہ غلط قدم اُٹھایا جب کہ میں بے حد ذہین تھا۔ اِس طرح شاعری کے شوق نے مجھے بے حد نقصان پہنچایا۔ اُس زمانے میں جموں شعر و ادب کا گہوارہ تھا۔ ۱۹۴۶ء تک یہاں کے مشاعروں میں پاکستان کے شعراء بھی شریک ہوتے تھے۔ مَیں ایک سامع کی حیثیت سے اُن مشاعروں میں موجود ہوتا تھا۔ یہ مشاعرے رات گئے تک جاری رہتے۔ میں نے سب سے پہلا مشاعرہ (غیر ریاستی) پٹھانکوٹ (پنجاب) میں پڑھا جس کا اہتمام اُردو کے شاعر جناب سُدرشن کوشل نے کیا تھا۔ موصوف دھرم شالہ سے تعلق رکھتے تھے۔ پھر یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۱۹۵۱ء میں غیر ریاستی سطح پر جموں میں ایک کل ہند مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس میں قبلہ جوشؔ ملسیانی بھی شریک ہوئے۔ اُن کے علاوہ اُردو کے اور کئی مستند شعرائے کرام تھے۔ میرے کلام کی بے حد تعریف ہوئی۔ میں شاعری میں رہنمائی کے لئے قبلہ جوشؔ ملسیانی کے دامنِ ادب سے وابستہ ہو گیا۔ یہ سلسلہ چند برس تک ہی جاری رہا کیونکہ میری طبیعت میں آمد تھی اور اصلاح کی بہت کم گنجائش ہوتی تھی۔ چونکہ کالج کی تعلیم کے دوران میں فارسی کا طالب علم تھا اِس لئے فنّی خامیوں کے علاوہ کلام میں زبان کی خامیاں بھی نہیں ہوتی تھیں۔ ۱۹۵۴ء تک میں

بڑے پیمانے کے مشاعروں میں شریک ہوتا تھا۔ یہاں خاص طور پر میں ماہنامہ ''بیسویں صدی'' کا ذکر کروں گا جس کے ایڈیٹر جناب خوشتر گرامی تھے۔ ''بیسویں صدی'' میں میرا کلام ۱۸ ربرس تک شائع ہوتا رہا۔ اُس زمانے میں بڑے بڑے شاعر اور افسانہ نگار اس پرچہ میں اپنی تخلیقات شائع کروانے کے لئے ترس جاتے تھے۔ میرا کلام ہر شمارہ میں شامل ہوتا تھا۔ جب میں نے ''بیسویں صدی'' میں چھپنا شروع کیا اُس وقت، اُس کے حصّہ نظم کے نگران جناب ہری چند اختر تھے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی اس کا ذکر کیا ہے کہ میرا کلام ملک کے کئی دوسرے اہم رسائل میں بھی شائع ہوتا تھا لیکن سب سے زیادہ شہرت مجھے ''بیسویں صدی'' سے ملی۔ چونکہ مجھ میں قدرتی صلاحیت موجود تھی اِس لئے میرے کلام میں اصلاح کی کم گنجائش ہوتی تھی۔ کلام اِس شدّت سے ذہن میں اُترتا تھا جیسے اشعار کی برسات ہو رہی ہو اور اب بھی یہی عالم ہے۔ مَیں بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہوں۔ میری غزل میں بھرتی کے اشعار نہیں ہوتے۔ معیاری اور اعلیٰ کلام ہی میری شہرت اور مقبولیت کا سبب بنا۔ ۱۹۵۰ء میں کہی ہوئی ایک غزل کے یہ تین اشعار دیکھئے جو مجھے اب تک یاد ہیں۔

اچھّی ہیں رحمتیں مرے پروردگار کی
دن ہی قرار کے ہیں نہ راتیں قرار کی

بادِ خزاں رہے سہے تنکے بھی لے اُڑی
دے کر دلِ حزیں کو تسلّی بہار کی

ہنس ہنس کے کھا رہا ہوں فریبِ حیات عرشؔ
لذّت نہ پوچھ مجھ سے غمِ روزگار کی

رفتہ رفتہ مجھے غیر ریاستی مشاعروں میں مدعو کیا جانے لگا جہاں بڑے بڑے شاعروں سے میری ملاقات ہوتی تھی۔ ۱۹۵۴ء میں ریڈیو کشمیر جموں کی طرف سے بڑے پیمانے پر ایک کل ہند مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں لسان الاعجاز پنڈت میلا رام وفاؔ بھی شریک ہوئے تھے۔ میرے کلام پر اس قدر داد ملی کہ اُس وقت کے سٹیشن ڈائریکٹر نے مجھے یہ پیشکش کی

کہ اگر میں ریجنل ریسرچ لیبارٹری کی ملازمت ترک کر کے ریڈیو جموں میں ملازمت کرنا چاہوں تو وہ اس سلسلے میں میری مدد کریں گے۔ مَیں شروع میں ریڈیو کشمیر جموں میں بطور سٹاف آرٹسٹ کام کرتا رہا۔ بعد میں ۱۵/اپریل ۱۹۵۵ء کو مستقل طور پر اکونٹس سیکشن سے وابستہ ہو گیا۔ ۱۹۵۵ء سے لے کر ۱۹۸۸ء تک مختلف مراحل سے گزرتا ہوا آل انڈیا ریڈیو سنّی گوری، روہتک، ریڈیو کشمیر سرینگر اور دوردرشن سرینگر میں ایڈمنسٹریٹو آفیسر کے فرائض ادا کرتا رہا لیکن میری پہچان بطور عرشؔ صہبائی ہی بنی رہی۔ اتنی مصروفیات کے باوجود شاعری میری زندگی کا اہم جُز بنی رہی بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ شاعری میری زندگی رہی۔ لیکن اس سے میرے سرکاری فرائض کبھی متاثر نہیں ہوئے۔ مشاعروں میں قبلہ جوشؔ ملسیانی، پنڈت میلا رام وفاؔ، تلوک چند محرومؔ، علامہ بشیشور پرشاد منوّرؔ لکھنوی، فراقؔ گورکھپوری، ڈاکٹر جاویدؔ وششٹ، امر چند قیسؔ، ساحرؔ لدھیانوی، نریش کمار شادؔ، معین احسن جذبیؔ، بسملؔ سعیدی، ڈاکٹر منوہر سہائے انورؔ، ساحرؔ ہوشیار پوری، ابراحسن گنوری اور دوسرے کئی مستند شعرائے کرام سے ملاقاتیں رہیں۔ ۱۹۵۸ء میں میرا پہلا مجموعۂ کلام ''شکستِ جام'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔ اُس کی اتنی پذیرائی ہوئی کہ ایک سال کے اندر ہی اُس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ ۱۹۸۰ء میں میرا دوسرا شعری مجموعہ ''شگفتِ گل'' شائع ہوا۔ اس کا بھی دوسرا ایڈیشن ایک سال کے اندر ہی شائع کرنا پڑا۔ یہ سلسلہ جاری رہا۔ اِس وقت تک جو مجموعے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں وہ ہیں شکستِ جام، شگفتِ گل، صلیب، یہ جھونپڑے یہ لوگ، اسلوب، ریزہ ریزہ وجود، اساس، نایاب، عکسِ جمال، دسترس، چشمِ نیم باز، خدوخال، توازن، تجھ بن چین کہاں، خوشبو ترے بدن کی، دل کے خواب ادھورے، سائے تیری یادوں کے، جواز اور آگہی وغیرہ۔ اِن کے علاوہ مَیں نے ''انجم کدہ'' اور ''یہ جانے پہچانے لوگ'' کے نام سے دو تذکرے بھی مرتّب کئے ہیں۔ میرے کلام کے بارے میں مستند ادیبوں اور شاعروں نے اپنی اہم آراء سے مجھے نوازا ہے۔ لیکن یہ سلسلہ صرف دو ابتدائی مجموعوں تک محدود رہا۔ بعد میں میں نے تبصروں کے لئے اپنے مجموعے کہیں ارسال نہیں کئے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ شعر مجھ پر وارد ہوتے ہیں۔ میں اتنے کلام کی اشاعت

بندوبست نہیں کر سکتا۔ عجیب سی گھٹن محسوس کرتا ہوں۔ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ میں نے کسی قسم کی ایسی گستاخی کی ہے جس کا انتقام قدرت مجھ سے اب لے رہی ہے۔ میرے کلام کے بارے میں جو آراء حاصل ہوئیں اُن میں جناب شکیل بدایونی اور جناب ساحل احمد بھی ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں قبلہ جوش ملسیانی میرے کلام پر رائے دیتے ہوئے فرماتے ہیں ''عرش صہبائی نے اُردو غزل کو نئی زمینیں دی ہیں''۔ ڈاکٹر شباب للت نے مرتّب کردہ کتاب ''روبرو آئینوں کے'' میں، میرے بارے میں ایک مضمون شامل کیا ہے اور اعتراف کیا ہے کہ میرے بے شمار اشعار زبان زدِ خواص و عوام ہیں۔ اتنی گنجائش نہیں کہ یہ تمام اشعار درج کیے جائیں پھر بھی چند اشعار درجِ ذیل ہیں:

- وقت کی یہ سب ستم ظریفی ہے ورنہ انسان بُرا نہیں ہوتا

- دل تو کیا چیز ہے ہم روح میں اُترے ہوتے
  تُم نے چاہا ہی نہیں چاہنے والوں کی طرح

- تُم جو چھو لو گے تو بڑھ جائے گی قیمت میری
  گیلی مٹّی ہوں کھلونا ہی بنالو مُجھ کو

- کبھی ثابت قدم رہتے نہیں پروردۂ ظلمت
  ستارے کانپتے ہیں جب سحر نزدیک ہوتی ہے

- اِس کے ہر منظر پہ مِٹ جا، اِس کا پسِ منظر نہ دیکھ
  زندگی اک خول ہے اِس خول کے اندر نہ دیکھ

اِسی طرح جناب مہندر پرتاپ چاند نے اپنی مرتّب کردہ ایک کتاب ''اُجالوں کے سفیر'' میں میرے بارے میں ایک مضمون میں کہا ہے:

''یہاں اِس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ اُنہوں (عرش صہبائی) نے اُردو غزل کو نئی زمینیں ہی نہیں دیں بلکہ نئے رنگ و آہنگ کے اشعار بھی دیئے ہیں''۔

یہاں یہ ذکر باعثِ دلچسپی ہوگا کہ ۲۰۰۰ء میں ''کاروانِ ادب'' کرنال کی طرف سے میرے ۷۱/ویں یومِ ولادت کے موقع پر میرے اعزاز میں ایک یادگار تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جناب کرشن نندہ کرشؔن (ایڈوکیٹ) نے اس تقریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ مَیں کئی برس اس ''کاروانِ ادب'' کے مشاعروں میں شریک ہوتا رہا ہوں۔ یہ مشاعرے واقعی یادگاری مشاعرے ہوتے تھے۔ اب تو جگہ جگہ ادب کا کاروبار ہو رہا ہے اور گروہ بندی کا چلن بھی عام ہے۔ صورتِ حال بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ مجھے اُردو کی بے شمار غیر ریاستی تنظیموں نے اعزازی تقریبوں سے نوازا ہے بلکہ خطابات سے بھی نوازا ہے۔ اُن کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ اُردو فاونڈیشن ممبئی نے علّامہ ''آرزو لکھنوی'' ایوارڈ سے نوازا۔ نورنگ ادبی ادارہ لدھیانہ نے ''آبروئے سخن'' کا خطاب عطا کیا۔ ادبی مرکز پانی پت (ہریانہ) نے ''شہنشاہِ تغزّل'' کے خطاب سے سرفراز کیا۔ جموں سٹی زن کے چیئرمین جناب مہیش گُپتا نے ایک مخصوص تقریب کا اہتمام کیا۔ انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز کی طرف سے بھی ایک خاص تقریب منعقد کی گئی۔ ساتھ ہی سرکاری سطح پر مجھے اکیڈیمی کا بیسٹ بُک ایوارڈ تین بار ملا ہے۔

میرے زیادہ شعری مجموعے غزلیات پر مشتمل ہیں۔ میرے ایک شعری مجموعہ ''اساس'' پر ڈاکٹر کوشل کرن ٹھاکر نے ایم۔فل کیا تھا۔ بعد میں اُنہوں نے ایک کتاب بعنوان ''عرشؔ صہبائی۔ اُردو غزل کی عہد ساز شخصیت'' تحریر کی۔ اِس سے قبل جناب شاؔذ شرقی نے ''عرشؔ صہبائی۔ شخصیت اور شاعری'' مرتّب کی تھی۔ جناب غلام جیلانی۔ ریسرچ سکالر جموں یونیورسٹی، نے ایک ضخیم کتاب ''عصری آگہی کا شاعر۔ عرشؔ صہبائی'' تحریر کی ہے۔ بہار یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے ''اُردو غزل'' پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی تھی جس کے لئے میرا کلام خاص طور پر طلب کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر اعجاز حسین شاہ اعجاز نے جموں یونیورسٹی سے میرے کلام پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ہے۔ جموّں یونیورسٹی کا ایک طالب علم راکیش طالبؔ دہلی یونیورسٹی سے میرے اُردو دوہوں کی کتاب ''تجھ بن چین کہاں'' پر ایم۔فل کر رہا ہے۔ یہ سلسلہ جاری ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین شاہ اعجاز ''کلیاتِ عرشؔ صہبائی'' شائع کر رہے ہیں۔ جناب غلام جیلانی بھی ''عرشؔ صہبائی کے ذاتی

لطائف'' کو کتابی شکل دے رہے ہیں۔ خورشید کاظمی بھی میرے تعلق سے ایک کتاب ''مُغنّی حیات۔۔۔عرشؔ صہبائی'' تحریر کر رہے ہیں جو ایک الگ نوعیت کی کتاب ہے۔

☆☆☆

☆☆☆

☆......نور شاہ

ایک روشن ستارہ۔ عرشؔ صہبائی

سرکاری ملازمت کے دوران مجھے قریب قریب ہر برس ''دربار مو'' کی وجہ سے جموں جانا پڑتا تھا۔ دفاتر اور خاص طور سے سول سیکریٹریٹ کے دفاتر جانے کب سے چھ ماہ سرینگر (گرمائی دارالخلافہ) اور چھ ماہ جموں (سرمائی دارالخلافہ) میں سجتے آرہے ہیں اور اس پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو میری سرکاری ملازمت کی نصف عمر جموں کی مرہونِ منت ہے۔ اس دربار مو کے تعلق سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دربار مو سے منسلک ملازمین کے گھر (میں گھر کی بات کرتا ہوں مکان کی نہیں) نہ تو جموں میں بنتے ہیں اور نہ ہی سرینگر میں اور اکثر ملازمین بے گھر والے ہی کہلاتے ہیں۔ ملازمت کے دوران میں بھی بے گھر ہی رہا لیکن مجھے جو فائدہ ہوا وہ ادبی لحاظ سے میرے لئے بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ سرما کے مہینوں میں جموں میں خوب گہما گہمی رہتی ہے۔ ادبی گہما گہمی، سرکاری اور غیر سرکاری ادبی محفلوں کا اہتمام ہوتا ہے۔ میں اِن محفلوں میں شریک ہونے والے ریاست جموں و کشمیر سے تعلق رکھنے والے اہلِ زبان، اہلِ قلم اور اہلِ فن کی بات نہیں کرتا بلکہ غیر ریاستی قلم کار، صحافی، شاعر، افسانہ نگار، محقق، ناقد اور فنکار بھی جموں کی ان محفلوں، مجلسوں اور مشاعروں میں شرکت کے لئے آتے رہتے تھے۔ اُن سے ذاتی طور پر ملنا، بات چیت کرنا، اُن کی تخلیقات کو سننا یا پڑھنا میری غیر سرکاری سرگرمیوں میں شامل تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج بھی اُس زمانے سے تعلق رکھنے والے بہت سارے ادیبوں اور شاعروں یا

قلم کاروں سے میری گفت شنید ہے، دوستی ہے اور کبھی کبھار ملنا جلنا بھی ہوتا ہے۔ مجھے اِس بات کی خوشی ہے کہ جموں سے تعلق رکھنے والے اردو زبان کے بہت سارے شعراء اپنی شعری تخلیقات کی بدولت ادبی دنیا میں چھا گئے اور اُن میں جو حیات ہیں وہ آج بھی چھائے ہوئے ہیں۔ اِن شاعروں نے نہ صرف بھرپور شاعری کی ہے اور کر بھی رہے ہیں بلکہ اپنے دوّر کے تقاضوں کے مطابق پوری نمائندگی کی ہے اور کر بھی رہے ہیں۔ ان کی شاعری میں متانت، سنجیدگی، ذہانت اور وضع داری کے نقوش بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اِن کی شاعری میں جمالیاتی عنصر کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ جانتے ہیں شاعری کسی منجمند چٹان کا نام نہیں بلکہ ایک فعال اور محترک شے ہے، اِن کی شاعری میں کرب ہے اور نشیب و فراز بھی۔ احتجاج ہے اور مزاحمت بھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ریاست سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کو ملک کے نقادوں اور محققوں نے بہت حد تک نظر انداز کیا ہے۔ دُکھ کی بات یہ ہے کہ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ بہر حال یہ ایک الگ موضوع ہے لیکن اِس بات کا ذکر لازمی ہے کہ ہماری ریاست سے تعلق رکھنے والے ہمارے بیدار مغز نقادوں نے بھی اپنے ہم وطنوں کے لئے اپنی نیک خواہشات صرف چند پیش لفظ لکھنے تک محدود رکھی ہیں۔ میں دراصل بات عرشؔ صہبائی کی کرنا چاہتا ہوں۔ بدقسمتی سے اُن کا نامِ گرامی بھی ''نیک خواہشات'' کے زمرے میں آتا ہے۔ عرشِ صہبائی کے نام کے ساتھ میرے ذہن میں اور بھی بہت سارے نام اُبھر رہے ہیں۔ نگاہوں کے سامنے اُن کی تصویریں گھوم پھر رہی ہیں۔ اُن سب کے بارے میں بات کرنا شاید ممکن نہیں لیکن نام تو لئے جا سکتے ہیں۔ جی ہاں، عرشؔ صہبائی کے ہم عصر شعراء منوہر لال دل، عشرت کاشمیری، اندر جیت لطف، میکش کاشمیری، فاروق مضطرؔ، عابد مناوری، عشاقؔ کشتواڑی، حسام الدین بےتابؔ، رہبر جدید اور پھر آج کے دوّر کے مقبول اور معروف شعراء حضرات جیسے پرتپال سنگھ بےتابؔ، لیاقت جعفری، خالد کرار اور خورشید کاظمی، یہ سارے شعراء حضرات تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت اُردو شعری منظرنامے پر ایک مقام بنا چکے ہیں۔

میں عرشؔ صہبائی کو قریب قریب ۱۹۶۴ء سے جانتا ہوں۔ وہ ریڈیو جموں میں کام

کرتے تھے اور ریڈیو جموں جانا میری مصروفیات میں شامل تھا۔ کبھی کبھار یار دوستوں سے ملنے یا کبھی کبھار کسی پروگرام میں حصہ لینے یا اپنا کوئی سکرپٹ متعلقہ پروڈیوسر کو دینے کے لئے ریڈیو جموں جب بھی جانا ہوتا بارد واج جی، سوم ناتھ کاچرو، میکش کاشمیری، سی۔ پروانہ، جتندر شرما اور رام کمار ابرول سے قریب قریب ہر بار ملاقات ہوتی تھی۔ پشکر ناتھ، موہن یاور، مدن موہن شرما اور نریندر کھجوریہ اکثر میرے ساتھ ریڈیو سٹیشن آتے تھے، وہ بھی ریڈیو پروگراموں میں حصہ لیتے تھے۔ عرش صہبائی اکونٹس سیکشن سے وابستہ تھے اور ایک غیر ادبی ماحول میں کام کرتے تھے لیکن تب بھی اُن کی شاعری میں بلند خیالی، ٹھہراؤ اور سنجیدگی نظر آتی تھی۔ وہ شروع سے ہی ایک شاعر کے نازک احساس، خواب آفرین اور نازک مشاہدے سے آراستہ رہے ہیں۔ اُن کی سب سے بڑی خوبی اُن کا اپنا انداز بیان ہے۔ اپنے لئے تکمیل کا راستہ خود ہی تلاش کرتے ہیں۔ اُن کے ہاں فکر واحساس کی تازگی نمایاں ہے۔ اُن کی لفظیات یا یوں کہیے شاعری کا دائرہ وسیع ہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ہمارے اکثر قلم کار خاموشی اختیار کرتے ہیں لیکن اپنی عمر کے اِس پڑاؤ پر بھی عرش صہبائی کو دیکھ کر اُن کی شعری تخلیقات پڑھ کر ایک جوان کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ عرش صاحب نے اپنے آپ کو غزل کی صنف تک محدود کر رکھا ہے لیکن ان کی غزلوں میں جو جدید احساس اور طرز احساس نظر آتا ہے، وہ اُن کی ملکی سطح پر ایک نمایاں غزل گو کی صورت میں ایک بلند اور منفرد مقام عطا کرتا ہے۔

عرش صہبائی کی بہت ساری شعری تخلیقات کتابی صورت میں منظر عام پر آچکی ہیں۔ مجھے یاد نہیں آرہا ہے کہ اُن کی پہلی شعری تخلیق شکست جام تھی یا شگفت گل۔ شگفت گل جون ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی تھی (اسی سال عابد مناوری کی پہلی شعری تخلیق بہارِ غزل بھی شائع ہوئی تھی)۔ دراصل میں کہنا چاہتا ہوں کہ عرش صہبائی کی اولین تخلیقات ہی اُن کی شہرت کی بنیاد بنی اور ظاہر ہے تب سے اب تک اُن کا ادبی سفر جاری ہے اور یہ ادبی سفر مختلف نشیب وفراز سے گزر کر اب اُن بلندیوں تک پہنچ چکا ہے جو بہت کم قلم کاروں کو نصیب ہوتا۔ شکست جام اور شکست گُل کا ذکر میں اس لئے کر رہا ہوں کہ شاید اب دونوں کتابیں یا اِن کے نام ہمارے ذہنوں میں

محفوظ نہیں ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں اور کہنا چاہتا ہوں کہ بہت کچھ لکھنے کے باوجود بھی عرش صاحب کی اِن اولین شعری تخلیقات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا!۔

مرحوم شکیل بدایونی نے عرش صہبائی کے بارے میں کہا ہے:

''جناب عرش صہبائی بہترین غزل گو اور بڑے ہونہار باشعور جوان ہیں۔ اُن کا تغزل کافی نکھرا اور پھیلا ہوا ہے۔ زندگی کی نقاشی اور کائنات کی عکاسی بھی جلوہ گر ہے۔''

شگفتِ گُل سے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں۔

- یہ عشق ہے یا کوئی بلا ٹوٹ پڑی ہے — کیا دل لگانے کی سزا اتنی کڑی ہے!
- چھا گئی میکدے پر پھر گھٹائیں جھوم کر — عرش استقبالی موسم میں ذرا ساغر اُٹھا!
- ایک وہ ہیں کہ ہر بات پر ہیں برہم سے — ایک میں ہوں کہ ہر بات پر ہنس دیتا ہوں!
- دور تک ہے نور کی ایک لہر سی — کون گزرا ہے یہاں سے بے نقاب!

ساغر بھی رُو بہ رُو ہے صراحی بھی پاس ہے
کیا بات ہے کہ پھر بھی طبیعت اُداس ہے!!!

عرش صہبائی کے اِن اولین اشعار میں بھی غزل کی زبان ہے۔ سلامت، شگفتگی، روانی اور متانت ہے، سلیقۂ اظہار ہے!۔

عرش صاحب کی ادبی عمر کا قیمتی سرمایہ اب کلیات کی صورت میں پیش کرنے کی ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، ادبی لحاظ سے وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اُن کا کلام آج بھی تواتر اور باقاعدگی کے ساتھ مختلف جرائد میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ اس کلام کو کلیات میں سمیٹنے کی ضرورت ہے۔

عرش اُن کی بزم میں پھر اپنی رسوائی ہوئی
آج پھر ہم ضبط کا انعام لے کر آئے!!!

☆☆☆

☆......ولی محمد اسیر کشتواڑی

عرشؔ صہبائی: ماضی کے جھروکے سے

عرشؔ صہبائی میرے اُن دیرینہ دوستوں میں شامل ہیں جن کے ساتھ میں گزشتہ تیس برس سے ادبی رشتہ قائم رکھے ہوئے ہوں۔ وہ شاید ۱۹۸۸ء میں فریدیہ بزمِ ادب، ڈوڈہ کے زیر اہتمام منعقدہ تیسرے کُل ہند مشاعرے میں شرکت کرنے کے لئے ڈوڈہ تشریف لائے تو تب سے اب تک ہم ایک دوسرے کے قریب رہے۔ میں جموں میں اُن کے زیرِ صدارت کئی مشاعروں اور ادبی پروگراموں میں برابر حصہ لیتا رہا ہوں۔ انہوں نے اپنے ایک شعری مجموعے میں اور لوگوں کے علاوہ میرا بھی اظہارِ تشکر کیا ہے اور آجکل ہم اُن کے دو شعری مجموعوں کو شائع کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں اپنے چوالیس سالہ ادبی سفر کے طویل عرصہ میں بلند پایہ ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور فنکاروں کے بہت ہی قریب رہا جن کی صحبت کا ثمرہ میری ادبی کاوشیں ہیں جن کی بدولت میں ادبی میدان میں متعارف ہوگیا۔ ویسے تو عرشؔ صاحب کے ساتھ وقتاً فوقتاً ادبی اور فنی موضوعات پر اچھی گفت و شنید ہوتی رہتی ہے لیکن مجھے ۱۸/اپریل ۲۰۱۸ء سے ۲۰/اپریل ۲۰۱۸ء تک اُن کے ساتھ سرکٹ ہاؤس سرینگر میں جی بھر کر ملاقات کرنے کی سعادت نصیب ہوگئی۔ ان تین دنوں کے دوران عرشؔ صاحب (جو مجھ سے تقریباً چوبیس سال عمر میں بڑے ہیں) کے ساتھ کئی معاملات پر کھُل کر بحث ہوئی اور اس طرح صاحبِ موصوف سے متعلق خاطر خواہ شناسائی حاصل ہوئی۔

۸۸ سالہ عرشؔ کی شخصیت ایک چلتی پھرتی انجمن [illegible] کی مانند ہیں۔ چھوٹی عمر ہی سے اُردو دُنیا کے ساتھ جُڑے رہنے کے باعث اُن کے پاس واقعات و مشاہدات کا ایک بے پناہ خزانہ موجود ہے، جس کو حاصل کرنے کے لئے ان کے ساتھ بیٹھنے اور گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا سرینگر کے سفر کے دوران ان کی جو باتیں میرے ساتھ ہوئیں انہیں تحریر کرنے سے پہلے میں چند حقائق بیان کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ عرشؔ ایک بے باک اور صاف گو انسان ہیں۔ وہ تمام تر تعصّبات سے بالاتر ہیں۔ اگر انہیں کسی کے ساتھ والہانہ محبت ہے تو وہ صرف اچھی اُردو شاعری ہی ہے۔ آپ ہمیشہ مسکراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس پیرانہ سالی میں بھی نوجوانوں کی طرح چاک و چوبند ہیں۔ اُن کی یادداشت قابلِ رشک ہے۔ شاید ہی ہندوستان کا کوئی ایسا حصہ ہوگا جہاں انہوں نے مشاعرے نہ پڑھے ہوں۔ انہیں صاف و شفاف لباس اور سادہ کھانا پینا پسند ہے۔ سچ بات بولنے کی عادت آناً فاناً اُن کے لئے دشمن پیدا کرتی ہے مگر وہ زندگی اور شہرت کی ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں وہ خوش آمد اور چاپلوسی سے بے نیاز ہیں۔ ہاں اگر کوئی مُبتدی قلمکار رہبری کے لئے اُن کے پاس جاتا ہے تو وہ خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ کلام کی نوک پلک سنوارنے میں وہ جسمانی کمزوری یا ذاتی مصروفیات کے بہانے نہیں بناتے۔ اس لئے جموں و کشمیر کے اُردو شاعروں میں سے عرشؔ کا حلقۂ تلمذ بہت ہی وسیع ہے۔ ان پر تحقیق تو ہو رہی ہے، کچھ کتابیں بھی لکھی گئی ہیں مگر ابھی عرشؔ کی دلآویز شخصیت اور ہشت پہلو شاعری کو سمجھنے اور اس پر سنجیدگی کے ساتھ کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ وہ اپنی خوبصورت شاعری کی بدولت دور دور تک متعارف ہیں۔ چنانچہ وہ خود ہی بتاتے ہیں کہ ؎

عرشؔ سے ہم ملے نہیں لیکن
اِک تعارف ہے غائبانہ سا

عرشؔ صہبائی کو یہ گلہ ہے کہ جموں و کشمیر میں اُن کی اتنی پذیرائی نہیں ہوئی جتنی کہ انہیں ملکی سطح پر ہو رہی ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ تقریباً ہر بڑے شاعر اور ادیب کے ساتھ مقامی سطح پر کچھ ایسا ہی ہوتا آیا ہے جس کا شکوہ بڑے بڑے شاعروں نے اپنے شعروں میں کیا ہے۔ بہرحال جو واقعات عرشؔ صاحب نے بیان کئے ان کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے:

۱۔ عرشؔ صاحب نے بتایا کہ راست گوئی اور انسان دوستی کا درس انہیں اپنے سورگیہ پتا جی مادھورام ابرول سے ملا ہے جو ایک روشن ضمیر اور دور اندیش بزرگ تھے۔ عرشؔ نے اس بات کا بھی انکشاف کیا کہ اُن کے والدِ ماجد نے اپنے انتقال کرنے کی تاریخ اور وقت کے بارے میں پہلے ہی اعلان کیا تھا جو بالکل درست ثابت ہوا۔ انہوں نے کہا پتا جی نے جس دن صبح کے نو بجے اپنے رحلت کرنے کی بات کی تھی عین اسی دِن وہ بتاتے رہے کہ میری ٹانگوں سے میری روح نکل چکی ہے۔ پھر کچھ وقفے کے بعد بتایا کہ اب میرے سینے تک میری جان نکل گئی ہے۔ پھر ہاتھ ہلاتے ہوئے ابدی نیند سو گئے مگر کسی ذہنی کوفت اور بے چینی کے شکار نہ ہوئے۔

۲۔ ایک مرتبہ جالندھر میں ٹی۔ آر۔ گپتا سُمنؔ نامی ایک ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے گھر پر کُل ہند مشاعرے کا اہتمام ہوا جس میں عرشؔ صاحب نے بھی شمولیت کی۔ اس مشاعرے میں اور لوگوں کے علاوہ فراقؔ گھورکھپوری صاحب بھی موجود تھے۔ مشاعرہ رات کو ختم ہوا، تو عرشؔ کے علاوہ تمام شاعروں کو فیس کی ادائیگی ہوئی، تو انہوں نے مہتمم سے پوچھا کہ میں نے کیا جُرم کیا ہے۔ میرے پیسے دے دو تو میں جموں واپس چلا جاؤں گا۔ مہتمم نے کہا کہ آپ کا عطیہ صبح میرے گھر آ کر ملے گا تو اسی بہانے سے ایک بار اور ملاقات ہو جائے گی۔ جب عرشؔ صاحب حسبِ پروگرام میزبان کے گھر پہنچے تو وہ اُن کا ہاتھ تھامتے ہوئے انہیں فراقؔ صاحب کے پاس لے گئے (جو وہیں پر قیام پذیر تھے)۔ تو فراقؔ صاحب نے انہیں دیکھ کر میزبان سے کہا کہ کیا آپ اِن کو میرے ساتھ تعارف کروانے کے لئے لائے ہیں۔ ہم نے کئی مشاعروں میں اکھٹے شرکت کی ہے۔ اس لئے ہم ایک دوسرے سے اچھی طرح متعارف ہیں۔ پھر فراقؔ صاحب نے عرشؔ صاحب کو اپنے قریب بٹھانے اور ناشتہ کروانے کے بعد کہا کہ عرشؔ صاحب میں آپ سے دو سوال کرتا ہوں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ آپ نے عرشؔ کشمیری یا عرشؔ جموی تخلص کیوں نہیں رکھا اور آپ نے اپنے نام کے ساتھ عرشؔ کیوں نہیں جوڑا۔ عرشؔ نے جواب میں کہا کہ یہ میرے والد صاحب کی دین ہے جو نام میں نہیں بلکہ کام میں یقین رکھتے تھے۔ اُن کی نظر میں سب سے بڑا مذہب انسانیت تھا۔ عرشؔ کا جواب سُن کر فراقؔ صاحب نے اُن کے والد کی زبردست تعریف و

توصیف کی۔ پھر فراقؔ صاحب نے دوسرا سوال پوچھتے ہوئے کہا کہ احسان دانشؔ صاحب نے حفیظؔ جالندھری صاحب کے بارے میں ایک مضمون لکھا ہے کہ حفیظؔ جالندھری گیت کا شاعر ہے۔ اس مضمون پر جو ہنگامہ آرائی ہو رہی ہے وہ کیسے ختم ہو سکتی ہے۔ عرشؔ صہبائی نے جواب دیتے ہوئے بتایا کہ صرف ایک لفظ کے استعمال سے یہ معاملہ حل ہو سکتا ہے۔ فراقؔ صاحب نے حیرانگی کی حالت میں پوچھا کہ وہ کون سا لفظ ہے۔ عرشؔ نے کہا کہ دانشؔ صاحب کو اپنے مضمون کے آخر میں یہ لکھنا چاہیئے تھا کہ حفیظؔ جالندھری مجموعی طور پر گیت کا شاعر ہے۔ فراقؔ صاحب نے بے حد داد دیتے ہوئے کہا مجھے اس بات کا زبردست افسوس ہے کہ میرے ذہن میں یہ لفظ کیوں نہیں آیا۔

۳۔ عرشؔ صہبائی نے بتایا کہ مرحوم سید فتح حسین ظفر کاظمی جو جموں کے سینئر سپرانٹنڈنٹ آف پولیس تھے، ہر سال حسینی مشاعرے کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ جس میں عرشؔ صہبائی بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ایک بار انہوں نے عرشؔ کے بارے میں اس رائے کا اظہار کیا کہ ہم انہیں ۷۵ فی صد مسلمان اور ۲۵ فی صد ہندو سمجھتے ہیں کیونکہ انہوں نے ایک ہندو گھرانے میں جنم لیا ہے اور حق بات یہ ہے کہ نا وہ مسلمان ہیں اور نا ہی ہندو بلکہ فقط ایک انسان ہیں۔ عرشؔ صاحب نے وضاحت کی کہ مرحوم کاظمی صاحب موصوف کی یہ رائے عرشؔ صہبائی کے مجموعۂ کلام ''جواز'' میں شامل ہے۔

۴۔ عرشؔ صہبائی نے بتایا کہ ایک بار کالی داس گپتا رضاؔ (جنہیں ماہرِ غالبیات کہا جاتا ہے) نے ایک مضمون تحریر کیا تھا کہ پورے ہندوستان میں پچیس دانشور ہیں۔ اس فہرست میں انہوں نے عرشؔ کا نام بھی شامل کیا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں جب گوپی ناتھ امنؔ نے لال قلعہ (دہلی) کے مشاعرے کے سیکریٹری ہوا کرتے تھے تو انہوں نے جموں و کشمیر سے عرشؔ صہبائی کو بھی اس مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ اس سلسلے میں Tribune اخبار نے یہ خبر شایع کی کہ پہلی بار اُردو کے دو بڑے شاعر لال قلعہ کے مشاعرے میں شرکت کر رہے ہیں۔ پہلا نام ساحرؔ لدھیانوی اور دوسرا نام عرشؔ صہبائی ہے۔

۵۔ عرشؔ صہبائی نے فرمایا کہ ایک روز ایک لڑکی نے اُن کو ٹیلیفون کیا کہ کل دن کے گیارہ بجے گھر پر ہی رہیں۔ چنانچہ دوسرے روز وہ لڑکی مقررہ وقت پر اُن کے دولت کدہ پر حاضر ہوگئی۔ اس کے ساتھ ایک کیمرہ مین بھی تھا۔ چنانچہ انہیں حیدر آباد ٹی۔ وی کے لئے اُن کا انٹرویو لینا مقصود تھا۔ انٹرویو لیا گیا جسے اس لڑکی نے کافی پسند کیا۔ وہ لڑکی کافی تیز وطرار تھی کہنے لگی کہ میں آپ سے ایک ذاتی سوال کرنا چاہتی ہوں۔ عرشؔ نے کہا کہ کیا سوال کرنا ہے تو لڑکی نے پوچھا کہ کیا آپ نے کسی سے محبت کی ہے۔ یہ کہہ کر وہ لڑکی عرشؔ کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ عرشؔ نے کہا کہ میں اب بھی محبت کرتا ہوں۔ وہ حیرت زدہ ہوکر پوچھنے لگی کہ آپ کس سے محبت کر رہے ہیں۔ عرشؔ نے فی الفور جواب دیا کہ زندگی سے۔ اپنے سوال کا اتنا اچھا جواب سُن کر اس لڑکی نے کہا کہ وہ ساری عمر نہیں بھول سکتی ہے آپ نے کتنا خوبصورت جواب دیا۔

۶۔ چونکہ عرشؔ صاحب بے وزن یا کمزور شعر سُن کر ایک دم تلملا اُٹھتے ہیں اس لئے انہوں نے اس ضمن میں یہ واقعہ بیان کیا کہ پٹھان کوٹ (پنجاب) میں ایک شعری نشست ہو رہی تھی جس میں پنڈت میلا رام وفاؔ اور عرشؔ صہبائی دونوں شریک تھے۔ مشاعرے میں وفاؔ صاحب کے ایک شاگرد نے جب اپنا کلام پڑھا تو اس کی غزل میں ایک شعر کمزور تھا۔ وفاؔ صاحب نے وہ مصرعہ ترمیم کر کے پڑھا۔ عرشؔ صاحب نے بھی ترمیم کے بعد وہ مصرعہ پڑھا۔ شاگرد نے اپنے استاد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ پنڈت جی آپ میرے استاد ہیں۔ اس لئے آپ جو کچھ کہیں گے میرے لئے وہی حرفِ آخر ہے۔ عرشؔ صاحب ہمارے بڑے بھائی ہیں۔ انہوں نے بھی مصرعہ ترمیم کرنے کے بعد پڑھا ہے۔ لہٰذا میں کس ترمیم کئے گئے مصرعے کو قبول کروں۔ پنڈت جی نے کہا کہ جو میں نے کہا وہ بھی درست ہے جو عرشؔ صاحب نے کہا وہ بھی درست ہے۔ یہ آپ کا ذوقِ سلیم ہے جو پسند کریں۔

۷۔ عرشؔ صاحب نے بتایا کہ پانی پت (ہریانہ) میں ایک دفعہ ایک بہت بڑا مشاعرہ ہوا۔ کچھ لوگوں کا اصرار تھا کہ اگلی صبح کو ایک اور شعری نشست ہو جائے۔ عرشؔ صہبائی بھی اس مشاعرے میں شامل تھے۔ اس نشست میں کسی شاعر نے جو کلام پڑھا اس میں شعری سُقم موجود

تھا تو عرشؔ صہبائی نے حسبِ عادت سرِ بزم متعلقہ شاعر سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ کے کلام میں خامی ہے۔ اس کو درست کر لیں۔ عرشؔ نے مصرعہ موزوں کر کے پڑھ دیا بعد میں انہیں محسوس ہوا کہ یہ بات تو انہیں سرِ محفل نہیں کہنی چاہیئے تھی۔ لہٰذا اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے انہوں نے متعلقہ شاعر سے معذرت طلب کی اور کہا کہ آپ نے یقیناً میری بات کو برا مانا ہوگا اور آپ کو اپنی بے عزتی محسوس ہوئی ہوگی۔ اس شاعر نے جواباً کہا کہ عرشؔ صاحب، آپ نے میری کوئی بے عزتی نہیں کی بلکہ مجھے بے عزت ہونے سے بچالیا ہے۔ کیونکہ اگر یہی شعر میں کسی اور مشاعرے میں سینکڑوں لوگوں کے سامنے پڑھتا تو میری کیا عزت رہ جاتی۔

۸۔ عرشؔ صہبائی بطور ایڈمنسٹریٹو آفیسر آل انڈیا ریڈیو روہتک (ہریانہ) میں تعینات تھے۔ اُن کے پاس ایک دن کرشن نندا کرشنؔ نامی ایک شاعر تشریف لائے۔ رسمی ملاقات کے بعد انہوں نے عرشؔ صہبائی کو اپنی دو غزلیں اصلاح کے لئے پیش کیں جن کو موقع پر ہی عرشؔ صاحب نے درست کر دیا۔ کرشنؔ پانی پت کے رہنے والے اکونٹس ڈیپارٹمنٹ کے ایک بڑے آفیسر تھے جو پانی پت سے روزانہ آتے جاتے تھے۔ پھر یہ کلام کی اصلاح لینے کا سلسلہ باضابطہ شروع ہو گیا۔ ایک دن کرشن نندا نے عرشؔ کو بتایا کہ اُن کے اُستاد (جن سے وہ کلام کی اصلاح لیتے تھے) سونی پت میں رہتے ہیں۔ میں ہر اتوار کو اُن کے پاس کلام لے کر جاتا ہوں اور ساتھ ہی وِسکی کی بوتل بھی لے جاتا ہوں کیونکہ انہیں اس کا بڑا شوق ہے لیکن اُس وقت مجھے یہ سُن کر بڑی مایوسی ہو جاتی ہے جب کہ وہ کہتے ہیں کہ میرے پاس فرصت نہیں ہے اس لئے میں آپ کے کلام کو نہ دیکھ سکا۔ اس کے مقابلے میں جب میں آپ کے پاس آتا ہوں تو آپ اپنی اولین فرصت میں ضروری ترمیم کر کے کلام لوٹا دیتے ہیں۔ اس دن کے بعد وہ عرشؔ صہبائی کے مستقل شاگرد ہوئے۔

۹۔ اس زمانے میں جبکہ پٹھان کوٹ جموں ریل سروس دستیاب نہیں تھی اور صرف بس کا سلسلہ جاری تھا، پٹھان کوٹ کا ایک کالج جو شہر سے دور تھا، ہر سال طلباء کے درمیان شاعری کا مقابلہ کرواتا تھا۔ ایک مرتبہ عرشؔ صہبائی اور شباب للتؔ جج کے طور پر مدعو کیے گئے۔ ابھی مقابلہ شروع ہونے میں کچھ وقت باقی تھا اس لئے عرشؔ اور لِلتؔ دونوں چائے پینے میں مصروف

ہو گئے۔ شباب صاحب نے عرش صاحب سے کہا کہ کالج کے پرنسپل کا کہنا ہے کہ فلاں طالب علم کو پہلا انعام دیا جائے۔ عرش صاحب نے برانگیختہ ہو کر جواب دیا کہ اگر وہ طالب علم مستحق ہوگا تو یقیناً انعام اُسی کو دیں گے۔ اگر نہیں ہوگا تو ایسا ممکن نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے آپ پرنسپل صاحب سے مل کر میرے یہ خیالات اُن تک پہنچانے کی زحمت فرمائیں۔ شباب نے بتایا کہ انہوں نے پہلے ہی پرنسپل پر واضح کیا ہے کہ عرش صہبائی کسی کی حق تلفی نہیں کریں گے۔ عرش صاحب نے کہا کہ ایک بار اور سوچ لو۔ اگر انہیں ایسا منظور نہ ہو تو ابھی وقت ہے میں بس سے جموں واپس چلا جاؤں گا لیکن وہ نہ مانے۔ بہر حال مقابلہ ختم ہو گیا اور انعامات بھی تقسیم کر دیئے گئے۔ جن میں سے اس لڑکے کا نام نہیں تھا۔ پرنسپل صاحب نے عرش سے کہا کہ طلباء کی رہنمائی کے لئے آپ اپنا کلام سُنائیں۔ کلام سُنانے کے بعد انہیں جیپ میں بٹھا کر ڈرائیور کو ہدایت دی کہ عرش صاحب کو پٹھان کوٹ کے بس اڈہ تک پہنچا دے۔ عرش نے فرمایا کہ ابھی وہ جیپ کالج کے گیٹ پر پہنچی ہی تھی کہ اس ناراض طالبِ علم نے اُن کو گریبان سے پکڑ کر جیپ سے نیچے اُترنے کو کہا۔ عرش نے اس طالبِ علم کو بڑے سلیقے سے سمجھایا کہ آپ طالب علم ہیں اس لئے آپ کو یہ حرکت زیب نہیں دیتی اور پوچھا کہ آپ کو میرے ساتھ کیا شکایت ہے۔ طالبِ علم نے بتایا کہ میں جالندھر کا رہنے والا ہوں اور آپ کی شادی بھی جالندھر ہی میں ہوئی ہے۔ اس لئے مجھے یقین تھا کہ مجھے اوّل انعام ملے گا اور پرنسپل صاحب نے آپ کو یہ پیغام بھی بھیج دیا تھا۔ اس پر عرش نے اُسے سمجھایا کہ انعام کے لئے یہ یہ باتیں ضروری نہیں ہوتی ہیں اور اس نے مطمئن ہو کر معافی مانگ لی۔ البتہ عرش کی پُر خلوص ہدایات کی بناء پر اس نے دوبارہ تیاری کی اور دوسرے سال اُسی نے پہلا انعام جیت کر خوشیاں منائیں۔

۱۰۔ عرش صہبائی نے مشاعروں کے سلسلے میں ہندوستان کے کئی مقامات کا دورہ کیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ سب سے اچھے سامعین مالیر کوٹلہ (پنجاب) کے بعد بھدرواہ میں ملتے ہیں۔ اس کے بعد کشتواڑ کا نمبر آتا ہے۔ کشتواڑ کے بعد ڈوڈہ کو گردانا جاتا ہے مگر اب ڈوڈہ میں ادبی سرگرمیاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

۱۱۔ جہاں تک عرشؔ صہبائی کی شاعری کا تعلق ہے تو ہم اس ضمن میں اُن کی ۱۹۵۰ء میں کہی ہوئی غزل کے یہ شعر پیش کر سکتے ہیں۔

اچھی ہیں رحمتیں میرے پروردگار کی — دن ہی قرار کے ہیں نہ راتیں قرار کی
بادِ خزاں رہے سہے تنکے بھی لے اُڑی — دے کر دلِ حزیں کو تسلّی بہار کی
دو چار گھونٹ کے لئے اے پیرِ میکدہ — لینا نہ بد دعائیں کسی بادہ خوار کی
ہنس ہنس کے کھا رہا ہوں فریبِ حیات عرشؔ — لذّت نہ پوچھ مجھ سے غمِ روزگار کی

ان کی ایک نظم جو بہت ہی مشہور ہے، اس طرح ہے۔

چہرے سے اپنے گیسوئے مُشکیں سنبھال کر — پردے سے اپنا چاند سا مکھڑا نکال کر
بانکی ادا سے ریشمی آنچل اُچھال کر — دیوانہ وار آنکھوں کو آنکھوں میں ڈال کر

۱۲۔ عرشؔ صہبائی کو زندگی میں سب سے زیادہ شہرت جس شعر سے ملی وہ اس طرح ہے۔

دِل تو کیا چیز ہے ہم روح میں اُترے ہوتے — تُم نے چاہا ہی نہیں چاہنے والوں کی طرح

عرشؔ صاحب نے بتایا کہ ان کی یہ غزل لاہور ریڈیو سے گزشتہ تیس پینتیس برس سے گائی جا رہی ہے اور اوپر جس شعر کا حوالہ دیا گیا ہے وہ شعر وہاں کی بسوں پر بھی لکھا ہوا ہے۔ انہوں نے اس بات کا بھی انکشاف کیا کہ ۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ ختم ہونے کے بعد پاکستان سے امن قائم کرنے کے سلسلے میں ایک وفد ہندوستان آیا تھا۔ اس وفد میں شامل لوگوں نے اپنے ہاتھوں میں جو بینر پکڑے ہوئے تھے اُن میں سے ایک بینر پر بھی یہی شعر لکھا ہوا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ایک مرتبہ ایک فوجی افسر اور اس کی بیوی انہیں ملنے کے لئے آئے تو انہوں نے بتایا کہ آپ کا کہا ہوا شعر لال چوک سرینگر میں پولیس کی طرف سے نصب کئے گئے ایک بورڈ پر لکھا ہوا ہے جسے دیکھ کر ہمیں آپ سے ملنے کا اشتیاق ہو گیا۔ عرشؔ صاحب نے وضاحت کی کہ وہ شعر بھی وہی تھا جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

عرشؔ صاحب نے اس سلسلے میں ایک بڑا دلچسپ لطیفہ بھی سُنایا کہ جیند (ہریانہ) میں

جب وہ اپنا کلام پیش کرنے کے لئے مائیک کے پاس آرہے تھے تو ناظمِ مشاعرہ نے بھی آپ کا تعارف اسی شعر سے کروایا۔ ڈائس پر تشریف فرما دہلی کی ایک شاعرہ نے کہا کہ عرشؔ صاحب کا یہ شعر مجھے گزشتہ پچاس سال سے یاد ہے، اس لئے میری اُن سے درخواست ہے کہ وہ یہی غزل پڑھیں۔ چنانچہ عرشؔ کو اس غزل پر کافی داد ملی۔ جب انہوں نے یہ شعر پڑھا کہ ؎

دِل تو کیا چیز ہے ہم روح میں اُترے ہوتے
تم نے چاہا ہی نہیں چاہنے والوں کی طرح

تو یہ شعر سُن کر سامعین میں ایک خاتون کھڑی ہوگئی اور عرشؔ سے سوال کیا کہ یہ شعر آپ نے کس کے لئے کہا ہے۔ عرشؔ نے ظریفانہ انداز میں جواب دیا کہ کم سے کم آپ کے لئے تو نہیں کہا ہے۔ یہ سُن کر تمام محفل قہقہ زار بن گئی۔

عرشؔ صاحب سے اور بھی کئی اہم باتیں ہوئیں لیکن طوالت سے دامن بچاتے ہوئے اسی پر اپنی بات ختم کرتے ہیں ؎

رہی زندگانی ملیں گے سدا　　　اگر مُردہ باشد حوالے خدا

☆☆☆

☆ اپنی نِگارشات صاف صاف اور کاغذ کے ایک ہی طرف لکھیں۔ تبدیلی پتہ یا فون نمبر بدلنے کی صورت میں ہمیں مطلع کرنا نہ بھولیں۔ (ادارہ)

☆☆☆

عرشؔ صہبائی۔ حسنِ اخلاق کا پیکر

اُردو کی کئی قد آور شخصیات نے اِس بات کا اعتراف کیا ہے کہ عرشؔ صہبائی ایک فرد نہیں بلکہ ایک ادارہ ہیں۔ ایک ایسا ادارہ جس سے کئی شاعر اور شاعرات وابستہ ہیں۔ عرشؔ صہبائی نے کئی قلمکاروں کو ادب کے اُفق پر پرواز کرنے کے لئے صرف طاقتِ پرواز ہی عطا نہیں کی بلکہ پرِ پرواز سے بھی نوازا ہے۔ ایسے فنکاروں کی ایک طویل فہرست ہے جس کا اُنہوں نے کبھی تذکرہ نہیں کیا۔ اگر اُن سے اِس نوعیت کا کوئی سوال کیا جائے تو وہ چند الفاظ میں اِتنا ہی کہتے ہیں کہ میں خُود طفلِ مکتب ہوں۔ وہ شاعری کے میدان میں ایسے طِفلِ مکتب ہیں جن سے عُمر رسیدہ فنکار بھی رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ جب اُن کے کسی عزیز کا شعری مجموعہ شائع ہو کر منظرِ عام پر آتا ہے اور اُس کی شہرت کا باعث بنتا ہے تو اُنہیں بے حد خوشی ہوتی ہے۔ وہ اِس میں فن کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اِس کے بارے میں اُن کی اِس بات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا ہے کہ وہ اُردو شاعری کے بارے میں کسی حد تک مایُوس ہیں۔ اُن کا یہ خیال خطوط کی شکل میں کئی ادبی رسائل میں منظرِ عام پر آچُکا ہے۔

اِس میں شک نہیں کہ بطور اُردو شاعر عرشؔ صہبائی کو عالمی سطح پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اُن کی شاعری ایک انفرادی پہلو لئے ہوئے ہے۔ اُنہوں نے بقول قبلہ جوشؔ ملسیانی (مرحوم) اُردو غزل کو نئی زمینیں دی ہیں۔ اُن کی یہ رائے عرشؔ صہبائی کے اوّلین شعری مجموعہ ''شکستِ جام'' میں شامل ہے جو 1958ء میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آیا تھا۔ اگر آج قبلہ جوشؔ ملسیانی زندہ ہوتے تو

دیکھتے کہ عرشؔ صہبائی نے اُردو کو نئی زمینیں ہی نہیں دیں بلکہ نئے اشعار بھی دیئے ہیں۔

اُن کے بے شُمار اشعار زباں زدِ خواص و عوام ہیں۔ بیشتر قدآور شعرائے کرام نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اُنہوں نے عرشؔ صہبائی کے کلام سے متاثر ہو کر شاعری شروع کی۔ اُن کے اِس قول کو سب نے قبول کیا ہے کہ ''ایک اچھا انسان ہی ایک اچھا فن کار بن سکتا ہے۔'' یہ جملہ اپنے اندر کئی تعمیری پہلو لئے ہوئے ہے۔ اِس میں اُن کی اپنی ذات بھی شامل ہے۔ مجھے اِس بات کا اعتراف ہے کہ جموں اور پنجاب میں بہت سارے ایسے شعراء ہیں جن کے کلام کو عرشؔ صہبائی نے دیکھا ہے اور اِصلاح کی ہے۔ وہ شاعری کو ایک عبادت سمجھتے ہیں۔ اس عبادت میں ان کی ایمانداری بھی شامل ہے۔ اِس کا ثبوت ہندو پاک میں شائع ہونے والے ادبی رسائل میں مل جاتا ہے جہاں اُن کا کلام شائع ہوتا ہے۔ اچھے سے اچھے ادبی رسالے کو اُن کا تعارف حاصل ہے۔ اگر کسی کو آمد اور آورد کا مطلب سمجھنا ہو تو اُن کے کلام سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اِس وقت تک اُن کے 20 سے زائد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ اِس بات کا ذِکر بے جا نہ ہوگا کہ جموں یونیورسٹی سے اُن کے کلام پر ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی ہو چکی ہے۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے ایک طالب علم حال ہی میں اُن پر پی۔ایچ۔ڈی کر چکا ہے۔ اِس بات کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اُن کا کلام ایک الگ حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ یہاں اِس بات کا ذِکر بے محل نہیں ہوگا کہ ایسے کئی شعری مجموعے اُردو اور ہندی میں مُرتب ہو چکے ہیں جن میں صہبائی صاحب کا کلام شامل کیا گیا ہے۔

عرشؔ صہبائی نے مُلکی سطح پر کئی اہم شعری مجموعوں کے دیباچے تحریر کئے ہیں جو بے حد مقبول ہوئے ہیں۔ اُس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ دیباچے مجموعہ میں شامل کلام پر لکھے گئے ہیں جب کہ آج کے دور میں کس شاعر کے مجموعہ پر جو دیباچہ تحریر کیا جاتا ہے وہ ذاتی تعلقات کی بنا پر ہوتا ہے۔ اُس دیباچہ کا تعلق اُس مجموعہ میں شامل کلام سے بہت کم ہوتا ہے۔ اِس کا ایک ردعمل یہ ہوا ہے کہ دیباچوں کی اہمیت ختم ہو گئی ہے۔ ایسے دیباچوں سے صرف دیباچہ نگاروں کی تشہیر ہوتی ہے اور شاعری مذاق بن کر رہ گئی۔ ہم اِس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ عرشؔ صہبائی جس

مشاعرہ میں شرکت کرتے ہیں اُس مشاعرے کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اُن کی شرکت کامیابی کی ضامن ہوتی ہے۔ عرشؔ صاحب کا شمار اُردو کے قدآور شاعروں میں کیا جاتا ہے۔ لیکن وہ اپنے کو طفلِ مکتب سمجھتے ہیں۔ اُنہیں بے شمار اُردو انجمنوں کی طرف سے نوازا جاچکا ہے۔ موصوف اُن اعزازات کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں جو انہیں غیر سرکاری ادبی انجمنوں نے دئے ہیں۔ جب اُن کی ذاتی زندگی کا جائزہ لیں تو وہ صرف انسانیت کے جذبہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ کئی قسم کی رسموں میں بھی یقین نہیں کرتے۔ اُن پر جو کتابیں لکھی گئیں ہیں ایک کتاب میں نمایاں طور تحریر کیا گیا ہے کہ اُن کے انتقال کے بعد کوئی مذہبی رسم نہ اپنائی جائے۔ اُنہیں سپردِ آتش کرنے کے بعد اُن کی باقیات جموں سے باہر کسی بھی نہر یا دریا میں ڈال دی جائیں۔ جموں سے اُنہیں کوئی لگاؤ نہیں۔ وہ اپنے آپ کو ریاست کا شاعر تسلیم نہیں کرتے اور اپنے نام کے ساتھ رسائل میں ریاست کا ذکر پسند نہیں کرتے۔ دوردرشن جالندھر نے اُن پر ایک ڈاکومینٹری فلم تیار کی ہے۔ یہ واحد فلم ہے جو ریاست کے کسی شاعر پر تیار کی گئی۔

☆☆☆

☆☆☆

☆......ڈاکٹر کرن سنگھ کرن

عرشؔ صہبائی: شخصیت کے کئی دلچسپ رنگ

۱۹۹۲ء کی بات ہے میں پی ایچ ڈی کے کام میں مصروف تھا۔ لیکن کسی طور بھی مواد فراہم نہیں ہو رہا تھا۔ اُن دِنوں میرے دل میں ایک بات آئی کہ عرشؔ صہبائی، جو جوشؔ ملسیانی کے شاگرد رہے ہیں، اُن سے ملاقات کی جائے۔ اگرچہ میرا پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کا کام جوشؔ ملسیانی کے بیٹے عرشؔ ملسیانی پر تھا۔ پھر بھی میں نے او۔ پی۔ مانو[1] صاحب سے خواہش ظاہر کی کہ مجھے عرشؔ صہبائی صاحب سے ملائیں۔ تو ایک دن مانو صاحب مجھے عرش صہبائی کے گھر لے گئے۔ اتفاقاً عرشؔ صہبائی گھر پر موجود تھے۔ میں نے پہلی بار عرش صہبائی کو دیکھا۔ بڑے مزے کی باتیں سُننے کو ملیں۔ دیر تک گپ شپ رہی۔ عرشؔ صہبائی صاحب نے جوشؔ ملسیانی کی اور اُن کے کئی دوسرے شاگردوں کی باتیں سُنائیں، مختلف شعر بھی سُنائے، کئی شعری محفلوں کا تذکرہ کیا۔ مختصراً یہ کہ پہلی ملاقات میں ہی، میں اُن کا گرویدہ ہوگیا۔ اگرچہ میری ضرورت کے مطابق اُن کے پاس کوئی مواد تو نہیں تھا۔ تاہم کئی قیمتی مشوروں سے اُنہوں نے مجھے ضرور نوازا۔ یہ تھی اُن سے میری پہلی ملاقات کی روداد۔ اُس کے بعد اُن سے ملنے کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ اُن کے پاس میں جب بھی گیا، بڑے تپاک اور خلوص سے ملے۔ یہ فقط مجھ تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ اپنے ہر ملنے والے سے بڑی محبت سے ملتے ہیں۔ ملنے والا محسوس کرتا ہے کہ میں کسی ملنے والے سے مل

---

[1] او۔ پی۔ مانو صاحب گورنمنٹ رنبیر ہائر سیکنڈری سکول جموں میں انگریزی کے لیکچرر تھے۔ ۸۵۔۱۹۸۴ء میں ہمیں بھی کٹھوعہ میں انگریزی پڑھاتے تھے۔

رہا ہوں اور مل کر بڑے فائدے میں ہوں۔ یقیناً عرشؔ صہبائی صاحب بڑے باغ و بہار قسم کے انسان ہیں۔ اُن کے چہرے پر ایک دائمی مُسکان رہتی ہے۔ جو ہر ملنے والے کے دل میں ایک جگہ بنا لیتی ہے۔

میں جب بھی عرشؔ صہبائی صاحب کے ہاں گیا، تو انہیں اکثر لکھنے میں مصروف پایا۔ کاغذوں کا ایک دفتر اُن کے دائیں بائیں پھیلا ہوتا ہے۔ کچھ اخبار و رسائل اور کچھ شعری و نثری کتابیں بھی اُن کے سامنے دیکھنے کو ملتی ہیں۔ موصوف اپنا کام چھوڑ کر ملنے والوں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ خیر و عافیت پوچھنے کے بعد کئی لطیفے، شگوفے، شعری واقعات سُنا کر دل خوش کر دیتے ہیں۔ اگر چہ ہمارا کچھ ادبی کام ہوگا، تو اپنی تمام مصروفیات کو چھوڑ کر پہلے ہمارا کام کریں گے۔ یہ اُن کا دستور ہے، میرے لئے ہی نہیں بلکہ اُن کے پاس کوئی بھی اُن کا ملنے والا حتیٰ کہ اُن کا دشمن بھی جائے گا تب بھی ادبی کام کے لئے وہ کسی کو بھی انکار نہیں کرتے۔

میں نے اکثر دیکھا ہے اُن کے پاس کئی کتابیں تبصرہ کے لئے، رائے حاصل کرنے کے لئے، مقدمہ لکھنے کے لئے، تنقیدی مضمون لکھنے کے لئے باہر سے آتی رہتی ہیں۔ حالانکہ اُن کو اس سے کوئی مالی فائدہ نہیں ہوتا۔ تاہم اُن کے دل میں کبھی شِکن پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ اس کام کو اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں اور بخوبی نبھاتے ہیں۔ بلکہ بڑی تندہی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ہر کسی کی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ میں اُن کے کردار اور بلند اخلاق کا معتقد ہوں۔ آج کے دور میں اس طرح کے لوگ ڈھونڈنے سے نہیں ملتے۔ وہ کسی کی حوصلہ شکنی نہیں کرتے بلکہ حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ کئی طرح کے حالات و واقعات سُنا کر نئے لکھنے والوں میں ایک تحریک پیدا کرتے ہیں۔ حوصلہ دیتے ہیں، ہر ممکن رہنمائی اور مدد کرتے ہیں۔ مزید مدد کا وعدہ بھی کرتے ہیں۔ اُن کے سایہ عاطفت میں آکر کتنے لوگ جو ایک مضمون نہیں لکھ سکتے تھے، اُن کے مضامین کے مجموعے چھپ کر آگئے۔ یہ سب عرشؔ صہبائی صاحب کی حوصلہ افزائی، رہنمائی، قیمتی مشوروں اور مدد کا نتیجہ ہے۔

میں نے بعض اوقات دیکھا ہے کہ عرشؔ صہبائی صاحب اپنے کمرے میں بیٹھے ہیں اور اُن کے ارد گرد چار پانچ لوگ موجود ہیں۔ اُن میں سے کچھ لوگ کلام پر اصلاح لینے آتے ہیں۔

کچھ اپنی کتاب کے لئے تاثرات لکھوانے، کچھ محض ملنے کی خاطر اور کوئی کسی ادبی نشست کا دعوت نامہ دینے یا کسی مشاعرہ یا کسی کتاب کی رسم اجراء میں شامل ہونے کے لئے درخواست کر رہا ہے اور اِدھر عرشؔ صہبائی صاحب ہیں کہ سبھی کی فرمائشیں حسبِ ضرورت اور حسبِ موقع پوری کر رہے ہیں۔ سبھی کو چائے پانی سے بھی نوازتے ہیں۔ بعض اوقات اندر سے پانی بھی خود ہی لاتے ہیں اور پھر خالی گلاس چھوڑنے بھی جاتے ہیں۔ اُن کے چہرے پر رنج وغم کے آثار بالکل نہیں ہوتے اگرچہ وقت کی ناقدری اور اخلاقی قدروں کے فقدان کا ذکر کئی بار کرتے ہیں۔ ادب میں گروہ بندی اور مافیہ گروہ کا ذکر اکثر کرتے ہیں۔ اور اس پر کڑی تنقید کرتے ہیں۔ کوئی اچھا فن پارہ ہو۔ کوئی اچھی کتاب شائع ہوئی ہو یا کوئی تقریب اچھی رہی ہو، تو اُس کا ذکرِ خیر کرتے رہتے ہیں۔ کسی طرح کے تعصب کا نشان تک اُن کے پاس نہیں ملتا۔ ہر مذہب کے لوگ اُن کے خاطر خواہ ہیں۔ جن میں ہندو، مُسلم، سِکھ، عیسائی سبھی شامل ہیں۔ ادبی خِدمت کے سلسلے میں اُن کے پاس سبھی برابر ہیں۔ اگرچہ اس بات کا فیصلہ وہ کام کی نوعیت کے مطابق لیتے ہیں کہ کس کی فرمائش کو اولیت کی ضرورت ہے۔ ادبی خِدمت ہی اب اُن کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ادب کی خدمت کرنا، وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

عرشؔ صاحب بڑے لطیفہ گو اور بذلہ سنج طبیعت کے مالک ہیں۔ شگوفے ایسے سناتے ہیں کہ بعض اوقات تنہائی میں بھی ہنسی آجاتی ہے۔ ایک دن ان کے کچھ عقیدت مندوں نے کہا کہ "عرشؔ صاحب! ہم آپ کا ایک دن منانا چاہتے ہیں۔" ابھی انہیں مزید کچھ کہنا تھا کہ عرشؔ صاحب ہنس پڑے اور اور فی البدیہہ یہ شعر پڑھا:

● میرا جشنِ وفات کب ہوگا — مجھ کو اس میں شریک ہونا ہے

اُن کے کئی ایسے اشعار بھی ہیں جن میں جموں کا ذکر ہے لیکن منفی معنوں میں، اس کی وجہ ہی ظاہر نہیں ہوسکی۔

دور تک ہے بے حسی کی اک فصیل
عرشؔ جموں پتھروں کا شہر ہے

عرشؔ طبیعت کو دونوں ہی نہ راس آئے
جموں کی یہ مٹی بھی جموں کا یہ پانی بھی

اِنکساری کا یہ عالم ہے کہ ان کے کلام میں ہی اس کا عکس ہے۔

میرے اشعار میں بھی خوبیاں ہوں گی اے عرشؔ
میں بھی انسان ہوں، انسان سے خطا ہوتی ہے

بطورِ شاعر عرشؔ صہبائی ریاست کی ایک معتبر آواز ہے۔ ریاست کی ہی نہیں بلکہ برصغیر کی معتبر آواز کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ انہوں نے اُردو شاعری کی خدمت میں نصف صدی سے زیادہ عرصہ وقف کیا ہے۔ اس وقت تک اُن کے ڈیڑھ درجن کے قریب شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ۱۹۵۰ء سے لگ بھگ اُن کا کلام مختلف اخبار ورسائل میں چھپ رہا ہے۔ یہ بات اس وقت بڑے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ برصغیر کا شاید ہی کوئی ایسا معتبر اخبار یا رسالہ ہوگا جس میں موصوف کا کلام نہ چھپا ہو۔ بلکہ ملک کے طول وعرض کے تمام اخبار ورسائل میں اُن کا کلام چھپّا ہے، اب تو صورتِ حال ہی بالکل مختلف ہے کہ ملک کے طول وعرض سے مختلف اخبار و رسائل میں عرشؔ صہبائی صاحب کو چھاپنا قابلِ فخر سمجھا جاتا ہے۔ خاکسار نے کئی دفعہ بذاتِ خود دیکھا ہے کہ کئی اخبار ورسائل کے مدیر، موصوف کے نام خط لکھتے ہیں کہ ''پہلے بھی کئی بار گزارش کر چکے ہیں لہٰذا اب پھر گزارش کی جاتی ہے کہ کلام بھیجیں تو عین نوازش ہوگی۔'' اگرچہ عرشؔ صہبائی صاحب متواتر لکھتے رہتے ہیں۔ کچھ اخبار میں کلام بھیج دیتے ہیں، کچھ میں نہیں بھیج پاتے۔ کیونکہ موصوف کے پاس اُن کے سائلوں کا ایک تانتا لگا ہوتا ہے کہ کسی کے کلام کی اصلاح کرنی ہے۔ کسی کی کتاب کے لئے دیباچہ یا مقدمہ لکھنا ہے یا اسی نوعیت کا کوئی اور کام۔ عرشؔ صہبائی صاحب کے مختلف شعری مجموعوں میں ''شگفتِ گل''، ''شکستِ جام''، ''ریزہ ریزہ وجود''، ''اساس''، ''خدوخال''، ''چشم نیم باز''، ''صلیب''، ''نایاب''، ''دسترس''، ''یہ جھونپڑے یہ لوگ'' وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ اُن کا کلام صرف اُردو تک محدود نہیں ہے بلکہ ہندی میں بھی چھپا ہے۔ ''سائے تیری یادوں کے'' اور ''خوشبو تیرے بدن کی'' دونوں مجموعے ہندی رسم الخط میں

ہیں۔ اُردو دوہوں کا مجموعہ ''تجھ بن چین کہاں'' بھی شائع ہو چکا ہے، اسے خاکسار نے ہی ترتیب دیا ہے۔

عرشؔ صہبائی صاحب کسی مخصوص ادبی گروہ سے وابستہ نہیں ہیں بلکہ اُن کا معیار و مرتبہ تو گروہ بندیوں سے بالاتر ہے۔ اُن کی شاعری بھی کسی ایک مخصوص صنف تک محدود نہیں بلکہ اُنہوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ مگر زیادہ رُجحان ان کا غزل کی جانب ہے۔ اُن کے اشعار روایتی اشعار نہیں ہیں۔ بلکہ زندگی کے گہرے تجربات کو انہوں نے شاعری کا جامہ پہنا کر قاری کی تمام تر توجہ اپنی طرف مبذول کروائی ہے۔ اُن کے اشعار میں زندگی جھلکتی ہے اور زندگی کی خوبصورت تصویر کشی اُن کے اشعار میں ہیں۔ اُن کے اشعار لوگوں کو زبانی یاد ہیں، کیونکہ یہ اشعار زندگی کی تصویر کشی اور ترجمانی بڑے خوبصورت اور دلکش پیرائے میں کرتے ہیں۔ اس لئے اُن کے ایسے اشعار بھلائے نہیں بھولتے۔ مثال کے طور پر چند اشعار سماعت فرمائیں۔

- تم جو چھو لو گے تو بڑھ جائے گی قیمت میری — گیلی مٹی ہوں کھلونہ ہی بنا لو مجھ کو
- دل تو کیا چیز ہے ہم روح میں اُترے ہوتے — تم نے چاہا ہی نہیں چاہنے والوں کی طرح
- زندگی حادثوں کی ہے تقریب — وقت نامہ نگار ہوتا ہے
- ایک مرکز پر کبھی ہوتا نہیں اس کا قیام — زندگی کے واسطے درکار ہیں محور کئی
- مُجھ سے نہ پوچھ میری حقیقت کی داستاں — یہ زندگی کا راز ہے اس کو نا فاش کر
- عرشؔ اُن کی جھیل سی آنکھوں کا اس میں کیا قصور — ڈوبنے والوں کو گہرائی کا اندازہ نہ تھا
- زندگی ہر اک خوشی سے ہوگئی ہے ماورا — وقت نے اب کر دیا ہے رنج کا خوگر مجھے
- محلوں میں کیا ملے گا وفا کا سراغ عرشؔ — یہ چیز جھونپڑوں کی ہے ان میں تلاش کر
- مُسکرا کر لوگ ملتے ہیں ضرور — جس کو کہئے اپناپن [illegible] اور ہے
- تمام زندگی کٹتی ہے اس کی گردش میں — تمام زندگی انسان [illegible]رتا رہتا ہے
- اس کی فطرت نہیں کہیں رُکنا — وقت دریا ہے، بہتا رہتا ہے
- ہم زمانے کو بھول جاتے ہیں — یاد اُس کا سلوک رہتا ہے

عرشؔ صہبائی صاحب کو شاعری کرتے وقت کسی محنت کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ اشعار بذاتِ خود اپنے آپ کو اُن سے لکھواتے ہیں۔ زبان وفن پر اُن کو عبور حاصل ہے۔ ملازمت کے دوران وہ ملک کے مختلف مقامات پر رہ کر آئے ہیں۔ ملک کے طول وعرض میں بھانت بھانت کے لوگوں سے وابستہ پڑا ہے۔ بڑے حساس اور ذہین ہیں۔ جس نسل سے اُن کا تعلق ہے اُس نسل کو ادب سے عشق تھا۔ فن اور عروض کا پورا خیال رہتا تھا۔ جس موضوع کو چُن لیتے ہیں بہ خوبی ادا کرتے ہیں۔ شعریت اور معنویت اُن کے ہاں دست وگریباں نظر آتے ہیں۔ اُن کی غزلوں میں بھرتی کے اشعار نہیں ملتے۔ بلکہ کبھی کبھی انتخاب کرنا مشکل مرحلہ بن جاتا ہے کہ کس شعر کو لیں اور کِسے نظر انداز کریں، مضمون آفرینی اور ندرت اُن کے کلام کی خوبیاں ہیں۔

☆☆☆

☆☆☆

☆......سلمیٰ کاظمی شمع

عرشؔ صہبائی۔ قابلِ تعظیم انسان

فقط اہلِ نظر یہ جانتے ہیں
ہے ذرّے ذرّے میں تنویر اُس کی

اِس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ عالمی سطح پر جانے مانے شاعر عرشؔ صہبائی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ اُن کا نام بذاتِ خود ایک ایسا مِنارہ ہے جس سے ہر کسی کو فیض پہنچتا ہے۔ مجھے اکثر یہ احساس ہوتا ہے کہ اُردو زبان جس کا ماضی نہایت شاندار رہا ہے اور آج سے ستّر برس قبل جس کا ہندوستان میں بھی طوطی بولتا تھا اب اگر اختتام پذیر نہیں تو زوال پذیر تو ہو رہی ہے۔ اِس اُردو کے دَورِ کسمپرسی میں بھی جب عرشؔ صہبائی کے شعری مجموعوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہ فیصلہ کرنا ذرا دشوار ہو جاتا ہے کہ کیا واقعی اُردو شاعری پہ زوال آ رہا ہے۔ اطمینان ہوتا ہے کہ جب تک عرشؔ صہبائی جیسے، چند ہی سہی، اُردو کے شعراء اِس زبان کی آبیاری کر رہے ہیں اور اِس کے فروغ کے لیے اپنا بیش قیمتی وقت صرف کر رہے ہیں یہ زبان ختم نہیں ہو سکتی۔ اُردو شاعری کا اپنا ایک الگ مزاج ہے جو اِسے دوسری زبانوں کی شاعری پہ فوقیت عطا کرتا ہے۔ سماج کا کون سا ایسا طبقہ ہے جو اُردو بولتا یا سمجھتا نہ ہو۔ ہماری گھریلو زبان کوئی بھی ہو لیکن تہذیب اور تعلیم ہم اُردو زبان سے ہی سیکھتے ہیں۔ میں جب جانی پورہ بس سٹاپ سے صُبح کے وقت گزرتی ہوں تو دو چار

عمر رسیدہ ہندو بزرگوں کو ہند سماچار پڑھتے دیکھتی ہوں تو دل کو تھوڑی خوشی تو ہوتی ہے لیکن پھر گہری سوچ میں ڈوب جاتی ہوں کہ اُردو کو سینے سے لگانے والے لوگ آخر کب تک رہیں گے اور اُردو پڑھتے دکھائی دیں گے۔ عرشؔ صاحب اِس بات کو شِدّت سے محسوس کرتے ہیں کہ موجودہ ماحول اور دَور میں اُردو زبان کی خاصیت اور اہمیت کو پسِ پُشت ڈالا جا رہا ہے اور اِسے ختم کرنے کی سازشیں کی جارہی ہیں۔ اُنہیں بھی اِس بات کا انتہائی رنج ہے کہ مُلک تو دُور کی بات ہے ریاست جموں و کشمیر میں جہاں اُردو سرکاری زبان ہے اِس کے ساتھ ناروا سلوک کیا جا رہا ہے۔ تعلیمی اداروں سے اِسے رُخصت کرنے کا عمل شد ومد سے جاری ہے۔ حکومتی سطح پر اِس سے تعصب برتا جارہا ہے اور تنگ نظری کا رویہ اختیار کیا جارہا ہے۔ پھر بھی آج کے شُعراء میں عرشؔ صہبائی اُردو شاعری کا وقار قائم رکھنے میں اپنا فرض ایمانداری سے نبھار ہے ہیں اور اُردو شاعری کی آبرو کے رکھوالے بھی ہیں۔ میں تو یہاں تک کہہ سکتی ہوں کہ وہ اُردو زبان کا ایک بُلند پایہ اور ایک ایسا مضبوط ستون ہیں جس پہ اُردو زبان بجا طور پر فخر اور ناز کر سکتی ہے۔ اُن کی شاعری پر جتنا بھی ناز کیا جائے کم ہے۔ عرشؔ صہبائی عصری آگہی کے شاعر تو ہیں ہی لیکن اِس کے علاوہ وہ روحانی شاعر بھی ہیں۔ اُن کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو بہت سے ایسے اشعار ملیں گے جو اپنے دامن میں وسیع مطالب لیے ہوئے ہیں اور جن کو پڑھ کر اُن کے خیالات کی بُلندی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ وہ اپنے کلام کے ذریعے کیا خوب تربیت دے رہے ہیں:

- خود پہ بھی کُچھ کیجیئے تنقید ۔۔۔ خود بھی اپنی نگاہ میں رہیئے
- ایسا مینار ہے بشر کی اَنا ۔۔۔ گِرد جس کے کوئی فصِیل نہیں

●

مسجدیں اُس کی، زمانے میں شِوالے اُس کے
ہر قدم ملتے ہیں کئی حوالے اُس کے

عرشؔ صہبائی ایک نیک دل انسان، دُنیاوی کاروبار، رسم و رواج اور ذات پات سے بے نیاز نہایت ہی نرم و نازک طبیعت کے مالک ہیں۔ دُنیا اور آخرت کی فکر اور اُردو زبان سے

بے پناہ محبت کی جھلک اُن کے چہرے سے صاف نظر آتی ہے۔ اُن کی پریشانی دیکھ کر میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ عمر کے اِس آخری پڑاؤ پر بھی اُن کو یہی فکر ہے کہ اُردو زبان کی کشتی بیچ بھنور میں ہچکولے کھا رہی ہے اور اُس پر متعصب فرقے اِس کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ اُردو چونکہ تعصب کا شکار ہو رہی ہے ایسے حالات میں اگر عرشؔ صہبائی جیسے شُعراء اور اُدباء نہ رہے تو کون ہوگا ایسا مخلص انسان جو اپنے خلوص کا مظاہرہ کر کے اِس کشتی کو پار لگائے گا۔

ہر ایک شخص تعصب کا ہے شکار اے عرشؔ
ہر ایک شخص کو درکار ہے اس لئے نام میرا

یہ تو اُن کا بڑا پن ہے اور یہی اُن کے مخلص ہونے کا ثبوت کہ اپنی حقیقت سے بے پرواہ ہو کر ادب کی خدمت میں مشغول ہیں اور اپنے اصلی نام سے بے نیاز ہیں:

جنابِ عرشؔ سے ہم فکر و فن کی بات کریں
یہ لوگ زندگی میں مشکلوں سے ملتے ہیں

جنابِ عرشؔ کی شاعری عشقِ حقیقی پر بھی مبنی ہے اور خُدا پرستی کو اُجاگر کرتی ہے اور میرے خیال میں یہ روحانیت، وحدانیت، انسانیت اور خُدا شناسی اُن کے اندر سرایت کر چکی ہے۔ شاعری میں جتنا اُن کا نام بلند ہے اُتنا ہی بلند اُن کا اخلاقی کردار اور خدمتِ خلق کا جذبہ ہے جسے اُن کی زندگی کے ہر قدم پر دیکھا جا سکتا ہے۔ انسانیت کے ناطے یومِ حُسینؑ کی تقریبات میں شرکت، ٹی۔ وی اور ریڈیو پہ بھی حُسینی مشاعروں اور بات چیت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا، میلاد کی محفلوں میں نعتیں پڑھنا وہ اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ اِس کے علاوہ میں بخوبی واقف ہوں کہ وہ یادِ خُدا میں وقت گزارنا، خدمتِ خلق میں، مہمانوں کی ذاتی طور پر خدمت کرنا، غریبوں، ناداروں، یتیموں مسکینوں کی حسبِ استطاعت مدد کرنا اپنا ایک فرض سمجھتے ہیں۔ عرشؔ صہبائی مُنفرد شاعر ہی نہیں بلکہ ایک بہتر انسان بھی ہیں جس کا اندازہ اُن کے کلام کے مطالعہ سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ اُن کی شاعری کے متوالے ہر جگہ موجود ہیں اور اُنہیں بلند مقام بخشے ہوئے ہیں۔ اُن کا نام اور کلام بلاشبہ دُنیائے اُردو میں زندہ وجاوید رہے گا۔

☆......ڈاکٹر شباب للت

عرشؔ صہبائی کی تخلیقی شادابی

(اسلوب کے آئینے میں)

عرشؔ صہبائی نے اپنی عمرِ عزیز کا نصف صدی سے زائد حصہ پرورشِ لوح وقلم کی نذر کیا ہے۔ غزل ان کی محبوب صنفِ سخن ہے اور اس نِگار افسوں طراز کے گیسوؤں کی مشاطگی میں وہ آج بھی وقف نظر آتے ہیں۔ 'شکستِ جام' سے 'اسلوب' کی اشاعت تک حدیثِ لب وگیسو کے کلاسیکی اور دلنواز تذکروں کے ہم دوش مسائلِ عصر وانسانیت کو سمیٹتے ہوئے انہوں نے اس کافر ساحرہ سے جی بھر کر ترسیل کا کام لیا ہے۔ اس بامقصد روحانی اور وجدانی عمل کا تسلسل وتواتر اُن کی اس دوران کی مزید شعری تصانیف 'شگفتِ گل'، 'یہ جھونپڑے یہ لوگ'، 'نایاب'، 'توازن'، 'ریزہ ریزہ وجود' اور 'اساس' میں بھی نمایاں ہے۔

عرشؔ نے ماضی کی کلاسیکی روایت کی حفاظت وپاسداری کے ساتھ جدید لفظیات وعلائم کو وسیلۂ اظہار بنا کر زندگی کی گوناگوں واردات وکیفیات، مسائل وعوامل کی دل پذیر عکاسی کی ہے۔ ان کے تازہ ترین شعری مجموعے 'اسلوب' میں ان کی داخلیت کا طائر خارجیت کے نئے افلاک کی جانب مائلِ پرواز دکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ ان کی ابتدائی شعری تخلیقات میں آپ بیتی کا عنصر غالب ہے اور جگ بیتی کا قدرے ہلکا اور اُس کا درد اور معنویت معروضی اور خالصتاً اپنی ہے

نیز اُس کے ساتھ اس کا پیرائیہ اظہار اور امیجری بھی۔ تاہم بعد کے حسی تجربے اور خود آگہی نے اُس سے درج ذیل مقبولِ عام شعر کہلوایا جو ایک اٹل صداقت کا اقرار و اعتبار بن کر قاری کی روح میں اُتر جاتا ہے۔ اور وہ شعر ہے:

وقت کی سب ستم ظریقی ہے　　　ورنہ انساں بُرا نہیں ہوتا

عرشؔ کی شاعری نے غزل کے روایتی نظم وضبط اور اس کی معتبر کلاسیکی کے رچاؤ کے ساتھ جدید ادب کی راہوں پر پیش رفت کی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے شاعری کو 'خرامِ ناز' مانا ہے تو کولرج نے اسے 'بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب' کا نام دیا۔ مولانا حسرتؔ موہانی کے مطابق ''دل میں لہریں سی اُٹھتی ہیں تو غزل بن جاتی ہے اور یہ ایک سماوی کیفیت ہے جو آورد سے پیدا نہیں ہوتی۔'' عرشؔ کی شاعری بھی اُس کی روح کی آواز ہے۔ شاعری اس کی فطرت کا تقاضا ہے نہ کہ تقلید۔

عرشؔ صہبائی نے غزل کو عامیانہ عشق کی بند گلی سے نکال کر حیات و کائنات کے کثیر پہلو مسائل کی روشن شاہراہ پر لانے کی سعی کی ہے۔ جمالیاتی اظہار اور لافانی جذبۂ عشق کی عکاسی میں اُن کا منفرد اور جدید لسانی لہجہ قاری کے ذہن میں انوکھے رنگ اور خوشبو بکھیرتا ہے۔ جب وہ چاہت کی حیات افروز وادیوں کے طلسمی ماحول کا احاطہ کرتا ہے تو اُس کے اشعار جاگتی آنکھوں کے خوش رنگ خواب بن جاتے ہیں۔ ان وادیوں کی جمالیات اس کے چند اشعار میں دیکھئے:

کسی کے قدموں کی چاپ جیسے حسین موسم کی آہٹیں سی
ہواؤں میں مستیاں سی رقصاں، فضاؤں میں گنگناہٹیں سی
حیات کی رہگزر پہ جیسے چراغ جلتے ہیں آرزو کے
وہ مست آنکھوں میں نغمگی سی، وہ زیرِ لب مسکراہٹیں سی

☆

● نور و نکہت کی کوئی موجِ رواں گزری ہے　　　وہ اچٹتی سی نظر رنگ فشاں گزری ہے

●

عرشؔ ان کی جھیل سی آنکھوں کا اس میں کیا قصور
ڈوبنے والوں کو گہرائی کا اندازہ نہ تھا

شاعرازل سے حسن پرست ہے، محبت اور محبت کرنے والوں کا ہم نوا ہے۔ محبت اور صنفِ مخالف کی کشش اور اس مقدس جذبے کی تسکین انسان کی جبلت کا جزو ہے اور اس کا شائستہ و بے باکانہ اظہار بھی شاعرانہ زبان اور لہجے کا متقاضی ہے۔ اس خلوصِ محبت کو عرشؔ یوں اشعار کا جامہ پہناتے ہیں:

- دل و نگاہ میں ایسے اتارتا ہے مجھے — وہ اپنے نام سے اکثر پکارتا ہے مجھے
- ان کی نظروں میں سربسر اقرار — ان کے ہونٹوں پہ اک بہانا سا
- مجھے خلوص سے بڑھ کر نہیں ہے کچھ درکار — میں بک رہا ہوں، مری زندگی کا سودا کر
- بکھرتی جارہی ہے اُس نگاہِ ناز کی مستی — گزرتے جارہے ہیں زندگی کے بہترین لمحے
- تو بڑے شوق سے ہم کو نظر انداز کرے — ہم ترے ساتھ رہیں گے، تیرا سایا بن کر
- عرشؔ اُس چشمِ فسوں ساز سے یہ کون کہے — لڑکھڑا جاؤں گا محفل میں، سنبھالو مجھ کو

وہ زمانہ اب کہاں رہا جب شاعری ایک فیشن تھی اور شاعر معاشرے کے ایک فعال فرد کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں سے خود کو مبرّا سمجھتا تھا۔ دورِ حاضر کی غزل اپنے عہد کی آواز ہے اور زندگی کے نشیب وفراز کی منظر کشی۔ نیا ادب معاشرتی تغیّرات اور عہد بہ عہد بدلتے تہذیبی، اخلاقی، سماجی مسائل، تجربات ومشاہدات کی عکاسی کا مقدس فریضہ ادا کرنے کا داعی ہے۔

عرشؔ بھی شاعری کا مقصد صرف نشاط آفرینی اور تلذذِ عشق کے سرور و مستی کے لمحوں کا بیان نہیں مانتے۔ اُن کی غزل میں قدیم وجدید کے امتزاج اور موضوعات کے پھیلاؤ سے جو نقوش اُبھرتے ہیں وہ عصری صداقتوں اور اس دورِ جمہور کی بوالعجبیوں، ناہمواریوں اور ناانصافیوں کے ترجمان ہیں۔ یہ دورِ جمہور جس میں عام انسان مختار نہیں بلکہ نئی زنجیروں میں قید ہے۔ اُس کے سامنے صرف یہ راستہ کھلا ہے کہ وہ دو غلط کار افراد میں سے ایک کم ضرر رساں اور کم مکار کو اپنا نمائندہ چُن کر اپنا مستقبل آنکھیں بند کر کے اُس کے ہاتھوں میں گروی رکھ دے جو

صرف اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کو ہی اپنا لائحہ عمل سمجھتے ہیں نہ کہ عوام کی ہمدردی، دستگیری اور چارہ سازی کو۔ گویا اُس نام نہاد رہنما کو لوٹ کھسوٹ کا اجازت نامہ برضا و رغبت دے دے۔ اس بے بسی اور عدم تحفظ کا اظہار کرتے ہوئے عرشؔ آپ بیتی سے جگ بیتی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس اجتماعی درد کی تصویریں ان چند اشعار میں ملاحظہ کیجئے:

- انقلاب کیا ہوگا اس سے بڑھ کے دُنیا میں | کارواں کا رہزن ہی میرِ کارواں ٹھہرا
- کون سی یہ وادی ہے، کونسی یہ بستی ہے | آرزو ہے یخ بستہ، دل دھواں دھواں ٹھہرا
- بے طرح جن سے اُلجھ کر رہ گئی ہے زندگی | ایسے پیچیدہ مسائل تو کبھی پیدا نہ تھے
- میرے اس حالِ پریشاں کی خبر کسی کو نہیں | سب پہ ظاہر ہے حقیقت یہ مسیحا کے سوا

اس نفسا نفسی اور لوٹ کھسوٹ کے عالم میں کوئی نئی سوچ یا اصلاح و تغیر کی تلقین و تجویز اگر سامنے آتی بھی ہے تو اربابِ قضا و قدر کو وہ راس نہیں آتی۔ لہٰذا شاعر یہ کہنے پر مجبور ہے:

- اتنا بیدار کہاں اہلِ زمانہ کا شعور | ہر نئی سوچ ابھی راہ کی دیوار سہی

اگر کہیں کوئی نعرۂ حق بلند ہوتا ہے تو جبر و ظلم اور استحصال کی قوتیں اُسے دبا دیتی ہیں۔ بقولِ عرشؔ:

- اس دور میں کوئی بھی نہ سمجھے گا مجھے عرشؔ | میں حق کا پجاری ہوں، محبت کی زباں ہوں
- یہ چاہتا ہے کہ اس دور پر کروں تنقید | وہ شخص قبر میں زندہ اُتارتا ہے مجھے
- خاموش رہیں گے تو ضمیر اپنا گھٹے گا | حق بات پہ سنگین سزائیں بھی ملیں گی
- حق پرستیوں نے بھی کیا صلہ دیا مجھ کو | سنگِ میل تھا لیکن گردِ کارواں ٹھہرا
- میری زباں بھی بند ہو، شورشِ حق بھی ختم ہو | اس کا یہی علاج ہے مجھ کو سپردِ دار کر

اور کچھ ایسا ہی حال معاشرے کا ہے۔ بے حسی، مصلحت کوشی، فریب کاری اور محسن کشی کے اس دَور میں شاعر کا خلوصِ باطن ہی اُس کا دشمن بن جاتا ہے۔ عرشؔ نے بھی اس سلسلے میں بہت سے تلخ حقائق کا زہر چکھا ہے۔ عدمؔ نے کہا تھا:

عدمِ خلوص کے بندوں میں ایک خامی ہے
ستم ظریف بڑے جلد باز ہوتے ہیں

عرشؔ کے خلوصِ وفا سے فیض یاب ہونے والوں میں سے بعض نے انہیں ناقابل فراموش چرکے دیئے ہیں۔ وہ کس طنزیہ انداز میں ان زخموں کی نمائش کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

- دُور کردے گا زمانے سے مجھے میرا خلوص — مجھ کو اپنی اس صلاحیت کا اندازہ نہ تھا
- میں سمجھتا تھا کہ اخلاص و وفا ہیں معتبر — لیکن اپنی بات پر ہے اب پشیمانی مجھے
- محلوں میں کیا ملے گا وفا کا سراغ عرشؔ — یہ چیز جھونپڑوں کی ہے اُن میں تلاش کر

شاعر جہاں خلوص کش اور وفا ناشناس لوگوں کے لئے آئینہ بدست ہونے پر مجبور ہے، وہاں ایسے میں وہ سلوکِ اہل دنیا سے بدظن اور شکستہ دل ہوکر جستجوئے ذات و کائنات کی طرف مراجعت کرتا ہے۔ فلسفۂ حیات اور عرفانِ ذات جو ہر مذہب کی مقدس کتابوں سے پکار رہا ہے، عرشؔ کو بھی اپنی طرف راغب کرتا ہے۔ اپنے اسلوب اور لہجے کی تازگی سے وہ اس قدیم موضوع کو بھی ایک نیا نکھار بخشتے ہیں۔ یہ اشعار دیکھئے:

- رازِ پنہاں کی جستجو ہے مگر — آدمی ہے بذاتِ خود اک راز
- ظاہر اُتھے اِک حقیقت اصل میں افسانہ تھے — ہم اِک ایسا راز تھے جو خود پہ بھی افشا نہ تھے

لیکن انسان جستجوئے ذات کی بجائے حصارِ ذات میں مقید ہو جاتا ہے۔ خواہشات اس تلاش میں سدِ رّہ بن جاتی ہیں یا دین و مذہب کی بندشیں اور تقاضے اس راہ میں حائل ہو جاتے ہیں۔ عرشؔ فرماتے ہیں:

- ہم نکل سکتے بھی تو کیونکر حصارِ ذات سے — صرف دیواریں ہی دیواریں تھیں دروازہ نہ تھا
- درہم و برہم نہ ہو جائے کہیں دل کا سکوں — خواہشوں کی کھڑکیوں سے جھانک کر باہر نہ دیکھ
- مجھے کعبہ و دیر سے لے چلو — بڑا شور ان کارخانوں میں ہے
- اس کے ہر منظر پہ مٹ جا اس کا پس منظر نہ دیکھ
  زندگی اِک خول ہے اس خول کے اندر نہ دیکھ

اور زندگی بھی کتنی دیر ساتھ دیتی ہے، آخر اس کا انجام کیا ہے۔ سلسلۂ وجود و عدم اور اس میں پوشیدہ معرفت کے اسرار و رموز، بھولی بسری عرفانی اور ثقافتی قدروں کی دریافت و بازیافت کا فلسفیانہ شعور ہمیں عصری و ابدی صداقتوں کے مفاہیم کے روبرو کرتا ہے۔ ہندو فلاسفی اور بھگوت گیتا کے شلوکوں میں منکشف کئے گئے رموز و نکات، اصولِ تناسخ اور روح کے سلسلۂ آمد و شد کی جھلک بھی عرشؔ کے اشعار میں دیکھی جاسکتی ہے۔ فرماتے ہیں:

- کس گھاٹ اترتا ہے مجھے یہ نہیں معلوم — کاغذ کی ہوں اک ناؤ سمندر میں رواں ہوں
- خود کو پہچان نہ پائیں گے یہ صورت ہوگی — خشک پتّوں کی طرح ہم کو بکھر جانا ہے
- پھول سے خوشبو کی صورت ہم جدا ہو جائیں گے — یہ بہاریں یہ چمن آرائیاں رہ جائیں گی

جس قدر اس حساس شاعر کو عمرِ رواں کی بے ثباتی اور کم مائیگی کا شدید اور حقیقی احساس ہے اتنا ہی وہ زندگی کے جذب و کشش اور افادیت و عظمت کے طلسم میں اسیر ہے۔ وہ زندگی کا قدر داں ہے اور اسے عطیۂ الٰہی کا درجہ دیتا ہے۔ عرشؔ بڑے صدق و وثوق سے اعتراف کرتے ہیں:

- زندگی تُو عمر بھر برہم رہی لیکن تجھے — جس طرح چاہا ہے ہم نے، اس طرح چاہے گا کون

عرشؔ کہیں کہیں دنیاداری کے سلسلے میں رشد و ہدایت سے بھی کام لیتے ہیں۔ انسان کی بنیادی ضرورتیں جن پر انفاس کی آمد و شد کا سلسلہ قائم ہے ان سے بھی شاعر صرفِ نظر نہیں کر سکتا ان کا کہنا ہے:

- نہ زر میں ملے گا نہ صہبا میں عرشؔ — وہ نشہ جو گندم کے دانوں میں ہے

تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں ان کا یہ مشورہ بھی قابلِ قبول و احترام ہے کہ:

- کیا ضروری ہے کہ یہ دُکھ بانٹنے والے بھی ہوں — ملنے والوں سے کبھی ذکرِ پریشانی نہ کر
- وقت کے بگڑے ہوئے اطوار کا انداز دیکھ — زندگی میں ہر قدم پر اپنی من مانی نہ کر

ناقدریٔ فن کا ایک چبھتا ہوا احساس ہر جینوئن شاعر کو کچوکتا ہے بالخصوص آج کل کے اس مادیت پرست، ٹیلی ویژن زدہ ماحول میں جہاں ایک طرف تو بازارِ فن میں کھوٹے سکوں کا چلن ہے اور دوسری طرف ہمارے میڈیا کی یلغار نے بے تکی، اوٹ پٹانگ، بے وزن، بے بحر و

عروض شاعری کو سنجیدہ شاعری کے مسند پر جلوہ افروز کر دیا ہے اور سامعین و ناظرین کے ذوقِ صالح کو پستی کی جانب دھکیلا جارہا ہے۔ جینوئن شاعری پر عجب وقت آپڑا ہے۔ اس صورتِ حال سے برگشتہ خاطر ہو کر عرشؔ کو بھی کہنا پڑا ہے:

- دل کا لہو نچوڑ نہ فن کی تلاش کر اس بے شعور دور میں فکرِ معاش کر
- ناحق بھٹک رہا ہے کسی کے خیال میں اس ضد کو چھوڑ اور خود اپنی تلاش کر

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بفضل ربی ملک بھر میں پھیلے ہوئے عرشؔ کے حلقۂ احباب میں اس کی بلند پایہ شاعری کے مداحوں اور چاہنے والوں کی کثیر تعداد ان کے ادبی مقام کو تسلیم کرتی ہے۔ جموں کشمیر میں عرشؔ صہبائی بذاتِ خود ایک انجمن ہیں جہاں ان کی شخصیت اور فن کے شیفتگان اور جاں نثار مقلدوں کی کمی نہیں کیونکہ ان کی شاعری زندہ و تابناک ادب کا آئینہ ہے۔ خود ان کے الفاظ میں:

عرشؔ جو درد میں ڈوبے ہوئے دل سے نکلے
چند شعلے بھی لپکتے ہیں اس آواز کے ساتھ

اور ان شعلوں کی نرم آنچ اور تپش ان کے چاہنے والوں کو ایک انوکھی تسکین بخش حرارت اور تحریک عطا کر رہی ہے۔

☆......مہندر پرتاب چاند

عہدِ نو کا پیمبر

'نایاب' عرشؔ صہبائی کا آٹھواں مجموعۂ کلام ہے۔ اس سے قبل وہ شکستِ جام، شگفتِ گُل، صلیب، اسلوب، یہ جھونپڑے یہ لوگ، ریزہ ریزہ وجود اور اساس جیسے قابل قدر شعری مجموعوں کے علاوہ 'انجم کدہ' اور 'یہ جانے پہچانے لوگ' کے ناموں سے ممتاز شعرا کے دو تذکرے بھی مرتب کر چکے ہیں۔ یوں تو عرشؔ صاحب کا تعلق خطۂ جموں وکشمیر سے ہے، لیکن اپنی پختگی کلام اور عظمتِ فن کے طفیل وہ ملک بھر میں ایک معروف ومعتبر شاعر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔

عرشؔ صاحب نے مختلف اصنافِ شاعری میں کامیاب طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن غزل ان کی محبوب صنف سخن ہے اور جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں یہ گویا الہام کی صورت ان پر نازل ہوتی ہے۔ پچھلے لگ بھگ ایک ڈیڑھ سال سے وہ بہت عمدہ دوہے بھی لکھ رہے ہیں۔ زیر نظر مجموعے میں ان کی ۶۷ غزلیں، ۱۲ دوہے اور ایک نظم ''تم اپنا خون دان دو'' شامل ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہیں ہوگا کہ انہوں نے اردو غزل کو نئی زمینیں ہی نہیں دیں بلکہ نئے رنگ وآہنگ کے اشعار بھی دیئے ہیں۔

'نایاب' کی غزلیات مختلف کیفیات کی حامل ہیں اور بیشتر اشعار میں شاعر کی اپنی ذات اور خصائل کی جھلک بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ عرشؔ ایک صاف دل اور صاف گو انسان ہیں۔ ایک اچھا شاعر حق گو اور حق پرست نہیں ہو تو یہ سونے پہ سہاگہ ہے اور یہ وصف اس کی شعری وفنی

تخلیقات کو نادر جلا بخشتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

فریب و مکر کی دنیا سے دور رہتا ہوں
یہی ہے میری عبادت، یہی ہے میری نماز
جب جب بھی غلط کو ہے کہا ہم نے غلط عرشؔ
ایسے میں ہم اپنے ہی ہم آواز رہے ہیں
یہ میرا تجربہ ہے عرشؔ اس میں ہے یقیں میرا
کہ دل ہو صاف جس کا ذہن بھی زرخیز ہوتا ہے

لیکن حق بات کہنے سے رسوائی اور کچھ غلط فہمیوں کے پنپنے کا خدشہ بھی رہتا ہے اور بارہا کچھ تنگ نظر احباب بدظن بھی ہو جاتے ہیں:

یہ حق گوئی کی عادت خوب لیکن
بہت دنیا میں رسوائی بھی ہوگی
اے عرشؔ! زندگی میں ہو جس کا کوئی اصول
وہ شخص ہر نظر میں کھٹکتا ضرور ہے
آج حق گوئی کا صلہ یہ ہے
سنگ ساری کبھی ہے، دار کبھی
مستحق اس لئے ہر ایک سزا کے ٹھہرے
ہم غلط بات کی کرتے کبھی تائید نہیں
ہر ایک چاہتا ہے اس کو سنگ سار کرے
وہ عہدِ نو کا پیمبر دکھائی دیتا ہے

ایک حساس انسان کی انا اور خودداری کا جذبہ بے حد شدید ہوتا ہے اور ایک فنکار کی انا تو شدید تر ہوتی ہے اور اسے بے حد عزیز بھی ہوتی ہے اور یہ ایک مثبت جذبہ ہے۔ بہ شرط یہ کہ یہ تکبر اور بد دماغی کی حدوں تک نہ پہنچے۔ دیکھئے عرشؔ صاحب اس جذبے کو کس لطیف پیرائے میں بیان

کرتے ہیں:

لغزشیں اور بھی سرزد ہوئیں مجھ سے اسے عرشؔ!
یہ خطا بھی ہے کبھی جھک نہ سکا سر میرا

لیکن ان کے حلم و عجز کی بلندی اور اعترافِ خطا کا یہ رنگ بھی ملاحظہ فرمائیے:

میرے اشعار میں سو خامیاں ہوں گی اے عرشؔ!
میں بھی انسان ہوں، انساں سے خطا ہوتی ہے

عرشؔ صاحب غم پرست نہیں لیکن الم نواز ضرور ہیں اور یہ احساس ان کے دردمند دل کا آئینہ دار ہے:

راحتیں زندگی کی جن پہ نچھاور ہیں عرشؔ!
ہم نے دیکھا ہے کہ کچھ ایسے بھی غم ملتے ہیں
بند کرلوں دل کے دروازے کو، دستک دے جو غم
پھر خیال آتا ہے کوئی دربہ در کب تک رہے

یاس وتنہائی کے عالم میں کبھی کبھی ان کے ذہن میں کسی ہمدرد کے ہونے کے احساس کی تمنا بھی جاگ اٹھتی ہے۔

یہ احساس ہو میرا ہے ہمدرد کوئی
کاش مجھے مل جائے ایسا فرد کوئی

تاہم عرشؔ صاحب اسی تنہائی یا آفتوں کے ایک ہجوم میں ہی انجمن آرائی کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

ہم سفر ہے آفتوں کا اک ہجوم
زندگی میں میں کبھی تنہا نہیں
کبھی ہے انجمن آرائیوں میں رنگِ تنہائی
کبھی تنہائی میں ہیں انجمن آرائیاں کتنی

ایک حقیقی شاعر اپنے عہد اور معاشرے کا ترجمان ہوتا ہے۔ لہٰذا عرشؔ صہبائی کے کلام

میں بھی جا بہ جا عصری صورت حالات کی عکاسی اور اس پر ایک لطیف طنز کا عنصر متاثر اور متوجہ کرتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

یہی جمہوریت اپنی یہی انداز اس کا
کس کو ملتی ہے سزا کس کی خطا ہوتی ہے
کوئی تقریب ہو شعر و ادب سے لاکھ وابستہ
مگر اس پر سیاست کا دھواں سا پھیل جاتا ہے
نہیں ہے آج کوئی چیز اپنے مرکز پر
نظام زندگی کا ڈگمگانے والا ہے
بدتریں وقت ہے یہ پھر بھی غنیمت جانو
اس سے بہتر کسی ماحول کی امید نہیں

عرشؔ صالح اور مثبت اخلاقی روایات کے پرستار ہیں اور پرانی قدروں کو بے حد عزیز رکھتے ہیں جو آہستہ آہستہ پامال بھی ہو رہی ہیں اور مفقود بھی:

وقارِ زندگی تھا عرشؔ جن سے
وہ قدریں ڈھونڈ لانا چاہتا ہوں
کہاں ہیں آج وہ پہلی سی قدریں
چمن یہ سر بہ سر صحرا ہوا ہے
وہ قدریں جو ہیں پستیِ اخلاق کا باعث
حیرت ہے کہ دنیا انہیں اپنا سی رہی ہے

عرشؔ جہاں ایک طرف محبت اور بھائی چارے کے علمبردار ہیں وہاں انسانی زندگی کے مصائب اور رنج و محن کے آگے سینہ سپر ہو کر ہمت و استقلال سے ان کا سامنا کرنے کی تلقین بھی کرتے ہیں:

- محبت سے ادا ہوتے ہیں جو بھی وہ دو جملے دلوں کو جوڑتے ہیں

- سفینہ پار اترے گا یقیناً ‏ ‏ یہ دھارے کس لئے سر پھوڑتے ہیں
- مصائب سے الجھ کر عرشؔ اکثر ‏ ‏ غرورِ زندگی ہم توڑتے ہیں
- یوں ہو طوفاں سے ہم کنار کبھی ‏ ‏ ناؤ گرداب میں اتار کبھی
- مزا کچھ اور ہوتا ہے وہاں کشتی کو کھینے کا ‏ ‏ جہاں دریا کے پانی کا بہاؤ تیز ہوتا ہے
- حادثوں کو نہیں توفیق اسے روک سکیں ‏ ‏ دل کے جذبات کا دریا ہے، رواں رہتا ہے
- گو بہر گام حوادث سے ہیں ہم الجھے ہوئے ‏ ‏ پھر بھی ہم میں ابھی جینے کا ہنر باقی ہے

عرشؔ صاحب کی اولوالعزمی اور روشن خیالی کا یہ عالم ہے کہ زندگی کے گونا گوں حادثات کو وہ اپنی پذیرائی کے مترادف گردانتے ہیں، جو اُن کی قوت پرواز کو توانائی بخشتی ہے۔

ہر قدم پر حادثے تھے خیر مقدم کے لئے
زندگی میں کس جگہ میری پذیرائی نہ تھی!
دل شکن کتنے ہی ہوں بے شک خلا کے مرحلے
عزم سے بڑھتی ہے لیکن قوتِ پرواز اور

ایک ہنرمند فن کار کی مقبولیت ہمیشہ اس کے حاسدوں اور بدخواہوں کو تنقید و تحقیر کی دعوت دیتی ہے، لیکن عرشؔ صاحب کی اعلیٰ ظرفی دیکھئے کہ وہ ان سے بدظن ہونے کے بجائے ان کے تئیں ممنونیت کا اظہار کرتے ہیں اور انہیں اپنا ہمدرد گردانتے ہیں:

- میں عرشؔ! ان کا بھی ممنونِ کرم ہوں ‏ ‏ جو دشمن بن گئے بے بات میرے
- عرشؔ! اڑاتا رہتا ہے جو میرا مذاق ‏ ‏ ظاہر ہے ہوگا میرا ہمدرد کوئی

☆☆☆

☆......ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا

عرشؔ صہبائی کا فکری سیلِ رواں

اُردو شاعری جب متقید مین و متوسطین شعراء حضرات کے ادوار سے گزرتی اور مختلف اصناف کی شکل اختیار کرتی ہوئی متاخرین کے عہد یعنی اُنیسویں صدی میں پہنچی تو اس کی چھٹی دہائی کے نصف میں ایک بڑا سیاسی انقلاب رونما ہوا، جسے ۱۸۵۷ء کا انقلاب کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے دہلی اُجڑی، شعرا حضرات نے مختلف مقامات کی طرف ہجرت کی۔ شمالی ہند میں شاعری کے تین بڑے دبستان قائم ہوئے، دہلی، لکھنو اور پنجاب کا مشہور شہر لاہور۔ اِن شہروں میں مختلف اُساتذہ کے شاعری کے اسکول بھی قائم ہوئے۔ انہی اسکولوں میں سے داغؔ اسکول کافی مشہور تھا۔ اقبالؔ بھی تھوڑی مدّت کے لئے داغؔ کے شاگردوں میں شامل رہے۔

پنجاب کے معروف شاعر جوشؔ ملسیانی کا تعلق بھی داغؔ اسکول سے تھا۔ جوشؔ صاحب کے شاگردوں میں ایک معتبر نام عرشؔ صہبائی صاحب کا بھی نظر آتا ہے۔ انہوں نے مختصر سی مدّت کے لئے جوشؔ صاحب کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ عرشؔ صاحب آمد کے شاعر تھے آورد کے نہیں۔ لہٰذا اُستاد کی قابل قدر نگاہوں نے انہیں جلد ہی فارغ الاصلاح قرار دے دیا۔

عرشؔ صاحب پُرانی تہذیب اور پُرانی قدروں کے ماننے والے ہیں۔ اس لئے ہمیں لگتا ہے کہ اُستادی شاگردی کی رسم کو نبھانے کے لئے انہوں نے جوشؔ صاحب کے سامنے

زانوئے ادب تہہ کیا تا کہ کل کا نقاد انہیں بے اُستاد نہ کہے۔

پُرانی روایات کو قائم رکھنے کی خاطر غالبؔ جیسے شاعر کو بھی عبدالصمد نام کا ایک فرضی اُستاد بنانا پڑا تھا۔ اصل میں عرشؔ صاحب کے اُستادِ اوّل مولوی شیخ عبداللہ ہیں جنھوں نے راکھ میں دبی ہوئی ایک چنگاری کو ہوا دے کر شعلہ سا بھڑکا دیا، جس کی تاب جلد ہی ادب نواز حضرات کے دِلوں کو گرمانے لگی۔

عرشؔ صہبائی کا نام اسم بامسمّٰی ہے۔ شاید کسی نے بھی اس طرف غور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ عرشؔ عربی لفظ ہے اور مذکر استعمال ہوتا ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں تخت، آسمان، آٹھواں آسمان۔ سات آسمانوں کا ذکر اکثر سُننے میں آتا ہے لیکن آٹھویں آسمان کا ذکر شاید ہی کسی نے سُنا ہو۔ (سائنسی نتائج کا یہاں ذکر نہیں ہم ادبی دائرے ہی میں محدود رہنا چاہتے ہیں۔)

لگے ہاتھوں ہم ان کے نام کے دوسرے حصے کو بھی لغوی صورت میں آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ''صہبا'' کا مطلب ہے لال شراب۔ عربی ہے، اسم ہے اور مونث استعمال ہوتا ہے۔ ''صہبا'' کے ساتھ ہمزہ و یائے معروف لگانے سے پورا لفظ صِفت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے جب آتش سیال کے دو گھونٹ انسانی جسم کے اندر پہنچنے کے بعد رگ رگ میں صراحت کرنے لگتے ہیں تو دماغ خود بہ خود آٹھویں آسمان پر پہنچ جاتا ہے۔ آغاز شاعری میں عرشؔ کو یہ موقعے نصیب نہیں ہوئے البتہ بعد کے زمانے کی بات اس سے الگ ہے۔ اُس وقت عرشؔ گرو نانک صاحب کی اِس بانی پر ضرور عمل کرتے رہے ہوں گے ''نام خماری نانکا تے چڑھی رہے دِن رات۔''

اُردو شعرا کی تاریخ اور اِن کے شجرۂ نسب پہ اگر غور سے نظر ڈالی جائے تو آپ کو ایسے کتنے حضرات نظر آئیں گے جنہیں گھر کے اندر یا گرد و نواح میں ادبی ماحول ملا ہے۔ مگر خداداد صلاحیت جب ان کے اندر عود کر آئی تو یہ لوگ شاعری کے اُفق پر درخشندہ ستاروں کی طرح چمکے اور رہتی دُنیا تک چمکتے رہیں گے۔ آنے والی نسلیں اِن کی شعاعوں سے منوّر ہوتی رہیں گی۔ یہی صورتِ حال عرشؔ صہبائی کی ہے۔ آپ جموں کے ایک دور افتادہ ادبی لحاظ سے بنجر علاقے کی

پیداوار ہیں۔ وطن کی تقسیم انہیں جموں شہر لے آئی۔ یہ شہر ادبی مشاعروں کے لئے کافی مشہور رہا ہے۔ پنجاب کے معروف شعرا کو اکثر اور شمالی ہند کے نامور حضرات کو گاہے گاہے یہاں کے مشاعروں میں شرکت کی دعوت دی جاتی تھی۔ سامعین کی ایک بھیڑ انہیں سُننے کے لئے اُمڈ پڑتی تھی۔ عرشؔ بھی اس بھیڑ میں شامل ہوا کرتے تھے۔ ہر شاعر کی آواز ان کے جذبات کو مشتعل کرتی رہتی تھی۔ گھر لوٹتے تو بے چین رہتے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ یہ کاغذ قلم لے کر بیٹھتے تو اشعار کی آمد شروع ہو جاتی اور وہ صفحۂ قرطاس پر پھیلتے چلے جاتے۔ اِن کا کلام ریاست سے باہر اخبارات و رسائل میں شائع ہونے لگا۔ دھیرے دھیرے یہ مقامی مشاعروں میں حصہ لینے لگے اور اِن کی ایک پہچان بنتی چلی گئی۔ کبھی کبھار ریڈیو کشمیر جموں کے مشاعروں میں بھی انہیں دعوت دی جانے لگی۔ اب اِن کے قدم اُس منزل کی طرف بڑھنا شروع ہوئے جس کا کبھی انہوں نے خواب دیکھا تھا۔

خالقِ کائنات ہر کسی کو رزق و رُتبہ عطا کرتا ہے اور ایسے ذرایعے پیدا کر دیتا ہے جو اُس کی شہرت و ناموری میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ۱۹۵۴ء میں اکثر ان کی شمولیت ریڈیو کشمیر جموں کے مشاعروں میں ہونے لگی۔ ان کا کلام اب ریڈیائی لہروں پر سوار ہو کر برصغیر ہند و پاک کی سرحدوں کو پار کرتا ہوا دور دراز ممالک میں سُنا جانے لگا، جہاں جہاں اُردو جاننے والے حضرات موجود ہیں۔

اسی طرح کے ایک ریڈیو مشاعرے میں اِن کے ملاقات لسان الاعجاز، پنڈت میلا رام وفاؔ سے ہوئی۔ یہ اپنے وقت کے کہنہ مشق اور اُستاد شاعر کہلاتے تھے۔ عرشؔ ان کی سادگی پسند طبیعت اور قابلیت سے اتنے متاثر ہوئے کہ اِن کے معتقدین میں شامل ہو گئے۔ فروری ۲۰۱۱ء میں ایک ملاقات کے دوران عرشؔ نے وفاؔ سے متعلق جو کچھ فرمایا اِس سے اِن کی بے باکی، صاف گوئی، انسان و انسانیت کی پہچان کی داد دینی پڑتی ہے، ملاحظہ فرمائیں ان کی گفتگو:

"میں شاگرد تو جوشؔ ملسیانی صاحب کا ہوں لیکن بعض معاملات میں یہ (وفاؔ) جوشؔ سے بڑھ کر تھے۔ اِن کے کلام اور حسنِ اسلوب کا مقابلہ نہیں

کیا جاسکتا۔ الفاظ پر ان کی گرفت نہایت سخت تھی۔ زبان دانی میں آج تک میری نظر سے کوئی ایسا اُستاد نہیں گزرا جو اِن کا مقابلہ کر سکے۔ جوشؔ کو شاگردوں کی فوج جمع کرنے کا شوق تھا۔ وہ ہر جگہ اپنے ذرائع پیدا کر لیتے تھے۔ مگر قبلہ وفاؔ صاحب اِس فن سے نا آشنا اور لالچ سے کوسوں دور تھے۔ جب کبھی آل انڈیا ریڈیو جموں کی طرف سے مشاعرے کا اہتمام ہوتا تو میری درخواست پر ان کی شمولیت لازمی ہوتی۔ مجھے بارہا اِن کی میزبانی کے فرائض ادا کرنے کا شرف نصیب ہوا۔ لیکن کبھی اِس بات کا احساس نہیں ہوا کہ وفاؔ میرے مہمان ہیں۔ یہ اِن کی عظمت تھی۔ چلتے وقت انہیں معاوضے کی جو رقم دی جاتی تو اِسے لینے سے انکار کر دیتے۔ اصرار کرنے پر انہوں نے اگر قبول بھی کی تو فرماتے کم سے کم مجھے دیا کرو۔ وہ شرافت و سادگی کی مکمل تصویر تھے۔ ایسے لوگ صدیوں میں کہیں پیدا ہوتے ہیں۔"[1]

عرشؔ نے وفاؔ کے کلام، حُسن اسلوب، الفاظ پر اِن کی سخت گرفت، زبان دانی، اُستادانہ جوہر اور سادگی و شرافت کا جس انداز سے ذکر کیا ہے، اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہی خوبیاں اب عرشؔ میں ودیعت کر آئی ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انہوں نے ایسے بزرگوں کی صحبت سے فیض حاصل کیا ہے۔ آپ نے یہ بات تو سُنی ہی ہوگی، "اُستاد بیٹھے پاس، کام آئے راس"۔ یعنی اُستاد کے پاس بیٹھنے سے کام دُرست ہوتا ہے۔ یا اُستاد کے پاس بیٹھنے والا کامیاب ہوتا ہے۔ عرشؔ نے اِس مثل پر عمل کیا تبھی تو آج وہ اس بلند مقام پر ہیں۔

آپ میں سے اگر کوئی صاحب ہندوستان کے آخری چھور کنیا کماری تک گیا ہو تو اُس نے وہ مقام ضرور دیکھا ہوگا جہاں بحرہ ہند و بحرِ عرب کے پانیوں کا میلان ہوتا ہے۔ اُس مقام کو اُوپری سطح پر کوئی زیادہ ہل چل دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن ان کی عمیق گہرائیوں میں جو تلاطم ہوتا رہتا ہے وہ نظر نہیں آتا۔ یہی صورت عرشؔ کی ظاہری و باطنی شخصیت کی ہے۔ مثلاً

---

[1] پنڈت میلا رام وفا: حیات و خدمات، از راقم الحروف، سال اشاعت مئی ۲۰۱۱ء انیس پرنٹرس، نئی دہلی۔ ص: ۴۱۰

● تلاطم پر نہ کوئی حرف آئے — میں خود تنکے کی صورت بہہ گیا ہوں

● میں بحرِ زندگی میں بہہ گیا ہوں — مصائب میں اُلجھ کر رہ گیا ہوں

● عرشؔ میرا ہم سفر تھا حادثوں کا اک ہجوم — زندگی میں، میں کسی بھی حال میں تنہا نہ تھا

● تمام عمر اُلجھتی رہی تلاطم سے — بھنور کی زد میں رہی کشتیٔ حیات میری

عرشؔ ایک کرم یوگی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہی اِن کا مقصدِ حیات ہے۔ کام ہی عبادت ہے۔ اِسی اصول کی پابندی کرتے ہوئے انہوں نے اپنے قلم کی سیاہی کو خشک نہیں ہونے دیا۔

● اگر میں خدمتِ شعر و سخن میں محو ہوں عرشؔ — مرے لئے یہ عبادت ہے کاروبار نہیں

● نہ پھر بھی فکرِ سخن ترک کر سکا میں عرشؔ — اگرچہ فکرِ سخن میں دل و دماغ جلے

● بدل دیں کسی پَل بھی نظم جہاں — کرشمہ یہ ہم سے فقیروں میں ہے

● جہاں میں اور بھی شدّت کے ساتھ اُبھروں گا
یہ بات یاد رہے آنے والا کل ہوں میں

● ہزار مُشکلیں آئیں، ہزار غم ٹوٹیں — رہِ حیات میں ہر وقت تازہ دَم ہوں میں

● یہ ذہن رَفتہ پگھلتا ضرور ہے — تخلیق کا الاؤ سا جلتا ضرور ہے

شاعری کی سب سے اہم صِنف غزل ہے۔ اس کا کینواس اتنا وسیع ہے کہ کائنات کا ہر موضوع اس کے ایک شعر میں سما سکتا ہے۔ شاعری کی دوسری اصناف کے لئے چوکھٹے یعنی فریم مقرر ہیں۔ شاعر اِن حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا، مثلاً: قصیدہ، مرثیہ، رباعی، دوہا یا نظم۔ کسی نقاد نے غزل کو شاعری کی ''وحشی صنف'' اور کسی نے اسے شاعری کی ''آبرو'' کہا ہے۔ اکثر شعرا حضرات کے کلام کی شروعات غزل کے اشعار سے ہوتی ہے۔ عرشؔ کے کلام کا آغاز بھی غزلیہ اشعار سے ہوا۔ زندگی کی ۸۸ بہاریں دیکھ چکے ہیں اب بھی وہ اسی کے گیسو سنوار رہے ہیں۔

عرشؔ کے فن کا کمال دیکھیئے کہ محبوب کی معصومیت اور سادگی کو کس بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ محبوب کی قربت اور اُس کی یاد کی کسک کا اندازِ بیان دیکھیے۔

● اُس کی قربت میں جو گزرے مختصر لمحات عرشؔ
یاد اُن کی اَب بھی دِل میں ضوفشاں ہے دور تک

● اُن کی معصومیت پہ ہم قرباں	خواب آنکھوں میں جو پلے ہوں گے

محبوب کے حُسن و جمال کو احترام کے ساتھ پیش کیا ہے ملاحظہ فرمائیں:

● جُدا ہیں سب سے زمانے میں خدوخال اُس کے	نہیں نمایاں کوئی اور شاہکار اِتنا

اک حسین پیکر کا لمس کِسی کی زندگی بدل دیتا ہے

● وہ جس پہ جھوم سی جاتی ہے زندگی اے عرشؔ	کسی کا لمس بھی ایک جل ترنگ ہوتا ہے

جب محبوب کی تصویر دِل و دماغ سے ہوتی ہوئی روح میں اُتر جاتی ہے تو اُسے بھولنا مشکل ہو جاتا ہے۔

غزل کے صدیوں تک دو عنوان رہے، حُسن و جمال اور مے و مینا۔ ابتدائی دور شاعری سے اب تک شعرا حضرات کے دیوان اِن موضوعات سے بھرے پڑے ہیں۔ مگر ہر شاعر کے اندازِ بیان سے یہ مضامین تازہ لگتے ہیں جو ذہنوں کو آسودگی بخشتے ہیں۔ مضامین کتنے ہی فرسودہ کیوں نہ ہوں یہ شاعر کے فن کا کمال ہے کہ وہ اس کی ادائیگی کس انداز سے کرتا ہے۔ عرشؔ اِس فن میں ماہر ہیں، مثلاً

● دَیر و حرم کی اپنی عظمت ہے لیکن	میخانے میں اور ہی عالم ہوتا ہے
● دیر و کعبہ کا بھی قائل، مے کدے کا بھی مُرید	عرشؔ کہتے ہیں جسے کافر بھی ہے دیں دار بھی
● موسم بَلا سے خشک ہو یا خوشگوار عرشؔ	بیٹھے ہیں ہم تو ساغر و مینا لئے ہوئے
● عرشؔ شامل نہیں ہے رندوں میں	اِس کی رندی ہے پارسائی سی
● دیر و کعبہ بھی ہے، مے خانہ بھی ہے، صحرا بھی	ہے تلاش اُس کی اگر سامنے آتے ہیں بہت
● عجیب بات ہے، ہم پھر بھی تشنہ کام ہیں عرشؔ	یہ رقصِ جام و سبو تشنگی کی خاطر ہے

اُردو ادب کے بعض محققین کا ماننا ہے کہ احتجاجی شاعری کا آغاز ۱۸۵۷ء کے بعد ہوا۔ ترقی پسند حضرات اِس بات پر متفق ہیں کہ اصل میں احتجاجی شاعری کی شروعات ترقی پسند تحریک

کے اجلاسِ اوّل ۱۹۳۶ء سے ہوئی ہے۔ مگر ایسا نہیں۔ ایسی شاعری کا آغاز بہت پہلے ہو چکا تھا۔ اُردو ادب کے معروف تحقیق و تدوین نگار رشید حسن خاں نے میر جعفر زٹلی نارنولی کا زٹل نامہ (کلیاتِ نثر و نظم) مرتب کر کے ۲۰۰۳ء میں شائع کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

''ادب کے طالب علموں کے لئے یہ لازم ہے کہ کئی صدیوں پر محیط احتجاجی شاعری کا آغاز وارتقا اچھی طرح سمجھنے کے لئے شمالی ہند میں شاعری کے دورِ اوّل کی اِس روایت سے واقف ہوں جس کا سب سے بڑا نمائندہ اور بنیاد گزار جعفر ہے۔۔۔ جعفر کا قتل ۱۱۲۵ھ میں ہوا اور ولی کا دیوان مصحفی کی روایت کے مطابق جلوسِ محمد شاہی (۱۱۳۲ھ) میں دہلی میں آیا تھا یعنی جعفر کے قتل کے کم وبیش سات برس بعد اور جعفر اپنا دیوان اِس سنہ سے برسوں پہلے ''زٹل نامہ'' کے نام سے مرتب کر چکا تھا۔ اِس طرح یہ بات مسلم ہو جاتی ہے کہ دہلی میں اُردو کی شعری روایت کی بنیاد رکھنے والوں میں جعفر کو تقدم زمانی کا شرف حاصل ہے اور یہ بھی کہ دہلی میں اُردو شاعری کا آغاز غزل گوئی سے نہیں۔ سماجی حقیقت نگاری سے معمور شاعری سے ہوا جو سرتاسر نظموں پر مشتمل ہے۔''[1]

اورنگ زیب کی وفات کے بعد اِس کا بیٹا فرخ سیر تخت نشین ہوا۔ حکومتِ وقت کے خلاف احتجاجی شاعری کے جُرم میں شہنشاہ فرخ سیر کے حکم سے جعفر زٹلی کو چمڑے کے تسمے سے گلا گھونٹ کر مروا دیا گیا۔

۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کیا تو مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر کو حکومتِ وقت کے خلاف احتجاج بلند کرنے کے جُرم میں دار پر چڑھایا گیا۔ یہ دوسری ادبی شہادت تھی۔ اس کے بعد احتجاجی آواز بلند کرنے کے جُرم میں اُردو ادب کے بہت سے شعرا حضرات کو انگریزوں کی قید و بند کی صعوبتوں کو برداشت کرنا پڑا۔ لیکن ترقی پسند تحریک کے دوران احتجاج نے ایک نعرے کی صورت اختیار کر لی۔ تقسیم وطن کے بعد اسی ترقی پسند کی سیڑھی

---

[1] زٹل نامہ (کلیاتِ جعفر زٹلی) اشاعت ۲۰۰۳ء انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی۔۲، ص: ۱۸ تا ۲۰

کے ذریعے بہت سے شعرا بنگلوں اور فائیو اسٹار ہوٹلوں تک جا پہنچے، ہوائی طیاروں پر سوار ہو کر دُنیا گھوم آئے اور بڑے سے بڑے ادبی انعامات سے نوازے گئے۔

عرشؔ کے کلام کے مجموعوں میں بھی ہمیں یہ آواز نمایاں طور پر سُنائی دیتی ہے لیکن انہیں انعامات و اعزازات سے نوازنے کی بجائے نظر انداز کیا گیا، جس کا انہیں شدّت سے احساس ہے۔ ان کے سیاسی اشعار کے ساتھ طنز کی چبھن بھی محسوس کی جا سکتی ہے، ملاحظہ ہوں چند اشعار:

- نہیں ہیں اہلِ سیاست ہی صرف اِس صف میں ۔ ہیں اور لوگ بھی جن کا ضمیر کوئی نہیں
- جو نہیں راستوں سے واقف عرشؔ ۔ کارواں کے اُمیر ہوتے ہیں
- اہلِ دُنیا پر سیاست کا اثر ہونے لگا ۔ جب ملے یہ مختلف مکروہ چالوں سے ملے
- وہی ہیں محترم جو بے اُصول ہیں اے عرشؔ ۔ جو با اُصول ہیں اُن کا کوئی وقار نہیں
- اب نہیں ہے رہبر و رہزن میں فرق ۔ جذبۂ تخریب کیا، تعمیر کیا
- یہاں بے جُرم ملتی ہیں سزائیں ۔ مگر یہ فیصلے بے جا ہیں کتنے
- کس قدر مصروف ہیں اِن کو نہ چھیڑ ۔ امن کے شیدائی محوِ جنگ ہیں
- آج کے دورِ زر پرستی میں ۔ ایک مُفلس کی آبرو کیا ہے
- عبث نہ اہلِ سیاست کو کیجئے بدنام ۔ یہ خون پیتے ہیں لوگوں کا، بادہ خوار نہیں
- یہی جمہوریت اپنی، یہی حسنِ نظام اِس کا ۔ وہی محروم حق ہوئے ہیں جو حقدار ہوتے ہیں
- ہر قدم سخت مراحل سے گزرنا ہوگا ۔ یہ رہِ حق ہے یہاں سر بھی قلم ہوتے ہیں
- ہو سرِ راہ جب خود میر کارواں اے عرشؔ ۔ پہنچ سکیں گے پھر منزل پہ راہ گیر کہاں
- دیکھ کر یہ نظام چُپ ہوں عرشؔ ۔ دِل پریشاں ضرور ہوتا ہے

موجودہ دور کے سیاسی حالات کے تحت جب عرشؔ نے عوام کی مجبوری، محکومی اور محرومی کو دیکھا تو اپنے صبر و تحمل کو ضبط نہ کر سکے تو یوں گویا ہوئے۔

- منزلِ مقصود تک پہنچے گی عرشؔ ۔ رُک نہ پائے گی مری آواز ہے

اُردو شاعری کے ہر دور میں ہمیں کسی نہ کسی شاعر کے کلام میں طنزیہ اشعار ضرور نظر

آتے ہیں۔ بعض حضرات نے طنز کے ساتھ مزاح کا بھی استعمال کیا ہے جس سے اشعار میں ہلکا سا تبسم بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ لیکن صرف طنز اُس نشتر کی طرح کام کرتا ہے جس کی چبھن گہرائی تک محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اس کی ادائیگی کے لئے شاعر کا الفاظ پر گرفت کا ہونا لازم ہے۔ عرشؔ اس میدان کے مرد ہیں تبھی تو غزلیہ اشعار میں انہوں نے اِن مضامین کو اچھی طرح نبھایا ہے۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار:

- ظاہر میں اور کچھ ہے یہ باطن میں اور کچھ ۔۔۔ واقف نہیں ہیں آپ زمانے کی چال سے
- کہنے کرنے میں ہے بس اتنا ہی فرق ۔۔۔ کہنا آساں، کرنا مُشکل ہوتا ہے
- کوئی اصول ہو جس کا نہ کوئی ایماں ہو ۔۔۔ وہ زندگی کے لئے وجہ ننگ ہوتا ہے
- غریبوں کا نہیں ہے عرشؔ کوئی ۔۔۔ غریبوں نے ہے کس کو یاد کرنا
- ضمیر بیچتا ہے اور کوئی غیرت عرشؔ ۔۔۔ نہیں ہے کوئی بھی جو زندگی فروش نہیں
- عرشؔ جس کا کوئی ضمیر نہیں ۔۔۔ ایسے ہر شخص سے میں بہتر ہوں
- آج کے دور کا بشر اے عرشؔ ۔۔۔ جسم زندہ، ضمیر مُردہ ہے
- عرشؔ جن کا کوئی ضمیر نہیں ۔۔۔ لوگ وہ کامیاب ہیں کتنے
- جو لوگ زندگی کی قدروں کے محافظ ہیں ۔۔۔ نگاہِ وقت میں وہ گردِ رہگزر بھی نہیں

دوسری زبانوں کے شعرا کی ہم بات نہیں کرتے لیکن اُردو شاعری میں قریب قریب ہر شاعر نے تعلّی کا ضرور استعمال کیا ہے۔ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ جب شاعر کے کلام میں پختگی آنے لگتی ہے تو دوسروں پر اپنی برتری جتانے کے لئے کہیں کہیں اِس صنعت کو شعر کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ اگر شاعر کو زبان و بیاں، مناسب الفاظ اور اپنے قلم پر مضبوط گرفت نہیں تو لغزش کھا کر گرنے کا احتمال ہوسکتا ہے۔ عرشؔ ایک کہنہ مشق و اُستاد شاعر ہیں جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔ اِس لئے انہوں نے اِس صنعت کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ مثلاً:

- رسائی عرشؔ تک مُشکل نہیں ہے ۔۔۔ اگر ہوں مائلِ پرواز ہم بھی

- وہ جان بوجھ کے کھاتے تھے دوسروں سے فریب — جنابِ عرشؔ طبیعت کے کتنے سادہ تھے
- برحق ہی سہی عرشؔ کا اسلوب الگ ہے — خود ہم نے بھی یہ تجزیہ کرنا ہے کسی روز
- مرے لئے کسی نعمت سے کم نہیں اے عرشؔ — یہی بہت ہے کہ رمز آشنائے غم ہوں میں
- تُم جیسے عرشؔ عرش کہتے ہو — لوگ کرتے ہیں احترام اُس کا
- کلامِ عرشؔ میں سوجدّتیں ہیں — نہیں ہے شائبۂ خوشہ چینی
- الگ ہے عرشؔ کا حُسنِ تخاطب — کہاں سے لائے یہ انداز کوئی
- نہیں تم عرشؔ واقف شاعری سے — تمہارا ذکر کیا ہو شاعروں میں
- عرشؔ صاحب آپ کرتے ہیں مذاق — ذکر ہے تعظیم کے قابل مرا
- عرشؔ سے کوئی صرف یہ پوچھے — شاعری میں کہاں ہے تیرا مقام
- عرشؔ کی شاعری کے ہم ہی نہیں دیوانے — اور بھی ہوں گے کئی چاہنے والے اُس کے
- چلی ہے بحث جب تفسیرِ شعریت کیا ہے؟ — جنابِ عرشؔ کے حُسنِ بیاں پہ ختم ہوئی

تعلّی، خودداری و خود اعتمادی میں بہت فرق ہے۔ غالبؔ و اقبالؔ جیسے نامور شاعروں نے تعلّی کا استعمال کیا ہے، مگر ضمیر کی سطح پر انہوں نے مصلحت کوشی سے گریز نہیں کیا۔ خوددار و خود اعتماد شاعر حالات کے ساتھ سمجھوتا نہیں کرتا اور نہ ہی اپنی انا و ضمیر کو مرنے دیتا ہے۔ یہ وصف عرشؔ کے کلام میں نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زمانے کی رفتار کا ساتھ نہیں دے سکے اور بہت سی محرومیوں کا شکار ہوئے۔

خودداری و خود اعتمادی انسان میں ایک وصف اور پیدا کردیتی ہے اور وہ ہے بیبا کی۔ ایسا انسان کچھ کہنے سے جھجکتا نہیں۔ آج کے دور میں ایسا انسان دوست کم اور دشمن زیادہ بنالیتا ہے۔ ذیل میں کچھ اشعار درج کئے جاتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے آپ اِن کی شخصیت کا خود اندازہ لگا سکتے ہیں:

- مجھے جو کہنا ہوتا ہے کہہ دیتا ہوں — میری بلا سے کوئی برہم ہوتا ہے
- پڑتی ہے صاف گوئی کی عادت بدیر عرشؔ — اِنسان ابتدا میں جھجکتا ضرور ہے

- جھکنے دیا نہ ہم نے جبینِ ضمیر کو — یعنی جہاں میں ہم بھی گنہ گار سے رہے
- عرشؔ اپنا یہی عقیدہ ہے — جو بھی کہنا وہ برملا کہنا
- جناب عرشؔ کے اندازِ گفتگو کے نثار — وہ بات کرتے ہیں جو بھی بڑے یقین کے ساتھ
- میں حق گوئی سے خود تنگ آگیا ہوں — مجھے اس قید سے آزاد کرنا
- راہِ حق گوئی میں ہوں گے اور بھی کچھ مرحلے — حلقہ دار و رسن میں عمر بھر رہنا بھی ہے
- رہے ہیں عرشؔ ہم حق گو ہمیشہ — یقیناً اِس پہ شرمندہ رہیں گے
- اختیار کرتا ہے جو بھی راہِ حق گوئی — عرشؔ وہ زمانے میں سنگ سار ہوتا ہے
- نہیں اے عرشؔ آساں راہِ حق میں ہم سفر بننا — وہ اکثر چھوڑ جاتے ہیں جو ہم آواز ہوتے ہیں
- حق گوئی جسے کہتے ہیں اس دور میں اے عرشؔ — تپتے ہوئے صحرا کے بگولوں کی طرح ہے
- اپنے کردار یا گفتار میں کچھ فرق نہیں — زندگی میں وہی کرتے ہیں جو ہم کہتے ہیں
- وہ حق پرست تھا لیکن اُسے شکست ہوئی — نہ ساتھ دے سکا کوئی بھی ہم زباں اُس کا
- خوداعتمادی کے جذبے سے جو بھی ہے محروم — قدم قدم پہ وہ بے موت مرتا رہتا ہے
- عرشؔ کو جانتے ہیں ہم اُس نے — جی میں آئے جو کرگزرنا ہے

خودداری، خوداعتمادی اور بے باکی جیسے وصف جب ایک انسان کی طبیعت میں شامل ہوتے ہیں تو چند دوسرے اوصاف خود بہ خود اِن کے ساتھ آکر جڑتے ہیں۔ قناعت بھی ایسا ہی ایک وصف ہے جو اِن تینوں کے ساتھ ملنے کے بعد انسان کے ضمیر کو مرنے نہیں دیتا۔ وہ ایشور کی دی ہوئی ہر نعمت کو صبر و شُکر کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ عرشؔ نے تمام عمر اِسی اصول کی پیروی کی ہے۔ ملاحظہ ہوں اشعار:

- میں اپنے حال پر اے عرشؔ مسکراتا ہوں — کچھ اور ہو نہ ہو یہ بات میرے بس میں ہے
- ملے اے عرشؔ بے شک خُشک روٹی — مجھے عزت سے کچھ بڑھ کر نہیں ہے

مذکورہ بالا اوصاف جس شخصیت میں موجود ہوں تو وطن پرستی کا جذبہ لازماً اُس میں عود کر آتا ہے۔ یہ ایسا جذبہ ہے جو وطن پر زندگی نثار کرنے کے لئے آمادہ کر دیتا ہے۔ عرشؔ کے یہ

اشعار دیکھئے اور اِن کے جذبے کی داد دیجئے۔

- خدمتِ قوم و وطن میں ہو بسر عمر تمام — آج ہر شخص میں تو سوچ یہ پیدا کر دے
- مجھ کو توفیق دے میں بہرِ وطن مِٹ جاؤں — زندگی اور اگر کچھ نہیں اتنا کر دے
- مختصر یہ کہ تجھے یاد کریں اہلِ جہاں — عرشؔ دُنیا میں کوئی معجزہ ایسا کر دے

جو لوگ وطن پہ اپنی جان نثار کر دیتے ہیں۔ اُن پہ عرشؔ کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

- ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں اِس دُنیا میں — جن کا بعد میں صدیوں ماتم ہوتا ہے

عرشؔ صاحب زندگی کی ۸۸ بہاریں دیکھ چکے ہیں۔ خالقِ کائنات نے انہیں اپنی نعمتوں سے نواز رکھا ہے۔ دِل و دماغ، جسم و جاں، آنکھوں کی بینائی سب دُرست ہیں۔ ان کے بیس شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ قلم اب بھی رواں دواں ہے۔ جس جموں شہر میں اِن کی تمام عمر گزری، یہ اس کے ماحول اور مٹی سے خوش نہیں ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ جس مقام کی انہیں تلاش ہے وہ مقام ابھی تک انہیں نہیں مِل پایا۔ ایسے مقام تک پہنچنے کے لئے جن راستوں پر چلنا پڑتا ہے۔ گزشتہ اوراق میں اِن کے شعروں میں اِن کا ذکر آچکا ہے۔ یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ہاں جموں کے ماحول اور مٹی سے متعلق اِن کے خیالات کو سُن لیجئے۔

- عرشؔ جموں کے ماحول کو کیا کہیں — کیسے ماحول میں ہم جیئے عمر بھر
- جموں کو فن سے فن کار سے کیا مطلب — یہ دھرتی ہر رنگ میں بنجر لگتی ہے

ان دو اشعار کو دیکھنے کے بعد عرشؔ کا جموں سے خفا ہونے کا راز آپ کی سمجھ میں اچھی طرح آ گیا ہوگا۔ اب وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ جتنے عرشؔ جموں کی مٹی سے خفا ہیں اُس سے زیادہ لگاؤ انہیں اپنے پیدائشی گاؤں کی مٹی سے ہے۔ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

وہ گاؤں جس کے سائے میں بچپن کٹا ہے عرشؔ
اب بھی ہے اُس کی مٹی سے دِل کو لگاؤ سا

اِس شعر کو بھی دیکھ لیجیے:

گاؤں اب شہروں میں ہوتے جارہے ہیں جذب عرشؔ
میرا مستقبل تو اِن ماضی کی تصویروں میں ہے

اب ہم عرشؔ کے محبوب سے متعلق تھوڑی سی گفتگو کریں گے۔ کسی نے ایک بار عرشؔ صاحب سے پوچھا، آپ نے کسی سے عشق کیا ہے؟ انہوں نے فوراً جواب دیا، ہاں۔ اُس نے پھر پوچھا، کس سے؟ عرشؔ نے جواب دیا زندگی سے۔ جواب نہایت مناسب و معقول تھا۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے تک انہیں جن حالات کا سامنا رہا، اُن کا یہاں ذکر نہ کرنا ہی مناسب لگتا ہے۔

جب اِن کی زندگی ۲۴ سال سے تھوڑی سی آگے بڑھی یہ ازدواجی زندگی کے بندھن میں بندھ گئے۔ اب شریکِ حیات ہی اِن کا اصل محبوب تھا۔ جس طرح سے انہوں نے انہیں چاہا اور جس طرح سے اُن کے حُسن و جمال کا ذکر کیا ہے، وہ صاف طور سے ان کے اشعار میں دیکھا جاسکتا ہے۔ آج بھی اُن کی تصویر عرشؔ صاحب کے کمرے میں لگی ہوئی ہے۔ وہی اِن کی تنہائی و توانائی کا ساتھی ہیں:

- میرے دم سے وجود ہے اُس کا — میں ہوں ذرّہ، وہ آفتاب سہی
- وہ یاد آئیں تو پھر رُکتی نہیں ہے اَشک افشانی — دِلِ نازک کئی لعل و گُہر سے توڑ دیتا ہے
- میں تجھ سے بچھڑ کر یوں رہتا ہوں پریشاں سا — جیسے کسی کھنڈر میں ایک روح بھٹکتی ہے
- مجھ کو معلوم ہے وہ ہے مرا اپنا کتنا — میں نے اِس پر بھی اُسے ٹوٹ کے چاہا کتنا
- کاش اُس کو کبھی احساس یہ ہوتا اسے عرشؔ — ہوگیا اُس سے بچھڑ کر کوئی تنہا کتنا
- ذرّے ذرّے میں ہیں اُس کی پرچھائیاں — بات اتنی ہے دِل میں یقین چاہیئے
- اُس کی قربت میں جو گزرے مختصر لمحات عرشؔ
  یاد اُن کی اب بھی دِل میں ضوفشاں ہے دور تک
- زندگی میں ہم کبھی دو جسم اور اِک جان تھے — بھولی بسری بات ہے یہ اس کو اب تازہ نہ کر
- کانٹے بھی مُسکرانے لگے پھول بن کے عرشؔ
  میرے غریب خانہ پر کس کے قدم پڑے

● کہاں ڈھونڈوں اُسے اے عرشؔ جا کر کہیں بھی اُس کا نقشِ پا نہیں ہے

● کیا کہوں اے عرشؔ اِن نظروں کو ہے اُس کی تلاش
جس کا سایہ بھی مرے وہم و گماں سے دور ہے

● تنہائی میں ہر بار یہ احساس ہوا عرشؔ سائے کی طرح کوئی میرے پاس کھڑا ہے

● وہ زندگی کے کسی موڑ پر ملے گا عرشؔ دِلِ شکستہ میں اتنی تو آس رہنے دو

● کسی کی یاد کے سائے سے جو پرے ہوں عرشؔ
وہ لمحے لازماً دِل پر گراں گزرتے ہیں

● وہ جذب ہے خوشبو کی طرح سانسوں میں اے عرشؔ
میں بھول سکوں اُس کو یہ آسان نہیں ہے

شاعر کا دِل بڑا احساس ہوتا ہے۔ وہ بھی معاشرے کا فرد ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے واقعات سے متاثر ہوتا ہے۔ عرشؔ بھی متاثر ہوئے۔ جو انہوں نے معاشرے سے حاصل کیا اُسے ری فائینڈ کر کے جب انہوں نے معاشرے کو واپس لوٹایا تو معاشرہ تِلمِلا اُٹھا۔

● جھونپڑوں کا بھی احترام کرو جھونپڑوں میں بھی لوگ بستے ہیں

● اِن کے بھی ولولے ہیں اِن کے بھی جذبات ہیں عرشؔ
یہ بھی انسان ہیں جو جھونپڑوں میں رہتے ہیں

عرشؔ صہبائی کا کلام ایک بحرِ بیکراں ہے جس کی گہرائیوں میں غوطہ لگا کر ہر شخص اپنی مرضی کے گُہر تلاش کر سکتا ہے۔ میں اپنی بات عرشؔ کے ایک ایسے شعر پر ختم کرتا ہوں جس میں انہوں نے اپنے تخلص کو بڑے فن کارانہ انداز میں استعمال کیا ہے۔ دوسرے اس میں جو خیال پیش کیا گیا ہے، اُس کی تشریح کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ اب تک جتنا کلام میری نظر سے گزرا ہے اُس میں اِسے اوّلیت کا شرف حاصل ہے اور اسے جانِ سخن کہہ سکتے ہیں۔

کس قدر با اثر تھی صہبا عرشؔ اُن کی آنکھوں سے جو کشید ہوئی

☆☆☆

☆...... پروفیسر محمد اسد اللہ وانی

عرشؔ صہبائی: ایک مطالعہ

عرشؔ صہبائی کی شاعری کے عمیق مطالعہ سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ان کے شعر کہنے کا اپنا ایک منفرد اور جداگانہ انداز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں متقدمین یا معاصرین شعرا کے اثرات نہیں ملتے۔ چنانچہ اُن کی شاعری میں میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، فیضؔ یا دوسرے ہم عصر شاعروں کے مخصوص نظریات اور افکار کا واضح طور پر تلاش کرنا لا حاصل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی غزل کا کوئی شعر، کسی شعر کا کوئی مصرع یا ان کا کوئی خیال قدما یا ہم عصر شعرا کے کسی خیال یا مضمون سے مماثل ہو جائے تو وہ ایسا ہی ہے جیسے کہ اس وسیع و عریض کائنات میں انسانوں کی بھیڑ میں کئی افراد نہ صرف ہم شکل ہوتے ہیں بلکہ بعض اوقات ان کے خیالات اور نظریات بھی آپس میں میل کھاتے ہیں لیکن اسے قاعدۂ کلیہ نہیں بلکہ محض ایک اتفاق کہا جا سکتا ہے۔

میں نے 'اقبال اور جموں و کشمیر کا اردو ادب' کے عنوان سے اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے کے دوران جب عرش صہبائی کی شاعری پر اقبال کے اثرات تلاشنے کی کوشش کی تو مجھے کسی حد تک مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال اپنے عہد کی ایک ایسی مقناطیسی شخصیت کے مالک تھے جنہوں نے اپنے خیالات و نظریات اور فکر و فلسفہ سے اپنے عہد اور بعد کے شعرا اور ادبا کو اس قدر متاثر کیا کہ اس کی بازگشت اب تک سنائی دیتی ہے، لیکن ان سے متاثر ہونے کا یہ رَوّیہ چونکہ سب شعرا کے یہاں نہیں ملتا اس لیے ایسے شعرا میں عرش صہبائی کا شمار بھی

ہوتا ہے۔ میں اس بات کو قطعی اور حرفِ آخر بھی نہیں مانتا ہوں کیوں کہ جس طرح ہوا کی خنکی اور دھوپ کی تمازت سے کوئی بھی ذی روح متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی اسی طرح ایک ادیب، شاعر اور فن کار عالمی اخلاقی اقدار اور احسن اصول و نظریات کے بندھے ٹکے پیمانوں سے صرفِ نظر، چشم پوشی یا روگردانی نہیں کر سکتا اور اُسے ان اصولوں، نظریوں، قدروں اور پیمانوں کا ادراک اور اعتراف لامحالہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے اس غیر مطبوعہ مقالے میں اقبال کے افکار، مضامین اور مختلف موضوعات سے متاثر یا کسی نہ کسی طرح اُن کا رنگ لیے ہوئے عرشؔ صہبائی کی شاعری سے 'مُشتے نمونہ از خروارے' کے مصداق حسبِ ضرورت مندرجہ ذیل اشعار انتخاب یا حوالے کے طور پر پیش کیے:

وہ بشر جو ہو صاحبِ اخلاق، قابلِ احترام ہوتا ہے
آ ہی جاتی ہے منزلِ مقصود، شوق جب تیز گام ہوتا ہے

☆

عقل خود حیران ہے وحشت پرستی دیکھ کر — اشرف المخلوق کی اس درجہ پستی دیکھ کر

☆

بے زبانی بھی تو رکھتی ہے زباں — خامشی بھی عالم تقریر ہے

☆

اس کو معراجِ محبت کے سوا کیا کہیے — دل سے جو بات بھی نکلے اثر تک پہنچے

☆

نہ ملا عرشؔ جہاں میں کہیں انساں کا سراغ — جستجو والے مگر شمس و قمر تک پہنچے

ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے ۱۹۷۷ء میں اقبال صدی تقریبات کے دوران ریاست بھر میں سیمیناروں، مباحثوں اور طرحی مشاعروں کا انعقاد کیا۔ عرشؔ صہبائی نے علامہ اقبالؔ کی ایک غزل کے مصرع 'کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر' کی طرح میں جو اشعار کہے ہیں اُن میں ایک مدھم سی لَے کے ساتھ اقبال کا ہلکا سا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ عرش کی طرحی غزل کے یہ اشعار

ملاحظہ ہوں:

کسے خبر کہ کون سا پل باعثِ انقلاب ہو
وقت پہ اعتماد رکھ وقت کا انتظار کر

میری زباں بھی بند ہو شورشِ حق بھی ہو ختم
اس کا یہی علاج ہے مجھ کو سپردِ دار کر

یہ تو ہے پائدار شے اس کا گلہ فضول ہے
فکرِ غمِ خزاں عبث فکرِ غمِ بہار کر

تیری اَنا کی خیر ہو، مجھ سے ہی یہ خطا ہوئی
اتنی سی بات کے لیے مجھ کو نہ شرمسار کر

تجھ کو بھی اس کا علم ہو اصل میں زندگی ہے کیا
کشتیِ زیست کو کبھی طوفاں سے ہم کنار کر

اذنِ سفر کا مدعا، کارِ جہاں کا جائزہ
'کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر'

عرش کہیں تو کیا کہیں اس کا عجب سلوک ہے
ملتی ہے جب بھی زندگی لاتی ہے غم سنوار کر

عرش صہبائی کے ان اشعار کے غائر مطالعہ سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ انہوں نے فقط ایک اقبال ہی سے کیا بلکہ متقدمین اور معاصرین شعرائیں سے کسی کو بھی اپنے اعصاب پر سوار نہیں ہونے دیا ہے اور انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بالکل منفرد اور اچھوتے انداز اور اسلوب میں شعری پیکر عطا کرنے کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔

اگر ہم عرش صہبائی کی شاعری کا مجموعی حیثیت سے تجزیہ کریں تو ہمیں ان کے شعری سفر میں کئی نشیب وفراز دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے جس دور میں شعر کہنا شروع کیے وہ ہندو پاک کے عوام کے لیے ایک بحرانی دور تھا اور عوام تقسیم کے صدمہ سے دوچار ہونے کے بعد کسی نہ کسی طور پر سنبھلنے کی تگ ودَو میں مصروف تھے۔ یہ بات توجہ طلب ہے کہ ملک کی یہ تقسیم محض زمین، سیاست اور اقتدار کی بالادستی کی تقسیم نہ تھی بلکہ یہ آپسی بھائی چارے، ہمدردی، انسانی رواداری، خونی رشتوں اور سماجی اور مذہبی قدروں کی ناقابلِ بیان اور اذیت ناک تقسیم تھی جس میں ادب اور ادیبوں کا بٹوارہ بھی ہو گیا تھا۔ برِصغیر میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء تک کا یہ دور اگرچہ افراتفری، تعطل، جمود اور بحران کا دور تھا لیکن گزرتے ہوئے لمحات کے ساتھ حالات میں سکون وثبات کے آثار بھی نمایاں ہو رہے تھے اور زندگی ایک بار پھر واپس پٹڑی پر آنا شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ کاروبارِ زندگی کے ساتھ ساتھ ادبی سرگرمیاں بھی شروع ہو گئیں اور زندگی نئے حالات

کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر نئے معر کے سر کرنے کے لیے رواں دواں ہو گئی۔

عرش صہبائی کی شاعری جہاں کلاسیکی روایات کی حامل ہے وہاں یہ اُن کے اپنے عہد کے پُر آشوب حالات کی عکاس و ترجمان بھی ہے۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ شعر کہنے میں عرش کی اپنی ایک انفرادیت رہی ہے اور ان کا اپنا بھی یہ دعویٰ ہے کہ وہ شعر کہنے کے سلسلے میں کسی سے متاثر نہیں ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ایسا قطعی ناممکن ہے کیوں کہ یہ دنیا اتفاقات اور امکانات کی ہے جہاں رَدّ و قبول یا اختیار و اجتناب کا سلسلہ روز ازل سے چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ کسی ایک شاعر کا کوئی مضمون، خیال یا کسی مصرع کے کچھ الفاظ کسی دوسرے شاعر کے روزنِ تخلیق سے در آنے کے بعد اس کے شعر کا حصہ بن جانا عین ممکن ہے لیکن اسے سرقہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

عرش صہبائی کے ایک مشہور شعر کے ساتھ بھی ایک ایسا ہی واقعہ وابستہ ہے جو انہوں نے ۱۹۶۰ء کے دوران کہا ہے۔ یہ شعر اپنی تخلیق کے ایام سے لے کر اس وقت تک مختلف ادبی حلقوں میں کافی بحث و تمحیص کا موضوع بنا ہوا ہے:

تم نے چاہا ہی نہیں چاہنے والوں کی طرح　　　دل تو کیا چیز ہے ہم روح میں اترے ہوتے

اس شعر نے جب ادبا کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی تو جموں کے ادبی حلقوں میں اس شعر کی کئی تاویلیں کی گئیں اور بعض نے تو اسے مہمل تک قرار دیا۔ حالانکہ اس شعر کی حامل یہ غزل پاکستان ریڈیو سے بشارت علی کی آواز میں نہ صرف نشر ہوتی آ رہی ہے بلکہ وہاں کے سنجیدہ حلقوں میں اس کی کافی پذیرائی بھی ہوئی اور یہاں سے پاکستان جانے والوں نے بعض شہروں میں چلنے والی بسوں کی پیشانی پر بھی اس شعر کو لکھا ہوا دیکھا۔ اتنا ہی نہیں جب پاکستانیوں کا ایک وفد خیر سگالی دورے پر ہندوستان آیا تو وفد کے لوگ اپنے ہاتھوں میں جو علَم (Banner) اُٹھائے ہوئے تھے اس پر عرش صہبائی کا یہی شعر لکھا ہوا تھا۔

تم نے چاہا ہی نہیں چاہنے والوں کی طرح　　　دل تو کیا چیز ہے ہم روح میں اترے ہوتے

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہ شعر جموں و کشمیر کے ادبی حلقوں میں آج تک زبان زدِ خاص و عام ہے۔

عرش صہبائی کے اس شعر کو جو لوگ شعر نہیں مانتے، غالباً اُن کا یہ کہنا ہے کہ پہلے مصرع میں 'دل' کو چیز کہا گیا ہے جب کہ دل، دل ہی ہے یہ کوئی چیز نہیں ہے اور ساتھ ہی 'روح' میں اترنے کا عمل بھی لوگوں کے ذہن میں یہ خلش پیدا کرتا ہے کہ روح میں کہاں اُترا جاتا ہے؟ اُترا تو دل میں جاتا ہے، جیسا کہ علامہ اقبالؔ کے ایک قطعہ کے اس مصرع میں یوں موجود ہے:

شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات — اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے

☆

اور جہاں تک عرش کے محولہ بالا شعر کے دوسرے مصرع

''تم نے چاہا ہی نہیں چاہنے والوں کی طرح''

کا تعلق ہے یہ مشہور ترقی پسند شاعر جان نثار اختر (ولادت ۱۸ر فروری ۱۹۱۴ء وفات ۱۹ر اگست ۱۹۷۶ء) کے اس شعر کے دوسرے مصرع کا ذرا سا ردّو بدل معلوم ہوتا ہے:

ہم نے چاہا ہے تمہیں چاہنے والوں کی طرح — ہم سے بھاگا نہ کرو دور غزالوں کی طرح

جان نثار اختر نے اپنی اس غزل کے ایک شعر میں 'چھالا' لفظ استعمال کر کے محنت کشوں کے ساتھ ہو رہے ظلم و ستم اور استحصال کی نشاندہی اور اپنے ترقی پسند نظریے کی تبلیغ یوں کی ہے:

چند سکّے ہیں میرے ہاتھ میں چھالوں کی طرح — اور تو مجھ کو ملا کیا میری محنت کا صلہ

لیکن عرش صہبائی نے اسی غزل کے ایک شعر میں 'چھالا' لفظ کا استعمال ایسے بلیغ انداز میں کیا ہے کہ دشتِ غربت میں ایک محبّ وطن، جذبہ حُب الوطنی سے سرشار ہو کر پاؤں کے چھالوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتا ہے:

پھوٹ کے روئے ہیں ہم پاؤں کے چھالوں کی طرح — دشتِ غربت میں جو آئی ہے کبھی یادِ وطن

اب لمحہ فکریہ یہ ہے کہ کیا یہ ضروری ہے کہ عرش صہبائی نے جان نثار اختر کے اشعار سے خوشہ چینی کی ہو؟ وہ لوگ جو عرش صہبائی کے شعر کے پہلے مصرع کے 'دل تو کیا چیز ہے' الفاظ پر اعتراض کرتے ہیں اُن کے پیشِ نظر شاید مرزا غالبؔ کے ہم عصر لالہ مادھو رام جوہر (۱۸۱۰ء-۱۸۸۸ء) فرخ آباد اُتر پردیش کی مشہور غزل کا یہ شعر نہیں رہا ہوگا:

دل تو کیا چیز ہے پتھر ہو تو پانی ہو جائے		میرے نالے ابھی اتنا تو اثر رکھتے ہیں

لالہ مادھورام جوہر کی غزل کے ابتدائی دو شعر یہ ہیں:

رات دن چین ہم اے رشکِ قمر رکھتے ہیں		شام اُودھ کی تو بنارس کی سحر رکھتے ہیں

بھانپ ہی لیں گے اِشارہ سرِ محفل جو کیا		تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں

اس غزل کا مقطع یوں ہے:

عاشقوں پر ہے دِکھانے کو عتاب اے جوہر		دل میں محبوب عنایت کی نظر رکھتے ہیں

اب کیا کوئی یہ کہہ سکتا کہ عرش صہبائی نے اپنی غزل کے پہلے مصرع کا یہ حصّہ 'دل تو کیا چیز ہے' لالہ مادھورام جوہر کی غزل کے مندرجہ بالا شعر سے لیا ہے؟ اسی طرح اردو کے ایک معروف شاعر احمد فراز (ولادت ۱۲ر جنوری ۱۹۳۱ء وفات ۲۵ر اگست ۲۰۰۸ء) جو عرش صہبائی کے ہم عصر ہو گزرے ہیں، کی ایک مشہور غزل کا مطلع ہے:

رنجش ہی سہی دل ہی دُکھانے کے لیے آ		آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

اس غزل کا دوسرا شعر یہ ہے:

پہلے سے مراسم نہ سہی پھر بھی کبھی تو		رسم ورہ دُنیا ہی نبھانے کے لیے آ

عرش صہبائی کی ایک غزل کا مطلع احمد فراز کی غزل کے دوسرے شعر کے مضمون سے کافی مماثل اور متاثر معلوم ہوتا ہے:

گو رسم سہی پھر بھی نبھانے کے لیے آ		فرصت میں کبھی ملنے ملانے کے لیے آ

یہاں پر بھی یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس شعر کے سلسلے میں عرش صہبائی نے احمد فراز سے خوشہ چینی کی ہے یا وہ ان کے خیال سے متاثر ہوئے ہیں۔ اگر ایسا تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ عرش نے اس خیال کو ایک جداگانہ انداز سے پیش کر کے شعر میں بلاغت پیدا کی ہے۔ احمد فراز ایک ایسے شخص کو رہ ورسم دنیا نبھانے کی دعوت دیتا ہے جو اجنبی ہے جس کے ساتھ پہلے سے کوئی مراسم ہی نہیں ہیں جب کہ عرش صہبائی ایک ایسے شخص کو فرصت کے دوران ملنے ملانے کے لیے کہتا ہے جس کے بارے میں اگرچہ معلوم نہیں کہ آیا وہ اجنبی ہے یا پہلے سے ہی شناسا ہے

لیکن ایک تعلق خاطر ضرور ہے اس لیے وہ بس رسم نبھانے کی خاطر اُسے آنے کے لیے کہتا ہے۔
بہر کیف یہی اتفاق اور امکان کی دنیا ہے اور مجھے اس سے سرِ مو انحراف نہیں! میں شاعری کے
زبان میں اسے 'توارد' کے سوا کوئی اور نام نہیں دے سکتا اور یہی قرین قیاس بھی ہے۔
جب ہم عرش صہبائی کے سبھی شعری مجموعوں کی حامل شاعری کا مجموعی حیثیت سے تجزیہ
کریں تو یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ ان کی تمام غزلیہ شاعری اُن اوصاف سے متصف رہی
ہے جو اردو غزل کی تعریف و توصیف اور مفاہیم و مطالب کی مطلوب و مقصود چلی آ رہی ہے۔ اُن کی
شاعری کلاسیکی روایات سے لے کر جدید رجحانات تک ایک طویل حسی تجربے اور خود آگہی کے
گہرے شعور کی عکاس و ترجمان ہے۔ اُن کی شاعری میں جہاں گُل و بلبل، لب و رخسار، رند
و خرابات، رندی و پارسائی، غمِ جاناں و غمِ دوراں، ہجر و وصال اور بقولِ فیض احمد فیض 'ہیں اور بھی غم
زمانے میں محبت کے سوا' جیسے مضامین کے حامل اشعار بدرجۂ اُتم موجود ہیں وہاں آپسی بھائی
چارہ، میل جول، امن و آشتی، عالمی امن، انسان دوستی، اعلیٰ اخلاقی اقدار، جذبۂ حب الوطنی، آفاقی،
ہمہ گیر، مشترکہ مذہبی اور عالمی قدروں کی بازگشت بھی اُن کی شاعری کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ ان کی
شاعری نے بقول ڈاکٹر شباب للت ''غزل کے روایتی نظم و ضبط اور اس کی معتبر کلاسیکیت کے رچاؤ
کے ساتھ جدید ادب کی راہوں پر پیش رفت کی ہے'' یہ حیات اور کائنات کے نت نئے تجربات،
مشاہدات اور جمالیاتی اظہار و ابلاغ کی توضیح، تشریح اور معنی آفرینی کی تحیّر خیز پیش کش ہے:

اے عرش بن سکا نہ کبھی میں زمانہ ساز
اتنا ضرور ہے کہ زمانہ شناس ہوں

☆

لوگ جو باضمیر ہوتے ہیں
مشکلوں کے اسیر ہوتے ہیں

☆

محلوں میں کیا ملے گا وفا کا سراغ عرش
یہ چیز جھونپڑوں کی ہے اُن میں تلاش کر

☆

جھونپڑوں کا بھی احترام کرو
جھونپڑوں میں بھی لوگ رہتے ہیں

وقت کی سب ستم ظریفی ہے ورنہ انسان بُرا نہیں ہوتا

☆

ہر کوئی شہر میں بے نام ونشاں رہتا ہے کس کو معلوم ہے یہ کون کہاں رہتا ہے

☆

زندگی ہے جاگتی آنکھوں کا خواب ڈھونڈیئے اس خواب کی تعبیر کیا

☆

زندگی تجربوں سے اور نکھر جاتی ہے اس لیے عین ضروری ہے سفر میں رہیے

عرش صہبائی اردو کے شعری ادب میں اپنی ایک منفرد شناخت رکھتے ہیں اور اس حقیقت کا احساس اُن کے ہم عصر شعرا کو بھی بخوبی ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو شاعر سے پہلے ایک انسان سمجھتے ہیں۔ ایک ایسا انسان جس کے افعال اور اعمال میں خامیوں کا صدفی صدامکان ہے۔ اسی لیے تو وہ اپنی شاعری کے بارے میں یقین کے ساتھ کہتے ہیں:

میرے اشعار میں بھی خامیاں ہوں گی اے عرش
میں بھی انسان ہوں انساں سے خطا ہوتی ہے

عرش صہبائی جموں کے رہنے والے ہیں اور جموں کو پتھروں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ اس بات کا اعتراف شاعر موصوف کو بخوبی ہے لیکن وہ یہاں کی دھرتی کو بڑی زرخیز مانتے ہوئے کہتے ہیں:

عرش جموں کی یہ دھرتی بڑی زرخیز ہے یہ الگ بات کہ پتھر ہی یہاں اُگتے ہیں

اس شعر میں پتھر اُگنے کی ترکیب اگر چہ انوکھی اور غیر مانوس معلوم ہوتی ہے لیکن اس حقیقت سے انحراف نہیں کہ جموں کی دھرتی ازمنۂ قدیم سے ہی بڑی مردم خیز اور زرخیز رہی ہے لیکن موجودہ ماحول میں ہر سو پنپ رہی منافرت، کشیدگی اور نفسانفسی سے وہ مُشوّش ہو کر پکار اٹھتے ہیں:

عرش جموں کے ماحول کو کیا کہیں کیسے ماحول میں ہم جیے عمر بھر

ایسا ماحول پیدا کرنے والوں کو عرش صہبائی غالباً 'پروردۂ ظلمت' خیال کرتے ہیں

جو شب کی تاریکی میں ستاروں کی مانند چمکتے ضرور ہیں مگر سحر کے نمودار ہوتے ہی کبھی ثابت قدم نہیں رہ سکتے بلکہ غائب ہو جاتے ہیں:

ستارے کانپتے ہیں جب سحر نزدیک ہوتی ہے　　کبھی ثابت قدم رہتے نہیں پروردۂ ظلمت

عرش صہبائی کا خیال ہے کہ انسان اس کائنات کی ایک عظیم ہستی ہے اس کی حیثیت اس گیلی مٹی کی مانند ہے جس سے اللہ نے حضرت آدمؑ کا کالبد تیار کیا اسے جس طرح کوئی چاہے استعمال میں لاسکتا ہے بس ذرا سا چھونے کی ضرورت ہے اس کی بدولت اس کی نہ صرف قدر و قیمت بڑھ جائے گی بلکہ اسے من پسند کھلونے کی صورت میں بھی ڈھالا جا سکتا ہے:

گیلی مٹی ہوں کھلونا ہی بنالو مجھ کو　　تم جو چھولوگے تو بڑھ جائے گی قیمت میری

اس دُنیا کا وجود تو انسان ہی کے دم سے قائم ہے:

گو میں ذرّہ وہ آفتاب سہی　　میرے دم سے ہے وجود اس کا

انسان بنیادی طور پر ایک فن کار ہے جسے زندگی میں کھونے، پانے اور سود وزیاں سے کوئی سروکار نہیں ہے کیونکہ اس کا اصل سرمایہ تو وہ فن ہے جو اللہ نے اسے ازل سے ہی ودیعت کیا ہے اور جس کی وجہ سے اسے فن کار کا رتبہ حاصل ہوا ہے:

فن کاروں نے کیا کھونا کیا پانا ہے　　فن کاروں کو سود وزیاں سے کیا مطلب

غالب کا مشہور شعر ہے کہ اُس کے گھر اُس کے محبوب مہمان کے آنے کا کافی شہرہ ہے مگر اس کی تنگدستی کا یہ عالم ہے کہ مہمان کی خاطر داری کے لیے اس دن اس کے گھر میں چٹائی تک موجود نہیں ہے:

آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا　　ہے خبر گرم اُن کے آنے کی

اس کے برعکس عرش کے دل کو اگرچہ اپنے محبوب مہمان کے آنے کی آس بہت کم تھی مگر جب وہ آگیا تو اس کے آنے کی وجہ سے اس کے گھر کے درودیوار چمکنے لگے:

آپ آئے ہیں دل کو تھی مگر آس بہت کم　　کس قدر چمکنے لگے گھر کے درودیوار

خلوص، محبت، اخوت، جمالیات، حسن پرستی، ایثار، انسانیت، ما فی الضمیر، حسنِ

اخلاق، بھائی چارہ، اور حفظ مراتب جیسی اقدار کو ہمارے سماج میں ازل سے ہی کافی اہمیت حاصل رہی ہے اور شاعر تو اس سماج کا ایک حساس اور دانشور فرد ہے وہ ان قدروں کی پذیرائی اور قدر و منزلت سے کیسے صرفِ نظر کر سکتا ہے۔

عرش صہبائی کی شاعری ان ہی اقدار کی شکست و ریخت اور تعمیر و تشکیل کا آئینہ ہے۔ ان کے یہاں خلوص و محبت اور جمالیاتی احساسات کے اظہار کا ایک منفرد اور انوکھا انداز ہے:

عرش ان کی جھیل سی آنکھوں کا اس میں کیا قصور ڈوبنے والوں کو گہرائی کا اندازہ نہ تھا

☆

کسی کے قدموں کی چاپ جیسے حسین موسم کی آہٹیں سی
ہواؤں میں مستیاں سی رقصاں فضاؤں میں گنگناہٹیں سی
حیات کی رہ گزر پہ جیسے چراغ جلتے ہیں آرزو کے
وہ مست آنکھوں میں نغمگی سی وہ زیرِ لب مسکراہٹیں سی

☆

ایک موسیقی سی ابھری دور تک دل کو صحرا کی صدا اچھی لگی

☆

یاد آتا نہیں ہے نام اُس کا دل میں صورت بھلی سی رہتی ہے

☆

دل و نگاہ میں ایسے اتارتا ہے مجھے وہ اپنے نام سے اکثر پکارتا ہے مجھے

☆

اُن کی نظروں میں سر بسر اقرار اُن کے ہونٹوں پہ اک بہانہ سا
تو بڑے شوق سے ہم کو نظر انداز کرے ہم ترے ساتھ رہیں گے تیرا سایا بن کر
جس کو دیکھا نہیں کبھی ہم نے زندگی اس کے نام ہو جائے

شاعر اپنے عہد سے شکوہ سنج ہے کہ اس میں نہ تو کوئی روشن ضمیر ہے اور نہ کوئی شخص محترم

ہے۔ اس عہد کے لوگوں کا کوئی اصول ہی نہیں ہے حالانکہ آدمی کے وقار کا باعث تو اُس کے اصول ہوتے ہیں۔ اس دور کے تعلق سے اگر یوں کہا جائے تو بجا ہوگا کہ جو لوگ با اصول ہیں ان کا اس عہد میں کوئی وقار ہی نہیں رہا ہے اور جنہیں دنیا و مافیہا کی کچھ خبر ہی نہیں ہے وہی رہبر و رہنما اور میرِ کارواں بنے ہوئے ہیں:

الگ ہو سب سے جو ایسی لکیر کوئی نہیں ضمیر والوں میں روشن ضمیر کوئی نہیں

☆

وہی ہیں محترم جو بے اصول ہیں عرشؔ جو با اصول ہیں اُن کا کوئی وقار نہیں

☆

آدمی کے وقار کا باعث آدمی کے اصول ہوتے ہیں

☆

جو نہیں راستوں کے واقف عرشؔ کارواں کے میر ہوتے ہیں

☆

انقلاب کیا ہوگا اس سے بڑھ کے دنیا میں کارواں کا رہزن ہی میرِ کارواں ٹھہرا

☆

مصلحت کے اس دور میں سب کا چلن مشکوک ہے
کون ہے رہزن کی صورت کون ہے رہبر نہ دیکھ

ایسے حالات میں شاعر آج کی زندگی کی تفسیر پیش کرنے سے قاصر ہے:

آج کی زندگی کی کس طرح تفسیر کروں جس طرح راہ میں کاغذ کا ٹکڑا کوئی

اگر کہیں کسی کا ضمیر بیدار بھی ہو جائے تو بھی اس کی آواز نہایت مدھم اور غیر مؤثر ہوتی ہے بلکہ یوں سمجھ لیں کہ حق گوئی گہرا سکوت پیدا تو کرتی ہے مگر ضمیر کی آواز مدھم ہی رہتی ہے:

جس سے ہو بیدار کسی انساں کا ضمیر وہ آواز نہایت مدھم ہوتی ہے

☆

کتنا گہرا سکوتِ حق گوئی کتنی مدھم ضمیر کی آواز

موجودہ سائنسی اور ٹکنالوجی کے دور میں جس ترقی، خوشحالی، فارغ البالی بلکہ اچھے دنوں کی بات ہورہی ہے، اس کے بارے میں عرش صہبائی نے استفہامیہ مگر شعری پیرائے میں بہت ہی عمدہ بات کہی ہے:

جس میں کلیوں کا خون ہوتا ہو ایسے موسم کو جاں فزا کہیے ؟

چنانچہ موجودہ دور کے انسان کی زندگی پیچیدہ مسائل میں الجھ گئی ہے جس کی وجہ سے اس کے دل اور ذہن میں جوش، تیزی، طراری اور ہنگامہ کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے:

بے طرح جن سے الجھ کر رہ گئی ہے زندگی ایسے پیچیدہ مسائل تو کبھی پیدا نہ تھے

☆

اس دور سے کچھ اور تو حاصل نہیں لیکن انساں کے دل و ذہن میں ہیجان بہت ہے

اس ہیجانی دور میں جو لوگ زندگی جی رہے ہیں شاعر موصوف کے بقول ان کے حوصلے قابلِ داد ہیں:

عرش اس دور میں جو زندہ ہیں کس قدر اُن کے حوصلے ہوں گے؟

زندگی اس کی کیفیت اور اس کے لوازمات سے دنیا کے ہر فرد و بشر کو اپنی اپنی حیثیت سے آخری سانس تک ہر آن مختلف انداز اور اطوار سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ ایک فن کار اور شاعر کی حیثیت سے عرش صہبائی جو کچھ محسوس کرتے ہیں اجمالاً چند اشعار ملاحظہ کریں:

ہر کوئی ہے اپنے کاندھے پر اٹھائے اپنی لاش کیا کہوں مجھ کو یہ منظر دیکھ کر کیسا لگا

☆

اس کے من کی موج ہے وہ کب نکل آئے یہاں رات ڈھلنے کو ہے پھر بھی بند دروازہ نہ کر

☆

وہ گزرا ہی نہیں ان مرحلوں سے اسے کیا علم ہم تنہا ہیں کتنے

☆

اب غاروں میں لوگ بستے ہیں دل میں ظلمتیں ہیں کی نفرتوں

☆

دیکھتے ہی دیکھتے پھیلا ہے یہ صحرا کتنا ہے ویرانی عالم نظر حدِ تا میں دل

زندگی کے طویل سفر میں عرش صہبائی جن صبر آزما مرحلوں کے روبرو ہوئے ہیں ان تجربات کی روشنی میں وہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

عجیب شخص تھا کیا یادگار چھوڑ گیا وہ اپنی یاد کا گردو غبار چھوڑ گیا
مجھے یہ کون سرِ رہگزار چھوڑ گیا میں اک چراغ کی مانند جل رہا ہوں عرشؔ

اور دُنیا میں غمِ حیات سے نبرد آزمائی کرتے ہوئے اپنی بے بسی پر عرش صہبائی یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں:

نہ تیرے بس میں ہے ایسا نہ میرے بس میں ہے غمِ حیات کے تیور بدل سکیں یک سر

☆

اک چمکتی ریت کا دریا رواں ہے دور تک زندگی بس اک حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں

کیوں کہ شاعر موصوف نے اپنے آس پاس زندگی، دریدہ لباس اور حزن و یاس میں گزرتے اور گزارتے دیکھی ہے بلاشبہ انہوں نے اسے اتنا چاہا اور پرکھا ہے کہ اُنہیں اب اس کے بارے میں کوئی بھی غلط فہمی نہیں رہی ہے:

زندگی حزن و یاس میں گزری اک دریدہ لباس مین گزری

☆

زندگی ہم نے تجھے چاہا بہت پرکھا بہت اب کسی بھی بات کی کوئی غلط فہمی نہیں

☆

جس طرح چاہا ہے ہم نے اس طرح چاہے گا کون زندگی تو عمر بھر برہم رہی لیکن تجھے

ایک مرحلے پر شاعر کو ایسا لگتا ہے کہ زندگی ایک خول کی مانند ہے اس لیے انسان کو نہ تو اس کے پس منظر کو دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور نہ اس کے خول میں جھانکنا چاہیے بلکہ انسان کو زندگی کے

حسن کے ہر منظر پر مرمٹ جانا چاہیے یہی زندگی کے لیے حقیقی خراجِ تحسین ہے:

اس کے ہر منظر پر مٹ جا اس کا پس منظر نہ دیکھ
زندگی اک خول ہے اس خول کے اندر نہ دیکھ

شاعر زندگی کو ایک خول سے تشبیہ دے کر انسان کو اس کے اندر جھانکنے کی شاید اس لیے ممانعت کرتے ہیں کہ یہ حصارِ ذات کی مانند ہے جس کی چاروں اطراف میں دیواریں اور یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی دروازہ نہیں ہے:

ہم نکل سکتے بھی تو کیونکر حصارِ ذات سے ۔۔۔ صرف دیواریں ہی دیواریں تھیں دروازہ نہ تھا

عرش صہبائی خدا کی ربوبیت اور اس کے وجود کے فقط اُس کے نام ہی کی وجہ سے قائل ہیں۔ انہیں اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ جب اُس ہستی کا نام ہے تو نہ صرف اُس کا وجود ہے بلکہ اگر اُسے تلاشا جائے تو وہ لازماً ملے گا بھی:

وہ جس کا نام ہے اُس کا وجود بھی ہوگا ۔۔۔ ملے گا لازماً اُس کو اگر تلاش کریں

روح جو انسان کی حیات کا محور و مرکز ہے، کے بارے میں عرش کا عقیدہ ہے:

روح کی کوئی بھی نہیں منزل ۔۔۔ پھر بھی گرمِ سفر سی رہتی ہے

لیکن جب تک انسان زندہ ہے اس کا ذہن بھی برابر سفر میں رہتا ہے کیونکہ ذہن اور روح کا آپس میں گہرا رشتہ ہے:

شکستِ خواب ہو یا خواب کا ہو عالم عرش ۔۔۔ بشر کا ذہن برابر سفر میں رہتا ہے

زندگی ایک رواں دواں سمندر کی طرح ہے جس میں انسان تا حیات ہر آن تلاطم امواج سے معرکہ آرائی کرتا ہوا اپنی منزل کی جانب محو سفر رہتا ہے۔ عرش صہبائی نے مندرجہ ذیل اشعار میں موج، سفینہ، تلاطم اور ساحل کے آپسی رشتے کا کس قدر معنی آفرین تلازمہ پیش کیا ہے:

صرف سفینہ اس سے غافل ہوتا ہے ۔۔۔ ورنہ ہر اک موج میں ساحل ہوتا ہے

☆

کشتی سے تلاطم کا بھی اک رشتہ ہے آخر ۔۔۔ کشتی کو تلاطم میں اُترنا ہے کسی روز

ابھی سے تیز رو موجوں میں انتشار سا ہے
ابھی سفینہ تلاطم سے ہم کنار سا ہے

شاعرِ موصوف کا یقینِ کامل ہے کہ ہر شے سے اللہ کی وحدانیت ہویدا ہے۔

دُنیا کے کرشمات کا خالق بھی وہی عرشؔ
دنیا کے کرشمات کا مظہر بھی وہی ہے

ایک حدیث ہے 'اللہ جمیلٌ یحب الجمال' یعنی اللہ خوبصورت ہے وہ خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ یہاں خوبصورتی سے مراد فقط حسن و جمال ہی نہیں ہے بلکہ حسنِ انتظام، نظم وضبط اور قانون وقاعدہ کی پابندی بھی ہے:

اپنی دھرتی حسین ہے اُن سے
آسماں پر جو چاند تارے ہیں

دھرتی کا حسن چاند تاروں پر ہی موقوف نہیں ہے یہ اگر ڈوب بھی جائیں تو کوئی غم نہیں ان کے غروب ہوتے ہی جب ایک حسین وجمیل سحر نمودار ہوتی ہے تب جا کے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ماہ ونجوم نمودار ہونے والی حسین سحر کا صرف ایک حصّہ تھے قطعی وقار اور اعتبار نہ تھے:

نادان! ان کے ڈوبنے کا اتنا غم نہ کر
ماہ ونجوم یوں بھی وقارِ سحر نہ تھے

دُنیا کا ہر منظر، اس کا پس منظر یہاں تک کہ نیکی اور بدی کی حامل ہر شے جب کائنات کے خالق کے تخلیقی منصوبے کا ایک سوچا سمجھا حصّہ ہے تو پھر وہ حسن و جمال کا مرقّع کیوں نہ ہوگا:

اس کے ہر منظر پر مٹ جا اس کا پس منظر نہ دیکھ
زندگی اک خول ہے اس خول کے اندر نہ دیکھ

کبھی کبھار جب شاعر فن کارانہ انداز میں اس کائنات اور اس کے خالق کے تخلیقی منصوبے پر غور وفکر کرتا ہے تو اس کی زبان خالق کی یکتائی میں رطب اللسان ہوتی ہے:

ذرے ذرے میں سمٹ آئی ہے ساری کائنات
یہ گماں ہوتا ہے بس دُنیا میں تنہا آپ ہیں

انسان اللہ کے تخلیقی منصوبے کی سب سے اہم، مرکزی کڑی اور سب سے اَحسن تخلیق ہے، جسے اَحسن تقویم بھی کہا گیا ہے۔ روزِ محشر میں اس کی ساری عمرِ رفتہ بلکہ یوں کہیے کہ دنیاوی زندگی کے حامل تمام خوب وزشت اعمال کا محاسبہ بھی ہوگا اور حتمی فیصلہ بھی، لیکن اس ضمن میں ایک

صاحبِ بصیرت اور دانشور شاعر کی نگاہ فقط دُنیا تک ہی کیوں محدود رہی اور وہ واقعاتِ عمر رفتہ پر نظرِ ثانی کرنے کے عمل کو الجھن کیوں قرار دیتا ہے جب کہ ایسا کرنا مستحسن ہے:

واقعاتِ عمر رفتہ پر نظر ثانی نہ کر　　　بے طرح ان میں الجھ جائے گا نادانی نہ کر

غالباً عرش صہبائی زندگی کو اس زاویۂ نظر سے اس لیے دیکھتا ہے کہ انسان کا رشتہ ماضی کے مقابلے میں فردا سے زیادہ پیوست ہے اس لیے اُن کے مطابق انسان کو فکرِ فردا کرنی چاہیے:

تو صرف ماضی کے رشتے کو اُستوار نہ کر　　　تری حیات کا فردا سے بھی ہے اک رشتہ

لیکن شاعر کو یقینِ واثق ہے جب کبھی اور جہاں کہیں بھی دار و رسن کی بات ہوگی وہاں ہمارا تذکرہ بھی ضرور ہوگا:

جہاں دار و رسن کی بات ہوگی　　　ہمارا ذکر بھی آئے گا اس میں

عرش صہبائی موجودہ بحرانی دور میں اپنے آپ کے بارے میں جس انداز سے سوچتے ہیں ان اشعار کے مطالعہ سے ان کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

لے کر کوئی عنوان فسانے کے لیے آ　　　میں ایک فسانہ بلا عنوان ہوں اب تک

☆

میں سب کا ہوں لیکن مرا اپنا نہیں کوئی　　　زندہ ہوں میں جب تک یہی انداز رہے گا

☆

لیکن اپنی بات پر ہے اب پشیمانی بہت　　　میں سمجھتا تھا کہ اخلاص و وفا ہیں معتبر

☆

میں ترے شہر سے بے نام و نشاں بھی گزرا　　　باوجود اس کے رہا سب کی نظر کا مرکز

☆

راہ کی دھول ہے اور کچھ بھی نہیں　　　عرش جس پر ہے منزل کا دھوکا تجھے

☆

یاد آتا ہے کہ میری زندگی میں تو بھی تھا　　　دیکھتا ہوں آج میں تنہا کھڑا ہوں راہ میں

اس طرح ہوں دل سے تنہائی میں محو گفتگو	جیسے بیٹھا ہو کوئی دیوانہ دیوانے کے پاس

عرشؔ صہبائی اگر چہ ان نامساعد حالات کے ساتھ ہمیشہ صبر و ثبات کے ساتھ نبرد آزما رہے لیکن جب کبھی صبر کا پیمانہ لبریز ہو کر انہیں یارا نہیں رہتا تو ان کا سمندِ خیال یہ شعری لبادہ اختیار کر لیتا ہے:

میری زباں بھی بند ہو شورشِ حق بھی ختم ہو	اس کا یہی علاج ہے مجھ کو سپردِ دار کر

☆

میں حق گوئی سے خود تنگ آ گیا ہوں	مجھے اس قید سے آزاد کرنا

اور پھر ایک دن ''کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ'' (ہر چیز جو اس زمیں پر ہے فنا ہو جانے والی ہے) کُلیّہ کے مطابق ہم بھی اسی عمل کا حصّہ بن کر داستانِ پارینہ ہو جائیں گے:

آج ہم زندہ ہیں کل مرحوم ہو جائیں گے عرشؔ	اک حقیقت رفتہ رفتہ داستاں بن جائے گی

☆

پھول سے خوشبو کی صورت ہم جدا ہو جائیں گے	یہ بہاریں یہ چمن آرائیاں رہ جائیں گی
ہم مسافر ہیں نکل جائیں گے ہر بستی سے دور	اور ہم کو ڈھونڈتی پروائیاں رہ جائیں گی

☆

خود کو نہ پہچان پائیں گے یہ صورت ہوگی	خشک پتوں کی طرح ہم کو بکھر جانا ہوگا

عرش صہبائی اردو شعر و ادب کا ایک مستند اور معروف نام ہے۔ انہوں نے متحدہ ہندوستان میں آنکھ کھولی، بے لوث محبت اور ہندو مسلم مشترکہ بھائی چارے میں پرورش پائی، برّصغیر کے اردو ماحول میں اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا، ملک کی تقسیم کے خونین ڈرامے کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا، خود تقسیم کا حصّہ بنے، ادب کی بساط اُلٹتے دیکھی، ادب اور ادیبوں کا بٹوارہ ہوتے دیکھا، تفکر، تدبر اور تخلیقِ ادب پر انحطاط، تعطل اور جمود کا کہرا چھائے دیکھا اور پھر آزادی کی ایک نئی صبح کا سورج طلوع ہوا، تعمیر و ترقی کا آغاز ہوا، قدروں اور پیمانوں کے معیار بدل گئے اور ملک کی آزاد فضا میں قوم ترقی کی شاہراہ پر رواں دواں ہو گئی لیکن رشتوں میں ا

تکدّر اور اذہان میں وہ تعصب پیدا ہو گیا کہ عرش صہبائی کو بے اختیار کہنا پڑا:

دل تو کیا چیز ہے ہم روح میں اترے ہوتے — تم نے چاہا ہی نہیں چاہنے والوں کی طرح

لیکن پون صدی بیت جانے کے بعد بھی جب نہ تو کسی نے کسی کو کسی کے روح میں اترتے دیکھا اور نہ کسی نے کسی کو چاہنے والوں کی طرح چاہا تو عرش بے ساختہ پکار اُٹھے:

دل کا لہو نچوڑ نہ فن کی تلاش کر — اس بے شعور دور میں فکرِ معاش کر

ناحق بھٹک رہا ہے کسی کے خیال میں — اس ضد کو چھوڑ اور خود اپنی تلاش کر

کیوں کہ اس جدید سائینس، ٹکنالوجی اور انٹرنیٹ کے دور کے حالات، تجربات، مشاہدات نے شاعر موصوف کو یہ سوچنے اور کہنے پر مجبور کر دیا ہے:

کیا ضروری ہے کہ یہ دُکھ بانٹنے والے بھی ہوں — ملنے والوں سے کبھی ذکرِ پریشانی نہ کر

وقت کے بگڑے ہوئے اطوار کا انداز دیکھ — زندگی کے ہر قدم پر اپنی من مانی نہ کر

شاعر وقت کا نباض ہے اور اسے سرد و گرم کی سب خبر ہے:

اتنا بیدار کہاں اہلِ زمانہ کا شعور — ہر نئی سوچ ابھی راہ کی دیوار سہی

☆

خاموش رہیں گے تو ضمیر اپنا گھٹے گا — حق بات پہ سنگین سزائیں بھی ملیں گی

☆

یہ چاہتا ہے کہ اس دور پر کروں تنقید — وہ شخص قبر میں زندہ اُتارتا ہے مجھے

چنانچہ عرش صہبائی وقت کی نزاکت اور اپنے عہد کے فرد کی حقیقت جانتے ہوئے عافیت اسی میں سمجھتے ہیں:

کس گھاٹ اُترنا ہے مجھے یہ نہیں معلوم — کاغذ کی ہوں اک ناؤ سمندر میں رواں ہوں

☆

درہم و برہم نہ ہو جائے کہیں دل کا سکوں — خواہشوں کی کھڑکیوں سے جھانک کر باہر نہ دیکھ

عرش صہبائی کی شاعری کے بارے میں اپنے اِن خیالات کا اظہار کرتے وقت میں گھریلو مصروفیات کی وجہ سے جموں سے باہر ڈوڈہ ، بھدرواہ، کشتواڑ اور سدھ مہادیو میں مقیم رہا جس کی وجہ سے میں عرش صہبائی کے تمام شعری مجموعوں کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کر سکا اور مجھے اپنی صرف اُن یادداشتوں Notes پر انحصار کرنا پڑا جو میں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ تحریر کرتے وقت تیار کی تھیں۔ بایں ہمہ بحیثیت مجموعی اُن کی شاعری سے متعلق میرا یہ تاثر اُن ہی کے اس شعر میں پنہاں ہے:

آپ کا لہجہ الگ ہے آپ کا انداز اور
ہر کسی کو کب میسّر ہے یہ طرزِ گفتگو

☆☆☆

شیرازہ اردو کی خصوصی پیش کش

معاصر اردو نظم نمبر

اس شمارے میں ریاست کے کہنہ مشق اردو شعرا کے ساتھ ساتھ

نوعمر اور تازہ دم شعرا کی منظومات بھی شامل ہیں

....

ملنے کا پتہ:

کتاب گھر، سرینگر/ جموں/ لیہہ لداخ

☆...... ولی محمد اسیر کشتواڑی

عرشؔ صہبائی کے ابتدائی شعری مجموعے

(ایک سرسری مطالعہ)

جناب ہنس راج ابرول عرشؔ صہبائی ریاست جموں وکشمیر کے ان کہنہ مشق شاعروں میں ایک شیریں بیاں شاعر ہیں جن کی نمایاں شعری خدمات پر اُردو ادب کے پرستار ناز کرتے آئے ہیں۔ اپنے گرانقدر شعری مجموعات کی اشاعت اور ریاستی وملکی سطح کے مشاعروں میں بار بار شرکت کرنے کے طفیل عرشؔ کی شہرت دور دور تک پھیل گئی ہے۔ عرشؔ صاحب کا تخلص ہی اس بات کا آئینہ دار ہے کہ وہ سیاسی حد بندیوں اور انسانوں کی تقسیم سے متنفّر ہیں۔ نصف صدی سے بھی زیادہ اپنے تخلیقی سفر نے عرشؔ کو ایک مقبول عام شاعر بنا دیا ہے اور ان کی دلآویز شخصیت اور ان کا اندازِ تکلّم دونوں موثر اور موقر ہیں۔ وہ قومی یکجہتی اور انسان دوستی کے علمبردار ہیں چنانچہ انہوں نے کہا ہے ؎

عرشؔ جب تک ہندو وُ مُسلم یہاں ہیں متّحد
بال بیکا کر نہیں سکتا کوئی کشمیر کا

عرشؔ صہبائی ابھی دسویں کلاس کے ہی طالب علم تھے کہ انہوں نے باضابطہ شعر گوئی کا آغاز کیا۔ بہت ہی قلیل عرصہ میں ان کا کلام برصغیر ہندوپاک کے اخبارات اور رسائل میں

چھپنے لگا۔ انہوں نے ابتداء ہی سے اپنے کلام کو زیورِ طبع سے آراستہ کرنے کی کامیاب کوششیں فرمائی ہیں۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام ستمبر ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا جس کا نام ''شکستِ جام'' ہے۔ ابتداء میں عرشؔ صہبائی کی شخصیت اور شاعری پر مقتدر تخلیق کاروں کے مختصر تبصرے دیئے گئے ہیں جن سے کلامِ عرشؔ کے محاسن ظاہر ہوتے ہیں۔ تبصرہ نگاروں میں پشور پرشاد منور، ڈاکٹر منوہر سہائے انورؔ، انورؔ علی، علی جوادزیدیؔ، شفاؔ گوالیاری وغیرہ شامل ہیں۔ پروفیسر تلوک چند محرومؔ نے تو سمندر کو کوزے میں بند کرتے ہوئے فرمایا۔

''شکستِ جام'' سے ہر ذرۂ خاک ہوا سرشار صہبائے طرب ناک

ایک سو اٹھائیس صفحات کی ''شکستِ جام'' میں قریب قریب ایک سو دس غزلیں موجود ہیں۔ اگرچہ یہ عرشؔ کی ابتدائی دور کا شعری انتخاب ہے لیکن اس میں شامل کلام کا بیشتر حصہ مقبول عام ہے۔ جام، ساقی، شراب، میخانہ، رند، مستی اور آزادی جیسے روایتی موضوعات کی بھرمار ہونے کے باوجود اندازِ بیان اور خیالات کا نیا پن باعثِ کشش ہیں۔ عرشؔ غزل اور فنِ غزل کے مزاج کو بخوبی سمجھتے ہیں جس کا اعتراف علی جوادزیدیؔ نے بجا طور پر کیا ہے۔

''عرشؔ کا عشق ایک جوان اور صحت مند عشق ہے جو ایک مسکراہٹ پر دُنیا کو نثار کر سکتا ہے۔ اور ایک نظر سے دنیا کا سودا کر سکتا ہے۔ مگر جو کائنات کی اور حقیقتوں اور تلخیوں سے بے خبر نہیں ہوتا''۔

جوشؔ ملسیانی کلامِ عرشؔ کی کچھ اور اہم خوبیوں کا ذکر فرماتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''شگفتہ زمین تلاش کرنے اور مشکل زمینوں میں بھی اچھے اشعار نکالنے میں ان کی کوشش قابلِ ستائش ہے۔ کلام میں عریانی نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی پاکیزہ طبیعت کا رجحان عریاں مضامین سے کوسوں دور ہے۔''

عرشؔ صہبائی بقولِ پروفیسر انورؔ

''اصول فن اور صحت زبان کا بڑا خیال رکھتے ہیں اور فرسودہ مضامین نظم کرنے کے بجائے نئے نئے خیالات کو عمدہ الفاظ کے دلکش لباس میں

جلوہ گر کرتے ہیں۔ ''شکستِ جام'' میں ایک چھوٹی سی نظم ''ادائے سلام'' بھی آخر پر دی گئی ہے جو کافی اچھی اور خوبصورت تخلیق ہے''۔

چہرے سے اپنے گیسوئے مشکیں سنبھال کر
پردے سے اپنا چاند سا مکھڑا نکال کر
بانکی ادا سے ریشمی آنچل اُچھال کر
دیوانہ وار آنکھوں کو آنکھوں میں ڈال کر
کچھ مسکرا کے اور جبیں تک اُٹھا کے ہاتھ
اس نے مجھے سلام کیا کس ادا کے ساتھ

''شکستِ جام'' میں شامل غزلیات سے اخذ کئے گئے حسب ذیل اشعار مشتے نمونہ از خروارے حاضر ہیں۔ آپ بھی ان کا مطالعہ کیجئے اور لطف اندوز ہو جائے۔

- بزم مے سے تشنہ لب ہم تو چلے آئے مگر — ایک آواز شکستِ جام لہراتی رہی
- اس نگاہِ مست کی رنگینیوں کو دیکھ کر — بے خودی میں گردشِ ایام لہراتی رہی
- ہر بار تجھے ساقی رندوں نے دُعا دی ہے — جب عالمِ مستی میں میخانے سے نکلے ہیں
- اے عرشؔ جنہیں ہم سے بے لوث محبت تھی — وہ بھی تو مصیبت میں بیگانے سے نکلے ہیں

●●●

جناب شیخ بھی آئے ہیں اے ساقی زیارت کو
عقیدت ہے انہیں بھی تیرے میخانے سے تھوڑی سی
طبیعت کُنجِ تنہائی میں گو مغموم تھی لیکن
شگفتہ ہو گئی ہے ان کے آجانے سے تھوڑی سی

- وقت کی سب ستم ظریفی ہے — ورنہ انساں برا نہیں ہوتا
- ذکر تیرا بھی کتنا شیریں ہے — اب لبوں سے جدا نہیں ہوتا

بات چھڑتی نہیں گو ان کی بہت مدت تک
ذکر ہوتا ہے تو پھر شام و سحر ہوتا ہے

کچھ ہوتی ہے مئے ناب میں مستی ساقی

اور کچھ تیری نگاہوں کا اثر ہوتا ہے

عرشؔ صاحب کی ''شگفتِ گُل'' جون ۱۹۴۱ء میں منظرِ عام پر آئی تھی جس کا انتساب ہر اس شخص کے نام کیا گیا ہے جسے اُردو زبان سے محبت ہے۔ ۱۲۸ صفحوں پر چھپی ہوئی یہ دیدہ زیب تصنیف ''شکستِ جام'' ہی کی طرح اُردو غزلوں کا ایک عمدہ مجموعہ ہے۔ اس میں تزئین کار اوپی شرما کی بنائی ہوئی خوبصورت تصویریں غزلوں کی وضاحت فنکارانہ انداز میں کرتی ہیں جو مناسب جگہوں پر چھاپی گئی ہیں۔ اس شعری مجموعے میں ۱۲۱ غزلیں اور چند متفرقہ اشعار موجود ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ''شکستِ جام'' کی اشاعت اور اس پر ہوئی تنقید اور تبصروں نے عرشؔ صاحب کے حوصلے کافی بُلند کئے تھے۔ خاص طور پر شکیلؔ بدایونی صاحب کے یہ جملے عرشؔ صہبائی کی غزل گوئی پر کتنے اثر انداز ہوئے ہوں گے جب انہوں نے لکھا تھا کہ:-

> ''جناب عرشؔ صہبائی بہترین غزل گو اور بڑے ہونہار نو جوان ہیں۔ ان کا تغزل کافی نکھرا اور سنبھلا ہوا ہے۔ شگفتگی و رعنائی کے ساتھ گداختگی کی بھی کمی نہیں ہے۔ زندگی کی نقاشی اور کائنات کی عکاسی بھی جلوہ گر ہے۔ عرشؔ صاحب کا مستقبل درخشاں ہے اور حال کی تابنا کی ان کو بہت جلد اعلیٰ مقام پر پہنچائے گی''۔

''شگفتِ گُل''، عرشؔ صہبائی کا دوسرا بڑا تخلیقی کارنامہ ہے جس کے مطالعہ سے اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایک قادر الکلام شاعر اور ہر دلعزیز غزل گو بن گئے تھے۔ ان کے میٹھے میٹھے بول اور ہلکا پھلکا طنز و مزاح عوامی دلچسپی کے عوامل ہیں۔ پہلے کی نسبت اس کلام میں خیالات کی بلندی، جذبات نگاری، سادگی، صفائی، بناوٹ اور فنی مہارت جیسی چیزیں زیادہ اُبھر کر سامنے آتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔ فن کی دُنیا میں جھانکنے کے ساتھ ساتھ اب وہ گرد و پیش پر بھی نظریں دوڑانے لگے ہیں۔ ہر شعر فن کے قالب میں ڈھلتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ نئے نئے نکتے اُبھارے جارہے ہیں۔ ساقی اور جامِ شراب سے ابھی دوستی باقی ہے لیکن زندگی کے دوسرے پہلو بھی انہیں پیشِ نظر رہتے ہیں۔ مثلاً یہ اشعار

● مطلعِ انوار تھی اُن کی نظر مُسکراہٹ مطلعِ ثانی ہوئی
● اِک ستمگر کو ستمگر کہدیا عرشؔ ہم سے سخت نادانی ہوئی
● غم کو نفرت سے دیکھنے والو غم کا بھی اِک مقام ہوتا ہے
● جو محبت میں جان دیتے ہیں اُن کا دنیا میں نام ہوتا ہے
● کرتے نہ انکشافِ محبت کا ہم مگر بے ساختہ زباں پر ترا نام آگیا
● اُن کے بغیر دردِ مجسم تھی زندگی وہ آگئے تو رُوح کو آرام آگیا

● کلی ہو، پھول ہو، شبنم ہو، ذرّہ ہو، ستارہ ہو
نظر والے تجھے ہر رنگ میں پہچان لیتے ہیں

● تمہیں ہم سے محبت ہے تمہیں ہم سے عقیدت ہے
نہیں یہ ماننے کی بات لیکن مان لیتے ہیں

● دیکھئے اپنی ہی کب تک راہ کی تاریکیاں
ہم جلا رہے ہیں آرزوؤں کے دیئے

● اس کو کہتے ہیں محبت اِس کو کہتے ہیں خلوص
ہم نے سینے سے لگائے تُو نے جتنے غم دیئے

● زمانے کا چلن کیا پوچھتے ہو؟ زمانے کا چلن بگڑا ہوا ہے
● خرابی اک ہو تو ہم کہیں بھی یہاں نظمِ چمن بگڑا ہوا ہے

● خود حسن کی فطرت میں ہے جب جلوہ نمائی
پھر کیوں نگاہِ شوق کو الزام ملا ہے

● چھانا کیئے جس کے لئے ہم خاک جہاں کی
دِل ہی میں نہاں اب وہ دِلا رام ملا ہے

☆

عرشؔ صہبائی کا تیسرا شعری مجموعہ ''صلیب'' دسمبر ۱۹۷۱ میں شائع ہوا جس کی ترتیب

جناب مالک رام آنند اور راجن سرحدی نے دی تھی جبکہ اس کا انتساب آر۔ایل چودھری کے نام سے ہوا ہے۔اس مجموعے میں لگ بھگ ایک سو ایک غزلیں شامل ہیں جو زیادہ طویل مگر دل پذیر ہیں۔تیسرے دور کی غزل گوئی کا یہ جاذبِ نظر نمونہ عرشؔ کی فنی پختگی اور نیرنگئ خیالات کا مظہر ہے۔بے باکی اور حق گوئی اب عرشؔ کو کافی پسند ہے۔وہ دِل کی بات دوسروں تک پہنچانے سے نہیں کتراتے۔ ہنستے کھیلتے انسانی سماج کے امراض اور زبوں حالی کے دلدوز مناظر بیان کر کے دعوتِ فکر دیتے ہیں۔انہیں غمِ محبت کے ساتھ ساتھ غمِ زمانہ بھی تڑپانے لگا ہے۔انہیں بدلتی ہوئی قدروں کا بھرپور احساس ہے۔تبھی تو وہ لکھتے ہیں۔

- جس میں خلوص ہے، نہ محبت، نہ زندگی — تعمیر کر رہا ہے بشر اک نیا سماج
- جو ذی وقار اُڑائیں شرافت کی دھجیاں — اُن مجرموں کو دیتا ہے ہر آسرا سماج
- ہائے کیا کیا نقش تھے جو مٹ گئے — ہائے وہ دُنیا جو زیرِ خاک ہے
- عشق کیا ہے؟ اک بحرِ بیکراں — حُسن کیا ہے؟ اِک مُشتِ خاک
- کوئی مُشکل نہیں دنیا میں جو آسان نہ ہو — عزمِ راسخ ہو تو پتھر بھی پگھل سکتے ہیں
- میں تو ہوں منزلِ دشوار ترین کا راہی — سامنے آئیں مرے ساتھ جو چل سکتے ہیں
- ہر دور میں تاریخ انہیں یاد کرے گی — جو حق کے لئے سارے زمانے سے لڑے ہیں
- دِل میں ضیا بار تیرا داغِ تمنا — صد شکر کہ محفل میں کوئی شمع جلی ہے

''یہ جھونپڑے یہ لوگ'' عرشؔ صاحب کا چوتھا مجموعۂ کلام ہے جو سائز تزئین اور مواد کے اعتبار سے اول الذکر تینوں مجموعوں سے مختلف ہے۔۱۲۰ صفحوں پر ۲۹ نظمیں اور ۱۳۱ قطعات شائع ہوئی ہیں۔اس تصنیف کی پہلی اشاعت دسمبر ۱۹۷۶ میں ہوئی تھی جو منظومات اور قطعات کے دو بڑے حصوں میں منقسم ہے۔ان نظموں کے عنوانات مثلاً سقراط، نعمتِ مخصوص، احساس، انجام، یادِ دِل، یادِ رفتہ، میں بنگلہ دیش ہوں، ٹیگور کے نغموں کی دھرتی ہوں، سرزمینِ وطن، ہم لوگ، الیکشن نامہ، یہ جھونپڑے یہ لوگ وغیرہ سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عرشؔ صاحب نے مختلف اہم اور نازک موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔یہ نظمیں شاعر کی زبان دانی، فنی چابکدستی

اور اعجاز بیان جیسے اوصافِ سخن کی دلالت کرتی ہیں۔ منظرنگاری کے ساتھ جذبات نگاری کا فن نمایاں طور پر سامنے آگیا ہے۔ عرشؔ اپنے اندر کی بات لوگوں تک پہنچانے میں کافی حد تک کامیاب نظر آرہے ہیں۔ زیرِ بحث مجموعے نے اپنا نام عرشؔ صہبائی کی ایک نظم سے لیا ہے جو کہ ایک قافیہ بند نظم ہے اور جس میں ملک کے مفلس اور بے خانماں لوگوں کی حالتِ زار کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ مذکورہ نظم کے کچھ شعر اس طرح ہیں۔

یہ جھونپڑے بھی عجیب ہیں کہ جن میں شام وسحر خوشی کا ذکر نہیں راحتوں کا نام نہیں
بڑا کثیف اندھیرا ہے اُن کی قسمت میں کوئی بھی دن نہیں ایسا جو مثلِ شام نہیں
یہ بے بسی یہ نحوست یہ یاسیت کہ یہاں عروسِ سرخوشی آتے ہوئے جھجکتی ہے
عجب گھٹن ہے عجب زہر سے فضاؤں میں حیات اپنے مقدر پہ ہاتھ ملتی ہے
کہیں کہیں کوئی آوازِ حق اُبھرتی ہے کہیں کہیں کوئی مدھم چراغ جلتا ہے

نظم ''ہم لوگ'' میں عرشؔ نے اپنے سماج اور اس میں رہنے والے لوگوں کا بے باکانا انداز میں پردہ چاک کیا ہے۔ بداعمالی، بداخلاقی، تخریب کاری اور چور بازاری کا خصوصی تذکرہ کرتے ہوئے شاعر اپنے آپ کو اس دلدل میں دھنسا ہوا تصوّر کرتا ہے۔

- اعمال بدانجام میں مسرور ہیں ہم لوگ اخلاق کی منزل سے بہت دور ہیں ہم لوگ

نظم ''سقراط'' میں حق گوئی کے خطرناک نتائج بیان کرتے ہوئے حقیقت بیانی کے عزم کو دہرایا گیا ہے۔ ''احساس'' میں ان اہم جذبات کی عکاسی ہوتی ہے جو ہر خاص وعام کے دِل ودِماغ پر چھائے رہتے ہیں۔

- زخم بھی وہ کہ جنھیں دیکھ کے صرف ایک نظر دِل کا مذکور ہی کیا روح لرز جاتی ہے

(سقراط)

- اس کی رحمت کا شکریہ لیکن شاد ہو کر بھی ہم رہے ناشاد
- تنگ دستی ہے فاقہ مستی ہے رنگ لائی ہے کثرتِ اولاد

(جانِ وفا)

- میں بھی کتنا دیوانہ تھا — میں نے بھی کیا خواب بُنے تھے
- جو کانٹے بن کر اُلجھے ہیں — دامن میں وہ پھول چُنے تھے

(انجام)

- تُجھ کو رغبت مرے شعر و سخن سے لیکن — تو مری گردشِ تقدیر سے آگاہ نہیں
- تُو نے چاہا ہے کہ تعمیر ہو اِک تاج محل — میں اِک شاعرِ مفلس ہوں شہنشاہ نہیں

(خواب)

عرشؔ صہبائی ایک بلند پایہ غزل گو شاعر تو ہیں ہی مگر ان کے قطعات بھی کوئی کم نہیں ہیں۔ ''یہ جھونپڑے یہ لوگ'' میں ان کے قطعے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں لیکن یہاں انہیں قارئین کرام کے لئے بارگراں نہ بناتے ہوئے صرف چند قطعات درج کئے جاتے ہیں۔ عرشؔ کس انداز میں اپنی فنی مہارت اور نازک خیالی کے جوہر دکھاتے ہیں۔ آپ خود ہی جانچ سکتے ہیں۔

- بے نواؤں کو، بے سہاروں کو — چاک زخمِ جگر کے سینے دو
- یہ تقاضا ہے آدمیت کا — خود جیو، دوسروں کو جینے دو

☆

- اتفاقاً اگر کوئی کم ظرف — برسرار اقتدار آتا ہے
- اختیارات کے نشے میں وہ — اپنی اوقات بھول جاتا ہے

☆

- اے محبت ! تیرے فقیروں کو — عظمتِ تخت و تاج کیا معنی؟
- مست ہیں اپنے حال میں جوانیاں — ساری دُنیا کا راج کیا معنی؟

''اسلوب'' عرشؔ صاحب کی غزلوں کا پانچواں اور خوشنما مجموعہ ہے جو فروری ۱۹۹۱ میں شائع ہوا تھا۔ اس کی ترتیب کرشن نندہ کرشنؔ نے دی ہے اور انتساب برادر اکبر وِدیا پرکاش ابرول کے نام ہوا ہے۔ اول الذکر مجموعات میں شامل غزلوں کے مقابلے میں ''اسلوب'' کی غزلیں زیادہ صاف، پُرکشش اور اچھی ہیں۔ چھوٹی بڑی بحروں میں لکھی گئیں ۵۵ غزلیں ایک سو بیس

صفحات کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ روایتی غزل لکھتے لکھتے جدت سے ہمکنار ہوئے ہیں۔ گُل وبُلبل کی شاعری سے ہٹ کر ظاہری اور باطنی دُنیا کے حالات ہنرمندی سے بیان کر کے عرشؔ دورِ جدید کے ایک سربرآوردہ غزل گو کی حیثیت سے اُبھر کر عوام کے سامنے آگئے ہیں۔ فصاحت اور بلاغت پسندی کے ساتھ ساتھ سہل ممتنع کی کثرت بھی قابل توجہ ہے۔ عرشؔ کی شاعری پر سرسری نظر ڈالنے سے کچھ بھی سمجھ نہیں آتا بلکہ ایک دو شعر پڑھو تو چونک اُٹھو گے۔ یہی ان کے خیالات کی گہرائی اور ہمہ گیریت کی دلیل بھی ہے۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

- نہ مٹ سکے کسی صورت بھی میرے دِل کے شکوک
  تری نگاہ نے کی ہیں وضاحتیں کیا کیا
- یہ آرزو ہے کہ ان میں ہو کوئی تُجھ جیسا
  نظر میں گھومتی ہیں صورتیں کیا کیا
- جب نظر نہیں آتا آگ کا نشان کوئی
  زندگی کا ہر منظر کیوں دُھواں دُھواں ٹھہرا
- اک نہ اک مصیبت کا ہم کو قرب حاصل ہے
  اور ہم کو ڈھونڈتی ویرانیاں رہ جائیں گی
- مِثل نغمہ ہم فضا میں جذب ہو جائیں گے عرشؔ
  گنگناتی، گونجتی شہنائیاں رہ جائیں گی
- وقت کے بگڑے ہوئے اطوار کا انداز دیکھ
  زندگی میں ہر قدم پر اپنی من مانی نہ کر
- کشتی وطوفان کے اک نازک رشتے کو سمجھ
  حلقہ طوفاں میں رہ کر اپنی من مانی نہ کر

عرشؔ صاحب کا چھٹا شعری مجموعہ ''ریزہ ریزہ وجود'' فروری ۱۹۹۵ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا تھا۔ جس کا انتساب راجن سرحدی اور رمیش کھوسلہ امید کے نام ہوا ہے۔ ۱۲۸ صفحوں

پر پھیلی ہوئی اس تصنیف میں ۳۳ غزلیات، ۱۴ منظومات، ۲۲ قطعات اور جاوید وششٹ کا تحریر کردہ مضمون ''مغنیٔ حیات عرشؔ صہبائی'' پڑھنے کو ملتے ہیں۔ ان تخلیقات سے عرشؔ صاحب کی شیریں بیانی اور شعر گوئی پر قابلِ رشک قدرت قاری کو متاثر کرتی ہے۔ عرش فن کی باریکیاں بخوبی جانتے ہیں اور تخلیقی عمل میں ان کا بھرپور خیال رکھتے ہیں۔ اس مجموعے میں کئی نظمیں پرانے مجموعات سے لی گئی ہیں۔ انہوں نے ریزہ ریزہ وجود میں اپنے اکثر مقبول عام اشعار دوبارہ شامل کرکے لوگوں کی یادداشت کو تازہ کیا ہے۔ عرش صاحب کو آبروئے غزل کا اعزاز بخشتے ہوئے شررؔ فتح پوری نے کیا خوب فرمایا ہے۔

''اس دور میں آپ غزل کی آبرو ہیں اور اپنے اسلوب کے واحد تخلیق کار۔''

عرشؔ صاحب کے فکرِ جدید کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ان کی غزلوں سے چُنے گئے ان خوبصورت شعروں پر غائر نظر ڈالئے اور غور کیجئے

● ماضی نے کر دیا مجھے حال کے سپرد — فردا ہی جانتا ہے میں کس کی اساس ہوں؟
● اے عرشؔ بن سکا نہ کبھی میں زمانہ ساز — اِتنا ضرور ہے کہ زمانہ شناس ہوں
● اب تک سمجھ نہ پائے دل کے مزاج کو ہم — وہ روبرو ہیں پھر بھی تنہائیاں بہت ہیں
● نظروں پر منحصر ہے کیا کیا سمیٹ پائیں — بکھری ہوئی فضا میں رعنائیاں بہت ہیں
● اِک مذہب کے نام پر یہ ہل جاتی ہیں — کہنے کو مضبوط بڑی تعمیریں ہیں
● سب کے ساتھ ہے کوئی نہ کوئی مجبوری — ہر اِک کے پاؤں میں کچھ زنجیریں ہیں
● اس میں تیرا پرتو نظر آیا ہے سراسر — دنیا میں جسے تیرے حوالے سے ملے ہیں
● خود سے جو ملے ہیں تو یہ احساس ہوا ہے — مدت میں کسی چاہنے والے سے ملے ہیں

''ریزہ ریزہ وجود'' کی منظومات میں سے اکثر نظمیں عرشؔ صہبائی کے پہلے شائع شدہ مجموعات سے لی گئی ہیں اس لئے یہاں پر ان کی بات دہرانا موزوں نہیں ہے۔ البتہ نظم ''نہیں ایسا نہیں ہوگا''، جموں کے ۱۳ جنوری ۱۹۸۹ء کے ایک دلدوز واقعہ سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی۔ اس لئے یہ پہلی بار کسی کتاب میں آئی ہے۔ اس نظم سے پتہ چلتا ہے کہ عرشؔ مذہبی تعصبات سے ن

صرف نفرت کرتے ہیں بلکہ وہ انہیں جڑ سے اُکھیڑنے کے لئے جدوجہد کرنے کے خواہشمند بھی ہیں۔ مذکورہ نظم کے یہ منتخب اشعار میری باتوں کی تصدیق کرتے ہیں۔

● بزرگو، نوجوانو ہم جلیسو اور وطن والو
جنون کے دائرے کو توڑ کر باہر نکل آؤ

● تُمہیں گھیرے ہوئے ہے آہنی دیوار ظُلمت کی
دِلوں میں یہ نفرت و کینہ، نگاہوں میں حقارت سی

● نہ جانے کس طرح تُم کو سکون ملتا ہے وحشت میں
بہاتے ہو لہو تم دوسروں کا یہ بھی سوچا ہے؟

● تمہارے جسم کے حصّے ہیں جن کو کاٹتے تُم ہو
تُمہارا ہی لہو ہے یہ جس کو چاٹتے تُم ہو

● اُٹھو اِن پستیوں سے اور اُس مذہب کو اپناؤ
جسے انسانیت کہتے ہیں جو سب سے مُقدس ہے

عرشؔ صاحب نے زیر بحث تصنیف میں چیدہ چیدہ اور خوبصورت قطعات کی ایک اچھی سوغات بھی شامل کی ہے۔ مختلف نکتے فنکارانہ انداز میں اُبھارتے ہوئے وہ فرماتے ہیں۔

● تلخ ہوتا ہے جامِ غم لیکن
پینے والے اِسے بھی پیتے ہیں
ہم نے سیکھا ہے یہ محبت میں
دوسروں کے لئے بھی جیتے ہیں

● راہ گیروں کی پوچھتے کیا ہو؟
ہم فقیروں کی پوچھتے کیا ہو؟
مٹّی مٹّی سی کچھ لکیریں ہیں
اِن لکیروں کی پوچھتے کیا ہو؟

● جس کو کہتے ہیں دوستی کا فرض
بھول کر بھی ادا نہیں کرتی
وہ طوائف ہے عرشؔ یہ دُنیا
جو کسی سے وفا نہیں کرتی

''ریزہ ریزہ وجود'' کے بعد بھی عرشؔ صہبائی صاحب کے گیارہ اور شعری مجموعے چھپ کر آئے ہوئے ہیں جو 'اساس'، 'نایاب'، 'خدوخال'، 'دسترس' ''تُجھ بن کہاں چین''، 'توازن'، 'عکسِ جمال'، 'خوشبو تیرے بدن کی'، 'سائے تیرے یادوں کے'، 'دِل کے خواب'

ادھورے اور 'آگہی' کے ناموں سے شائع ہوئے ہیں۔ اُن کے پاس اور دو کتابوں کا مواد تیار ہے جن میں سے ایک نیا شعری مجموعہ بھی ہے جس کا نام تیرا ''زیرِ لب تبسّم'' ہے۔ دوسری کتاب اُن کے لکھے ہوئے لطیفوں کا مجموعہ ہے۔ ان شعری مجموعات کے علاوہ عرشؔ کی دو تالیفات بھی ہیں جو ''انجم کدہ'' اور ''یہ جانے پہچانے لوگ'' ہیں۔ عرشؔ صاحب کی شخصیت اور شاعری سے متعلق محققین نے چار کتابیں مرتب اور طبع کی ہیں جن کے نام اس طرح ہیں۔

۱۔ عرشؔ صہبائی شخصیت اور شاعر ۔ از پروفیسر شاذ شرقی
۲۔ اُردو غزل کی عہد ساز شخصیت ۔ کوشل کرن ٹھاکور
۳۔ عصری آگہی کا شاعر ۔ غلام جیلانی
۴۔ آبروئے سخن عرشؔ صہبائی ۔ ڈاکٹر وِدو بھوشن رینہ

عرشؔ صہبائی کو کئی ہندی، اُردو اور پنجابی کی ادبی تنظیموں نے انعامات اور اعزازات سے نوازا ہے۔ ریاستی کلچرل اکیڈمی نے بھی اُن کے تین مجموعہ اشعار۔ ''شگفتِ گل''، 'اسلوب'' اور ''ریزہ ریزہ وجود'' کو بہترین کتابوں کے ایوارڈ دیئے ہیں۔

عرشؔ صہبائی اس وقت ہماری ریاست خاص کر جموں صوبے کے بزرگ ترین اُردو شاعر شمار ہوتے ہیں۔ اُن کا تخلیقی سفر شد و مد سے ہنوز جاری ہے اور وہ مشاعروں میں بھی برابر شریک ہو کر اُن کی زینت بڑھاتے ہیں۔ وہ ڈوگری میں بھی شعر کہتے ہیں اور ریڈیو کشمیر جموں سے نشر ہونے والے اُن کے گیت کافی مقبول ہیں۔ مگر عرشؔ کو اُردو شاعری سے ہی زیادہ عشق ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ۔

عرشؔ مجھ کو ڈوگری بولی بھی ہے بے شک عزیز
مگر اُردو زباں کی اور ہی کچھ بات ہے

☆☆☆

☆......ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

عرشؔ صہبائی کی شاعری کی فکری جہات

شاعری پہلی فرصت میں آہنگ کی متقاضی ہوتی ہے۔ اوزان اور بحور کی مکمل واقفیت کے بغیر شاعری نامکمل اور ناممکن ہے۔ فصاحت و بلاغت اس کے بعد کی ضرورتیں ہیں۔ اسی لئے شاعری اور موسیقی کے مابین گہرا ربط پایا جاتا ہے۔ احساسات و جذبات جب نغمگی اور سُر تال میں ڈھلتے ہیں تو سننے والوں کے دلوں میں ہلچل سی پیدا کرتے ہیں۔ شاعر بننے کیلئے طبیعت کا موزوں ہونا نہایت ضروری ہے۔ ایک آدمی شاعری کا ذوق و شوق رکھتا ہے لیکن شاعری کے مقتضیات سے واقف نہیں تو ہرگز شاعر نہیں بن سکتا۔ شاعری ایک نازک فن ہے، علم عروض سے ناواقفیت بڑے بڑے خودساختہ شاعروں یا متشاعروں کو چاروں شانے چت کرتی ہے۔

شعر و ادب کی دنیا سے جڑے کچھ لوگ جب اپنے اصلی نام کے بدلے قلمی نام کا استعمال کثرت سے کرنے لگتے ہیں تو یقین کیجئے ان کا اصلی نام دب سا جاتا ہے۔ عرشؔ صہبائی کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

عرشؔ صہبائی نہ صرف ریاست جموں و کشمیر بلکہ بیرون ریاست کے ادبی و شعری حلقوں میں بھی کافی معروف و مقبول ہیں۔ اُن کی شاعری میں انسانی قدروں، صحت مند روایتوں اور روح کی پاکیزگی کا درس بڑے پُر لطف انداز میں ملتا ہے۔ بے باکی، حق گوئی، منکسر المزاجی اور صداقت پسندی کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ عرشؔ صہبائی کے ان اشعار پر دھیان دیجئے:

- وہ کبھی پاؤں کی ٹھوکر سے نوازے مجھ کو — لیکن افسوس میں راہ کا پتھر بھی نہیں
- آج کے دور کی روایت ہے — ایک چہرے پہ دوسرا چہرہ
- زمانے میں انھی سے ہے وقارِ زندگی قائم — جو خوش اخلاق ہوتے ہیں، جو خوش کردار ہوتے ہیں
- ہم پہ جب وقت پڑا نکلے پرائے چہرے — ہم سمجھتے رہے برسوں جنہیں اپنے چہرے
- آج انسان کی پہچان بڑی مشکل ہے — آج انسان ہے اوڑھے ہوئے کتنے چہرے

عرشؔ صہبائی ایک کہنہ مشق اور بالیدہ ذہن شاعر ہیں۔ رومانیت، ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت جیسے تمام فکری رجحانات کو انھوں نے دیکھا، سمجھا اور محسوس کیا ہے لیکن انہوں نے اپنے آپ کو کسی ایک ادبی وشعری تحریک یا رجحان تک محدود نہیں رکھا۔ اردو کے قد آور شعراء مثلاً.....فراقؔ گورکھپوری، ساحر لدھیانوی، عرشؔ ملسیانی، میلا رام وفاؔ، منور لکھنوی اور جوشؔ ملسیانی کے ساتھ انھوں نے مشاعرے پڑھے ہیں۔ عرشؔ کے شعری مجموعوں کی تعداد 17 تک پہنچ چکی ہے۔

عرشؔ صہبائی کی غزلوں کے بہت سے اشعار ضرب المثل کا درجہ رکھتے ہیں۔ دراصل انھوں نے روایتی وجدید شاعری کے ایسے نمونے پیش کئے ہیں جو انہیں اردو شاعری کی دنیا میں ایک منفرد مقام ومرتبے پر فائز کرنے کیلئے کافی ہیں۔ سوز گداز کے ساتھ غمِ جاناں اور غمِ دوراں، حالات کی ستم ظریفیوں کے باوجود خندہ پیشانی، زندہ ضمیر کی زندہ آواز، امن وسلامتی اور خیر خواہی کی تمنا، انسان کی بے بسی، ہجر ووصال کا سلسلہ، یادِ ماضی کی کسک اور زوال پذیر انسانی اقدار و روایات کا نوحہ ایسے موضوعات ہیں جو عرشؔ صہبائی کی شاعری کا حصہ بنے ہیں۔ انھوں نے زندگی کی تلخیوں کا زہر پیا ہے، موت وحیات کی سختیوں کو دیکھا ہے اور سمجھا ہے۔ علاوہ ازیں سب سے بڑی بات یہ کہ خوب سے خوب تر کی جستجو انہیں بے تاب رکھتی ہے۔ یہی جستجو ان سے ایسے اشعار کہلواتی ہے جو مبنی بر حقیقت اور پُر لطف ہوتے ہیں۔ مثلاً ان کے مندرجہ ذیل اشعار بطورِ مثال پیش کئے جاتے ہیں، ملاحظہ کیجئے۔

- دل تو کیا چیز ہے ہم رُوح میں اُترے ہوتے — تم نے چاہا ہی نہیں چاہنے والوں کی طرح

- ہزاروں سال دہراتی ہے دنیا جس کے افسانے
وہ خود انساں نہیں انسان کا کردار ہوتا ہے
- جو دل سے ہوتے ہیں انسانیت کے دیوانے
تمام عمر وہ محوِ نماز ہوتے ہیں
- نہیں آج کے دور میں کامیاب
محبت، عقیدت، وفائیں اصول
- زرد چہرہ، تشنہ لب، افسردہ دل، ویراں خیال
زندگی کی کس قدر بے رنگ تصویریں ملیں
- ان کی آنکھوں میں وہ شوخی، وہ شرارت، وہ ہنسی
جیسے بکھرے ہوں فضاؤں میں سنہرے بادل
- فکرِ ماضی، فکرِ فردا، فکرِ حال
سو طرح کا رنج دامن گیر ہے

مندرجہ بالا اشعار اپنے معنی و مفہوم اور شعری انسلاکات کی بنیاد پہ شاعر کی ان فکری جہات کو آشکار کرتے ہیں جن کا تعلق زندگی اور لوازماتِ زندگی سے ہے۔ پہلے شعر میں شاعر کا خلوصِ وفا دیکھئے کہ وہ چاہتوں کے سلسلے کو دل تک محدود نہیں رکھتا بلکہ روح کی گہرائیوں میں اُترنے کو تیار ہے۔ بہ شرط یہ کہ چاہنے والا بھی مخلصانہ رویّے کے ساتھ آدابِ محبت سے بخوبی واقف ہو۔ میں اگر یہاں عرشؔ صہبائی کے اس شعر کے حوالے یہ کہوں کہ ان کا یہ شعر ان کی کئی غزلوں پہ حاوی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ دوسرے شعر کا تعلق ایک ناقابلِ تردید حقیقت سے ہے، یہی سچ ہے کہ آدمی اس دنیا میں اپنے اچھے اور برے کردار سے یاد رکھا جاتا ہے یعنی مثبت و منفی کردار عوام کیلئے ایک مثال بن جاتا ہے، گویا شاعر ہمیں یہاں اچھے کردار سازی کا درس دیتا ہے۔ تیسرے شعر سے یہ عیاں ہو رہا ہے کہ تمام عبادتیں انسان کو انسانیت سکھاتی ہیں اور انسانیت کی خوشبو اگر کسی آدمی میں نہیں ہے تو وہ انسان نہیں۔ چوتھے شعر میں عمل صالح پر زور دیا گیا ہے، یعنی یہ دنیا میدانِ عمل ہے اس لئے نیک اعمال کرتے چلو اسی میں تمہاری خیر ہے۔ پانچویں شعر میں انسانی اقدار کے فقدان کی طرف اشارہ ہے۔ چھٹے شعر میں شاعر نے زندگی کی پیکر تراشی بڑے خوبصورت الفاظ میں کی ہے۔ گویا شاعر کو ذاتی اور اجتماعی زندگی میں یاس و حسرت، ناکامی و محرومی اور مایوسی و اُداسی کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا۔ ساتویں شعر میں شاعر نے اپنے پری پیکر محبوب کا ذکر تشبیہاتی انداز میں کیا ہے اور خوب کیا ہے۔ آٹھویں شعر میں بھی زندگی کو ہی موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ تمام اشعار اور ان اشعار کے علاوہ بھی عرشؔ صہبائی دیگر شعری اصناف میں ہمیں وہ

خوبصورت زندگی کی تشکیل وتعمیر اور مقصدِ حیات و کائنات کے اسرار و رموز سے متعلق مکالمہ کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ عرشؔ صہبائی ایک بڑے شاعر ہیں جس کا اعتراف اُن کے معاصرین تو کر چکے ہیں، جدید نسل کے شعرا بھی کر رہے ہیں۔ بڑا شاعر وہی ہوتا ہے جو حیات و کائنات پہ گہری نظر رکھتا ہو، جس کے پاس تخیل کی بلندی اور وسیع فکری دائرہ ہو۔ جو شعری جمالیات سے پوری طرح آگاہ ہو۔ عرشؔ صہبائی نہ صرف غزل کے شاعر ہیں بلکہ انھوں نے دیگر اصناف میں بھی اپنی شاعری کے اچھے نمونے پیش کئے ہیں۔ ہاں یہ بات طے ہے کہ دوسری شعری اصناف کے مقابلے میں ان کا زیادہ تر شعری سرمایہ غزل کی صورت میں ہے۔ اقبال انصاری نے عرشؔ صہبائی کو زندگی کا شاعر گردانا ہے وہ ایک جگہ رقمطراز ہیں:

''عرشؔ صہبائی کے جہانِ شاعری سے گزرتے ہوئے بار بار یہ محسوس ہوتا ہے کہ زندگی از خود فن بن کر ان کی شاعری میں سما گئی ہے۔ ایک چھوٹے سے شعر کی وضاحت دیکھئے۔ جیسے اس نے عالم ہست و بود کا احاطہ کر لیا ہو۔

- حادثوں کی یورشوں میں کم جیئے پھر بھی جن لوگوں میں تھا دم خم جیئے

دوسرے مصرعے کی ردیف ''جیئے'' کس قدر بلیغ ہے۔ یہ حوصلہ مند طرزِ حیات کا آئینہ ہے، جدوجہد کی طویل داستان ہے کچھ اسی قبیل کا یہ شعر دیکھئے:۔

سیج پھولوں کی ضروری نہیں جینے کیلئے
جو سلیقہ ہو تو کانٹوں پہ بھی کٹ جاتی ہے

فصاحت کے ایک لفظ ''سلیقہ'' نے کس سلیقے سے خود کو زندگی کا راہنما کر دیا۔ یہ شعر.........

آج ہم زندہ ہیں کل مرحوم ہو جائیں گے
اک حقیقت رفتہ رفتہ داستاں بن جائے گی''

عرشؔ صہبائی میں خداداد شعری صلاحیتیں موجود ہیں۔ ان کا اس بات پہ ایقان ہے کہ بہترین شاعری انسان سے اس کا خونِ جگر مانگتی ہے۔ فن سیکھنا پڑتا ہے۔ کسی کامل استاد کی تربیت

میں رہنا پڑتا ہے، پھر کہیں جا کر آدمی شاعر بنتا ہے، عرشؔ صہبائی چونکہ سخن شناس ہیں اس لئے جب کسی مشاعرے میں کوئی نا آشنائے شعروسخن بے وزن شعر پڑھتا ہے تو انہیں روحانی اذیت پہنچتی ہے۔ وہ دادو تحسین کے قائل نہیں ہیں۔ ان کا ایک شعر یہاں بطورِ خاص اس لئے پیش خدمت ہے کہ یہ شعران کے شعری جنون کی بہتر غمازی کرتا ہے، شعر ملاخطہ کیجئے............

اگر میں خدمتِ شعروسخن میں محو ہوں عرشؔ
مرے لئے یہ عبادت ہے، کاروبار نہیں

☆☆☆

☆ شیرازہ اردو اور ہمارا ادب میں اشاعت کے لئے اپنی نِگارشات صاف صاف اور کاغذ کے ایک ہی طرف لکھ کر ارسال کریں۔ تبدیلی پتہ یا فون نمبر بدلنے کی صورت میں ہمیں مطلع کرنا نہ بھولیں۔ (ادارہ)

☆☆☆

☆......ڈاکٹر پریمی رومانی

غزل کے منفرد شاعر - عرشؔ صہبائی

شاعری مجھ کو نہ کیوں کر ہو دِل و جاں سے عزیز
عرشؔ یہ نصف صدی کی ہے عبادت میری

عرشؔ صہبائی کا شمار ریاست جموں و کشمیر کے معتبر شعراء میں ہوتا ہے۔ اُنہوں نے کم و بیش ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی لیکن غزل سے اُنہیں فطری لگاؤ ہے۔ انہوں نے اس صنف سخن میں اپنے اسلوب کو تازہ کاری سے نئے رنگ بھر دیئے ہیں۔ اُن کی مادری زبان ڈوگری ہے۔ اس زبان میں بھی انہوں نے وقتاً فوقتاً خامہ فرسائی کی ہے اور گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ لیکن اُردو زبان سے اُنہیں والہانہ عقیدت ہے۔ اپنے ایک شعر میں اس بات کا کھل کر اظہار کرتے ہیں۔

عرشؔ مجھ کو ڈوگری بولی بھی ہے بے شک عزیز
ہاں مگر اُردو زباں کی اور ہی کچھ بات ہے

عرشؔ اُردو زبان سے والہانہ عشق رکھتے ہیں۔ حالانکہ اُن کے خاندان میں اُردو شعر و ادب کی کوئی روایت موجود نہیں تھی لیکن اسکول میں قابل اساتذہ کی حوصلہ افزائی سے اُن میں لکھنے پڑھنے کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اکثر اسکول میں بیت بازی کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں اور عرشؔ ان محفلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔ اُن کی شاعری کو مزید توسیع دینے میں استاد جوشؔ ملسیانی کا کافی ہاتھ رہا ہے جنہوں نے ابتداء میں عرشؔ کو فن کے رموز سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد عرشؔ اپنی محنت، لگن اور خدا داد صلاحیت سے ترقی کی طرف گامزن ہوئے اور جلد ہی استادِ

نامدار نے انہیں فارغ الاصلاح قرار دیا اور اس بات کی تصدیق کی کہ عرش شگفتہ اور مشکل زمینوں میں اشعار کہنے کا خاص گُن رکھتے ہیں۔ حضرت جوش ملسیانی ایک جگہ کہتے ہیں:

''شگفتہ زمین تلاش کرنے اور مشکل زمینوں میں بھی اچھے اشعار نکالنے میں ان کی کوشش قابلِ ستائش ہے۔ کلام میں عریانی بھی نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی پاکیزہ طبیعت کا رجحان عریاں مضامین سے کوسوں دور ہے۔''

عرش نے جو زمانہ دیکھا وہ ہندوستان میں اتھل پتھل کا زمانہ تھا۔ ہندوستان انگریزوں کے چنگل سے آزاد ہوگیا تھا لیکن انہوں نے اپنی شاطرانہ چالوں سے اس کے دو ٹکڑے کیے۔ لوگوں کو مذہب کے نام پر بانٹ دیا جس کا خمیازہ عوام ابھی تک بھگت رہی ہے۔ عرش نے اپنا بچپن سرحدی علاقے باختن میں گزارا جہاں روز افزوں جنگ کے حالات رونما ہوتے تھے۔ بے چینی اور بے یقینی ہر طرف نظر آتی تھی۔ یہ تمام چیزیں عرش کے دِل و دماغ پر شروع سے ہی مرتسم ہوئی تھیں۔ وہ تلملا اُٹھتے تھے اور گہری سوچ میں ڈوبے رہتے تھے۔ باختن کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے اپنے منظوم جذبات پیش کرتے ہیں:

- تو نے رنگین بہاروں سے نوازا سب کو — میرے حصے میں مگر یادِ خزاں تک بھی نہیں
- ڈھونڈتے ہی رہ گئے ہم راحتوں کے سلسلے — زندگی میں ہر قدم پر غم کی زنجیریں ملیں
- پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے رقص کرے — حُسن کے پاؤں میں گھنگرو نہیں دیکھے جاتے

عرش صہبائی کے متعدد شعری مجموعے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ ان شعری مجموعوں میں عرش کے رنگارنگ تجربات سامنے آتے ہیں اور ان تجربات میں شامل ہونے سے قاری ایک عجیب قسم کی گداختگی محسوس کرتا ہے۔ ''یہ چھونپڑے، یہ لوگ'' عرش کی نظموں کا مجموعہ ہے اور ''تجھ بن چین کہاں'' میں اُن کے دوہے ملتے ہیں، جن کی اہمیت مسلم ہے۔ کیونکہ عرش ایک فطری شاعر ہیں اور ان تمام اصناف پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ لیکن صنف غزل سے اُنہیں والہانہ محبت ہے اور وہ اسی عقیدت اور محبت کے توسط سے جہانِ شاعری میں رنگ آمیزی کرتے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

ہم نے اے عرشؔ غزل کو نیا آہنگ دیا
باوجود اس کے کہ ہم اہلِ زباں تک بھی نہیں

عرشؔ کی غزلوں میں فکر کی گہرائی اور فنکارانہ چابکدستی ملتی ہے۔ وہ اپنے مخصوص انداز اور رویّے کی وجہ سے قارئین میں اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں۔ اسی لئے اُن کی غزلیں مقبول عام ہیں۔ عرشؔ کی غزلیں اپنے اندر ایک مخصوص لہجہ اور ادراک رکھتی ہیں۔ صاف وشیرین زبان، پاکیزہ خیالات اور دِل پر نشتر کرنے والا اسلوب پڑھنے والے کو ہر دَم متاثر کرتا ہے۔ عرشؔ کی غزلوں میں روایت سے یکسر بغاوت بھی نہیں ملتی بلکہ وہ روایت کا احترام کرتے ہیں۔ اُنہیں کلاسیکی غزل پر گہری نظر ہے اور وہ عصری آگہی کا بھی گہرا ادراک رکھتے ہیں۔ صاف وشیرین الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا بھی ایک ہنر ہے۔ عرشؔ صہبائی اس ہنر سے بخوبی واقف ہیں۔ اس لئے اُن کی غزل ایک الگ اور انفرادی پہچان رکھتی ہے۔ اُن کے ہاں کلاسیکی لب ولہجہ کے ساتھ عصری آگہی کا عرفان بھی ملتا ہے۔ زبان کے اس برتاؤ سے اُن کی شاعری میں ایک عجیب طرح کے گداختگی پیدا ہوگئی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر منوہر سہائے انورؔ صاحب، عرشؔ صہبائی کی ان شعری خصوصیات کے ضمن میں رقمطراز ہیں:

> ''مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ جناب عرشؔ صہبائی اصولِ فن اور صحتِ زبان کا بڑا خیال رکھتے ہیں اور فرسودہ مضامین نظم کرنے کے بجائے نئے نئے خیالات کو عمدہ الفاظ کے دلکش لباس میں جلوہ گر کرتے ہیں۔ اس ضمن میں اُن کے چند اشعار مثال کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں:

- دِل کہ تھا آرزوؤں کا مسکن — خونِ حسرت میں تر بہ تر دیکھا
- میں ڈوبنے والوں کا بھی بنتا ہوں سہارا — تسلیم یہ مجھ کو کہ میں تنکے کی طرح ہوں
- اے عرشؔ یہ پہچان ہے اربابِ وفا کی — ہر حال میں جیتے ہیں مگر کچھ نہیں کہتے
- عرشؔ بے باکی وحق گوئی ہے مذہب اپنا — ہم نہ بدلیں گے کبھی وقت کی چالوں کو طرح
- عزم سے ہوتے ہیں حل سب مسئلے — عزم سے کٹتی ہے زنجیریں کئی

عرشؔ صہبائی اُن غزل گو شعراء میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے غزل کو ہمہ گیری سے آراستہ کیا اور اپنی منفرد تکنیک سے اس میں نئے رنگ بھر دیئے۔ اُن کی غزل میں جہاں حُسن و عشق کا رقص ملتا ہے وہاں جدوجہدِ حیات کی عجیب تڑپ اور گداختگی بھی پائی جاتی ہے۔ عرشؔ کی غزل میں فلسفیانہ اندازِ فکر بھی ہے اور لہجے کی برجستگی بھی ہے۔ وہ لفظ و معنی کی کشاکش سے واقف ہیں۔ اس لئے ان کے یہاں الفاظ اور تراکیب کا استعمال بھی بلیغ ملتا ہے۔ وہ ایسے الفاظ کو استعمال میں لاتے ہیں جن میں جدت ہوتی ہے اور جن سے اُن کی غزل میں موسیقیت پیدا ہوتی ہے۔ ڈاکٹر جاوید وششٹ اپنے ایک مقالے "مغنیِ حیات۔ عرشؔ صہبائی" میں عرش کو غزل کی آبرو قرار دیتے ہیں۔ اُن کے مطابق عرش عصری شعور سے کماحقہ واقفیت رکھتے ہیں۔ انہیں کلاسیکی غزل کا پاسدار قرار دیتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کہنہ مشق و پختہ کار ہے۔ زبان و بیان پر قدرت رکھتا ہے۔ وہ نئے ادبی شعور سے باخبر ہے اور جدید شعری رجحان سے بھی واقف ہے۔ غزل کی کلاسیکی روایت سے لے کر اس کی لطافت و نزاکت اس کے بدلتے روپ، اُس کی اشاریت و ایمائیت کے ہر لطیف کنایہ کو نہ صرف شاعر سمجھتا ہے بلکہ اشعار میں ڈالنے کا گر بھی جانتا ہے۔ مختصر یہ کہ عرشؔ صہبائی اُردو غزل میں اپنا انفرادی رنگ قائم کر چکے ہیں اور دورِ جدید میں وہ اُردو کے منفرد صاحبِ طرز غزل گو ہیں۔"[1]

غمِ دوراں اور غمِ جاناں عرشؔ صہبائی کی غزل گوئی کا ایک خاص موضوع رہا ہے۔ انہوں نے اس موضوع کو برتنے میں بھی جداگانہ راستہ اختیار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ساری کائنات غم و مصائب کا ایک مرقع ہے۔ عرشؔ صہبائی اپنی حساس طبیعت کی وجہ سے ساری کائنات کے غم کو اپنا ذاتی غم تصور کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی اس کا مقابلہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ دراصل وہ غمِ دوراں کو غمِ جاناں کی ہی ایک کڑی سمجھتے ہیں۔ اُن کے ہاں جینے کی تمنا کبھی بھی مفقود نہیں ہوتی۔ وہ حزن و ملال کی کیفیت سے کس قدر سرشار ہیں، اس کا اندازہ درج ذیل اشعار سے بخوبی ہوتا ہے۔ اُردو کے معروف شاعر شفا گوالیاری،

[1] ریزہ ریزہ وجود از عرشؔ صہبائی، ص: ۱۲۱۔

عرشؔ کی اس کیفیت کا بخوبی اندازہ لگا کر اُن کی شاعری پر رائے زنی کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''شکستِ جام، قدیم وجدید شاعری کا حسین سنگم ہے۔ رجائیت کا عنصر زیادہ غالب ہے۔ حیات وکائنات کے نظام کی خرابی پر بھی ہلکی ہلکی نشتر زنی کی ہے۔ جمالیات کے سانچے میں وقت کی گونج کو ڈھالا ہے۔ تغزل کا رنگ کافی نکھرا ہوا ہے۔ شگفتگی، روانی اور سلاست ہر جگہ نمایاں ہے۔ شکستِ جام، گلرنگ وسدا بہار غم جاناں وغم دوراں کا بہترین امتزاج شاہکار ہے۔''

دیکھئے زندگی اور غم کو کس طرح سے ایک دوسرے کے ہم پلہ رکھتے ہوئے فلسفیانہ انداز میں اپنے کلیئے کا بیان کرتے ہیں:

جو زندگی ہے تو غم بھی ہیں ساتھ ساتھ اس کے
کوئی ندی نہیں جس میں بھنور نہیں ہوتے

- زندگی ایک مرقع ہے غم و راحت کا — خار وگل دونوں سے تزئینِ چمن ہوتی ہے
- کہاں کی راحتیں، غم و ملال دے کے گیا — وہ شخص دِل کو غمِ لازوال دے کے گیا

عرشؔ صہبائی ایک حقیقی شاعر ہیں۔ وہ اپنے اشعار میں اپنے تفکر سے نئے رنگ بھرتے ہیں۔ وہ جو کچھ بھی دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں اُسی کو حقیقت کا رنگ دے کر اپنے اشعار میں ڈھالتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں خاص طور پر محبت کا پیام ہوتا ہے۔ امن وآشتی، قومی یگانگی، وطن پرستی اور انسان دوستی کو اُن کی شاعری میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اسی پیغام نے اُن کی غزل کو آفاقیت عطا کی ہے۔ دیکھئے اپنے اس تصور کو کیسے الفاظ میں ڈھال کر رنگ بھرتے ہیں: مثلاً

- عرشؔ بے باکی وحق گوئی ہے مذہب اپنا — ہم نہ بدلیں گے کبھی وقت کی چالوں کی طرح
- بدلنا ہے مجھے اے عرشؔ زندگی کا نظام — بلا سے لاکھ رسومِ کہن کے پہرے ہیں
- کٹتی ہے تو کٹ جائے زباں اپنی مگر ہم — ظلمت کو کسی طور ضیا کہہ نہیں سکتے
- میں ڈوبنے والوں کا بھی بنتا ہوں سہارا — تسلیم یہ مجھ کو کہ میں تنکے کی طرح ہوں

عرشؔ صہبائی نے ساقی، پیمانہ، مے کدہ، جام ومینا، ساغر وبادہ کے موضوعات کو بھی اپنی

شاعری میں ایک خاص جگہ دی ہے تو وہ ان چیزوں کو زندگی سے مشابہت دیتے ہیں۔

عرشؔ صہبائی سرزمین جموں وکشمیر کے وہ سخنور ہیں جنہوں نے اپنی شاعری کے توسط سے نہ صرف اپنا نام روشن کیا بلکہ ریاست کے نام کو بھی چار چاند لگا دیئے۔ وہ ایک وطن پرست اور انسان دوست شاعر ہیں جن کی آواز کی بازگشت بہت دور سے سنائی دیتی ہے۔ انہیں قوم دشمن عناصر سے نفرت ہے۔ وہ صوفیوں اور سنتوں کی اس سرزمین کو ہمیشہ قومی وحدت اور انسان دوستی کا مرکز دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں خصوصاً اپنی غزل میں اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ وقت یکساں نہیں رہتا ہے بلکہ دھوپ اور چھاؤں کی طرح اپنا رنگ بدلتا ہے۔ اُنہیں یقین ہے کہ جب تک کشمیر میں ہندو مسلم، سکھ اور عیسائی متحد ہیں تب تک اس سرزمین کی طرف کوئی بھی شخص ٹیڑھی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا ہے۔

دیکھئے اپنے محبوب کو کشمیر کی ٹھنڈی ہواؤں اور روح پرور فضاؤں سے کیسے تشبیہ دیتے ہیں۔ کہتے ہیں:

روح کو اِک تازگی ملتی ہے اُن کی یاد سے
وادیٔ کشمیر کی ٹھنڈی ہواؤں کی طرح

عرشؔ کی غزلوں میں طنزیہ لب ولہجہ بھی ملتا ہے۔ وہ موجودہ دور پر طنز کرتے ہیں کیونکہ اس دور نے جہاں ترقی کی کئی منازل طے کی ہیں، وہاں انسانی زندگی کو بھی شدید خطرات سے دوچار کیا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

- جنابِ عرشؔ کی باتوں کو کیسے جھٹلائیں — وہ معتبر نہ سہی غیر معتبر بھی نہیں
- کٹتی ہے تو کٹ جائے زباں اپنی مگر ہم — ظلمت کو کسی طور ضیا کہہ نہیں سکتے
- میں ہوں جھونکا ہوا کا گزر جاؤں گا — بے ٹھکانہ ہوں، میرا ٹھکانہ کہاں

عرشؔ کی زبان صاف اور بیان دلکش ہے۔ وہ بوجھل تراکیب سے کام نہیں لیتے ہیں بلکہ نرم، ملائم اور دلکش زبان سے اپنے جذبات قارئین تک پہنچا دینے کا ہُنر جانتے ہیں۔ وہ متاثر کُن اور ولولہ انگیز الفاظ سے کام لیتے ہیں اور اپنے خیالات واضح طور پر پیش کرتے ہیں۔ وہ

ایک حقیقی شاعر ہیں جن کی شاعری میں قوسِ قزح کی طرح بے شمار رنگ نظر آتے ہیں۔ وہ الفاظ کی در و بست سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہیں۔ اُن کے ہاں علامت نگاری، پیکر تراشی اور تشبیہات اور استعارات اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی غزل اُن کے خیالات کی آئینہ داری کرتی ہے۔ اس ضمن میں درج ذیل شعر پیش کیے جا سکتے ہیں:

- ایک ندی ہوں، نہیں کم یہ مقدر میرا ۔۔۔ راستہ دیکھتا رہتا ہے سمندر میرا
- وہ میری روح میں تحلیل ہو چکا ہے عرشؔ ۔۔۔ اگر وہ مجھ سے جدا ہے، چلو جدا ہی سہی
- کیا خبر تھی زندگی اب امتحان بن جائے گی ۔۔۔ بات جو نکلے گی مُنہ سے داستان بن جائے گی
- مسجدیں کم ہیں نہ دُنیا میں شوالے کم ہیں ۔۔۔ اُس کے بندوں کے مگر چاہنے والے کم ہیں

☆☆☆

عرشؔ صہبائی:
''اسلوب'' کے شعری تناظر میں

یہ کیسی محویت ہے عرشؔ کیا تفسیر ہو اس کی
بسا اوقات اپنی ذات پر اُن کا گُماں گزرا

عرشؔ صہبائی ہماری ریاست میں ہی نہیں بلکہ ملک کے صفِ اوّل اور بزرگ شُعرا میں ایک ایسا معتبر اور ہر دِل عزیز نام ہیں جن کی شاعرانہ شخصیت ایک منفرد پہچان کی حامل ہے۔ آپ ایک بسیار گو اور کثیر الاشاعت غزل گو شاعر ہیں جو عام شعری مجالس اور اہلِ فکر و دانش میں یکساں شہرت رکھتے ہیں۔ جب بھی کسی مقامی یا قومی پیمانے کے مشاعرے کا اہتمام کیا جاتا ہے تو سامعین کو عرش صہبائی کے کلام کا بے تابی کے ساتھ سُننے کا انتظار رہتا ہے اور آپ اِن مجالس میں شمعِ محفل کی مانند چھائے رہتے ہیں۔ اُردو میں اگر چہ دیگر اصنافِ سخن اور تذکرہ نگاری کے حوالے سے بھی آپ کا نمایاں کام موجود ہے لیکن بنیادی طور پر آپ صنفِ غزل کے سخنور ہیں جو آپ کی خاص شناخت اور مقبولیت کی بھی ضامن ہے۔ آپ گزشتہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ سے تن دہی اور جانفشانی کے ساتھ اُردو شعر و ادب کی خدمت بجا لا رہے ہیں اور اپنی ایک خاص پہچان برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

''اسلوب'' نامی شعری مجموعہ، جو راقم الحروف کے زیرِ مطالعہ ہے آپ کی فنی قدرت اور فکر و احساس کی تازہ کاری کا غماز ہے۔ اِس مجموعۂ شعر سے قبل آپ کے تین شعری مجموعے،

شکستِ جام، شگفتِ گُل اور صلیب کے نام سے شائع ہوئے ہیں جن کی ادبی حلقوں میں خاص پذیرائی ہوئی اور قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ''اسلوب'' کا یہ شعری مجموعہ جو تقریباً ایک سو بیس صفحات کی ضخامت لئے ہوئے ہے فروری ۱۹۹۱ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ موصوف نے اِس مجموعۂ شعر کو اپنے برادر اکبر سورگیہ ودیا پرکاش کے نام منسوب کیا ہے اور ابتدا میں اپنے چند ادبی رُفقا کا اظہارِ تشکر بھی کیا ہے۔ یہ پورا مجموعہ کلام آپ کی غزلیات پر مُشتمل ہے، جن میں کچھ مختصر اور کچھ طویل بحر کی غزلیں شامل ہیں۔ اکثر غزلوں میں روایت سے ہٹ کر اچھوتے اور نئے ردیف و قوافی کا استعمال کیا گیا ہے۔ عرشؔ صہبائی ایک آزمودہ کار اور معتبر سخنور ہیں جنہیں زبان و بیان پر پوری دسترس ہے۔ شگفتہ بیانی، برمحل اور موزون تراکیب و استعارات آپ کے کلام کو جاذب نظر اور پُرکشش بناتے ہیں۔ آپ غزل کی شستہ روایات کے رمز شناس ہیں اور اِس کو برتنے کا پورا ہُنر اور مہارت رکھتے ہیں۔ آپ روایات سے استفادہ بھی کرتے ہیں اور اپنے فکر و احساس میں ایک تازہ روح پھونک کر اِن کو تر و تازہ بھی بناتے ہیں۔ عرشؔ صہبائی ایک مثبت فکری رویّے کے ترجمان ہیں۔ آپ کا فکری کینواس بہت وسیع ہے اور آپ عصری زندگی کے بدلتے ہوئے اقدار اور پیچیدہ مسائل اور مزاج سے بخوبی آشنا ہیں۔ زندگی آپ کے خیال میں ایک جہدِ مسلسل اور آلام و مصائب سے متصادم ہونے کا نام ہے۔

- عرشؔ اس میں تلخیٔ غم کے سِوا کچھ بھی نہیں ۔۔۔ تو کتابِ زندگی کی ورق گردانی نہ کر

لیکن آپ ہمت اور حوصلے سے دست کش نہیں ہوئے بلکہ مرزا غالبؔ کے اِس خیال کے حامی ہیں کہ۔

- قیدِ حیات اور بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں

اور آلام و مصائب سے نبرد آزما ہونا ہی زندگی کی علامت ہے اور کوئی بھی ذی روح آلام اور تلخیوں سے مُبرّا نہیں جس کا اظہار آپ کے ہاں یوں دیکھنے کو ملتا ہے:

- ہر نفس کے ساتھ وابستہ رہیں کچھ تلخیاں ۔۔۔ غور سے سوچا تو یاد آیا کہ ہم تنہا نہ تھے
- ہزاروں حادثوں کی زد میں تھی حیات اپنی ۔۔۔ ہر ایک قدم پر مگر حوصلے بُلند رہے

- حادثاتِ دِل شکن سے. کیا پریشانی مجھے　　　جب وراثت میں ملی غم کی فراوانی مجھے

اور آگے چل کر اپنی حوصلہ مندی اور سخت جانی کا یوں اظہار کرتے ہیں۔

- مجھے موجوں کے زیرو بم سے لُطف اندوز ہونا ہے　　　سفینہ پار اُترے یا بھنور کے درمیاں ٹھہرے
- ہر قدم پر ساتھ دینا زندگی کے حادثو　　　اِس بھرے میلے میں ڈھونڈو گے کہاں کھو کر مجھے
- میں خود حیران ہوں یہ کس طرح اب تک سلامت ہے　　　نگاہ برق سے سو بار میرا آشیاں گزرا
- جینا بڑا مشکل تھا مگر پھر بھی ہم جیئے　　　جینے کیلئے اتنے وسائل تو نہیں تھے

عرشؔ صہبائی کے اشعار میں فِطرت اور انسان کے باہمی رشتوں کی ربط و رشتہ کا ایک ایسا قرینہ پایا جاتا ہے جس سے ہر وقت اُمید کی کرنیں پھوٹتی ہوئیں نظر آتی ہیں۔ آپ بظاہر فطرت کے مختلف رنگوں میں قدرت الٰہی کا مشاہدہ کرتے ہیں اور قدرت کی عظمت اور شانِ یکتائی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی بے بضاعتی اور کوتاہ عملی کا اظہار کرتے ہیں اور مداوائے غم و مصائب تلاش کرتے ہیں۔

- ذرّے ذرّے میں نمایاں ہیں تری پرچھائیاں　　　ذرّے ذرّے سے ہیں پیدا رنگ و بو کے سلسلے
- کوئی ثبوت تو عظمت کا یوں مہیا کر　　　میرا وجود اک قطرہ ہے اِس کو دریا کر

تقسیمِ ملک کے بعد اُردو شاعری ہیئتی اور موضوعاتی سطح پر ترقی پسند، جدیدیت اور مابعد جدیدیت جیسی تحریکات سے ہم آغوش ہوتی رہی لیکن عرشؔ صہبائی غزل کی شستہ روایات کی ہی پاسداری کرتے رہے بلکہ نثری نظم اور آزاد نظم وغیرہ اصناف سے اپنی عدم دلچسپی کا اظہار کرتے رہے اور اس ضمن میں اپنی بے رغبتی کا یوں اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

> ''پڑھنے والا تو کُجا خود کہنے والا بھی سمجھ نہیں پاتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ دِن دور نہیں جب اُردو میں صرف نثر باقی رہ جائے گی وہ بھی اس صورت میں اگر نثر جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی نذر نہ ہوئی''۔

(شیرازہ اُردو جلد ۴۶ ص:۲۸)

لیکن بہ ایں ہمہ آپ کی شعری کائنات کا انسلاک حیات و کائنات کے اسرار و رموز اور انسانی نفسیات وفطرت کے ساتھ جڑا ہوا نظر آتا ہے۔ آپ کی شاعری میں ایک رجائی فکر کارفرما ہے جس میں قنوطیت کا دخل نہ ہونے کے برابر ہے۔ آپ زندگی کے ٹھوس حقائق کی عکاسی کرتے ہیں، جس میں اعتماد بھی ہے۔ مسکراہٹیں بھی ہیں اور آلام و مصائب بھی۔ اس میں نہ کوئی تقریر بازی ہے اور نہ کوئی انداز ناصحانہ بلکہ قدم قدم پر تجرباتی اور تجزیاتی عمل کارفرما نظر آتا ہے۔ آپ کے کلام میں ایک گہری معنویت اور مقصدیت پائی جاتی ہے جس پر نام نہاد ترقی پسندی کا دم بھرنے والے بھی رشک کرنے لگتے ہیں۔

عرشؔ صہبائی انسانی قدروں اور باہمی اخوت و محبت کے علمبردار ہیں۔ آپ کے خیال میں ساری زندگی کی بے تحاشا تحریص اور لالچ نے انسانی ضمیر کو کھوکھلا بنا دیا ہے۔ آدمی، آدمی کے خون کا پیاسا بنتا جا رہا ہے اور ذہنی انتشار اور غیر یقینیت اس کا مُقدر بنتا جا رہا ہے۔ اس ناخوشگوار صورتِ حال سے آپ اپنی بے زاری کا اظہار کرتے ہیں اور اِس سے اجتناب کرنے کا مشورہ بھی دیتے ہیں۔

- درہم و برہم نہ ہو جائے کہیں دِل کا سکون — خواہشوں کی کھڑکیوں سے جا نک کر باہر نہ دیکھ
- اے عرشؔ کیا بتائے گا تجھ کو یہ آئینہ — خود کو کبھی ضمیر کی گہرائیوں میں دیکھ
- کھُلے ہوئے تھے مصلحت کے دروازے — مگر یہ دِل تھا کہ ڈوبا ہوا وقار میں تھا
- اس دور میں کوئی بھی سمجھے گا نہ مجھے عرشؔ — حق کا پُجاری ہوں، محبت کی زبان ہوں

عصر حاضر کا انسان مختلف سطحوں پر غیر یقینیت اور استحصال کا شکار ہے اور یہ صورت حال عالمی سطح پر توجہ طلب ہے۔ نیوکلیائی قوت رکھنے والی قوتیں انسانی زندگی کو خس و خاشاک کی مانند غلطاں کرنے کے درپے ہیں۔ امن و سلامتی کا دعویٰ کرنے والے ادارے مصلحت پسندی کا شکار ہیں۔ عرشؔ صہبائی اس عصری بربریت کا پورا ادراک رکھتے ہیں اور آپ کے محسوسات کا اظہار ایک تلخ لہجہ اختیار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ آپ کے خیال ہی قوم کے مصائب کا مداوا کرنے کا دعویٰ کرنے والے اور دم بھرنے والے رہبر خود تحریص کے شکار ہیں اور زبانی جمع خرچ سے

عوام کے دل بہلاتے ہیں۔ اِس بے بسی کا اظہار آپ کے ہاں یوں دیکھنے کو ملتا ہے۔

- یہ حادثہ کسی صورت میرے گماں میں نہ تھا وہ میرِ کارواں ٹھہرا جو کارواں میں نہ تھا
- ہزاروں سازشیں پنہاں ہیں اُن کے اک تبسم میں
اُنہیں پھر بھی یہ ضِد ہے وہ ہمارے مہرباں ٹھہرے
- انقلاب کیا ہوگا اس سے بڑھ کے دُنیا میں کارواں کا رہزن ہی میرِ کارواں ٹھہرا
- یہاں کا آئین ہی عجب ہے کہ طرزِ نو کا یہ میکدہ
جو بے کسوں کا لہو پیئے گا وہ میکشوں میں شمار ہوگا
- عرشؔ کیا بھلائیں ہم وقت کی نوازش کو زخم جو لگا دِل پر نقشِ جاوداں ٹھہرا

عرشؔ صہبائی اُردو زبان کو ہندوستانی تہذیب کا ایک گنجِ بے بہا تصور کرتے ہیں جو علم و ادب کے لازوال سرمایہ سے مالا مال ہے۔ ہر چند کہ آپ اپنی مادری زبان ڈوگری پر بھی دسترس رکھتے ہیں لیکن اُردو کی محبت کو دل سے جُدا نہیں کرتے۔

- عرشؔ مجھ کو ڈوگری بولی بھی ہے بیشک عزیز ہاں مگر اُردو زباں کی اور ہی کچھ بات ہے

مجموعی طور پر عرشؔ کے شعری تجربات میں ہر قدم پر فکر کی پختگی اور احساس کی تازہ کاری کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، جو آپ کی فنی قدرت کا مظہر ہے۔ آپ کے قلم سے اور بھی معیاری شعری مجموعے معرضِ وجود میں آئے ہیں جن پر تفصیل سے بات کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ کی تخلیقات میں وہ شعری آویزش اور قوت موجود ہے جو آپ کے کلام کو دوام بخشنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ آپ کی شاعری میں، جہاں عصری زندگی کی عکاسی اور آگہی پائی جاتی ہے وہیں آپ کا کلام ایک ارفع قسم کے ذوقِ جمال سے بھی مزین ہے۔ اِس مختصر سے جائزے کو ہم آپ کے ہی ایک شعر پر اختتام کو پہنچاتے ہیں جو آپ کے گہرے ذوقِ جمال کا عکاس بھی ہے۔

عرش اُس کی جھیل سی آنکھوں کا کیا اس میں قصور
ڈوبنے والوں کو گہرائی کا اندازہ نہ تھا

☆

☆......خورشید کاظمی

عرشؔ صہبائی کے کلام میں زندگی کا تصوّر

عرشؔ صہبائی کا شمار آج کے دور میں جب کہ اُردو شاعری پہ اگر زوال نہیں تو زوال کے آثار ضرور ہیں، چند گنے چُنے بُزرگ، کُہنہ مشق اور معتبر شعرا میں کیا جا سکتا ہے جو اُردو شاعری میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں اور اُن کی شاعری کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

عرشِ نے کم و بیش زیرِ آسمان تمام موضوعات کو نظم کیا ہے جس میں جذبۂ عشق، فراوانیٔ حُسن، ہجر و وصال، غم و آلام، درد و کرب، ہمت و حوصلہ، اندرونی اور بیرونی خلفشار، سیاسی اتھل پتھل، رشتوں کی بے قدری، جنگ و جدل، حق و باطل کا تصادم، قتل و غارت، جنسی بے راہ روی، صحت مند قدروں کا زوال، غریبوں کا استحصال، سکون اور دوستی کا فُقدان، مصائب کا دور دورہ، غیر یقینی حالات، خلوص و وفا کی کمی، سیاست دانوں کے داؤ پیچ، صاحبِ عزت اور ذی وقار لوگوں کے قول و فعل میں تضاد، سازشیں، خوف و ہراس، غریبوں کی آہیں، مکارانہ اور منافقت سے بھری اہلِ اقتدار کی چالیں، ہر طرف پھیلی ہوئی بے اطمینانی وغیرہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر جاوید وششٹ نے بھی کہا ہے کہ

> ''عرشؔ نے اپنی شعری انفرادیت کا سنگِ بنیاد ''زندگی'' پر رکھا ہے اس لئے وہ استوار بھی ہے اور زندگی کی طرح جمود سے بے نیاز بھی۔ اس میں روانی

بھی ہے اور تسلسل بھی۔ عرشؔ صہبائی نے اپنی غزلوں میں زندگی کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ خود اپنا محور بن جاتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ اُن کی غزل میں آ کر زندگی خود غزل بن جاتی ہے۔"

عرشؔ نے اپنی زندگی کا احاطہ کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں کہا ہے کہ انہوں نے اِسے پریشانی اور بد حالی میں گزارا ہے۔ اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ اُن کو تمام گھریلو کام بھی انجام دینے ہوتے تھے جن میں کھانا بنانے سے لے کر لپائی تک شامل تھے۔ انہیں یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہوتی کہ پیوند لگے کپڑوں میں سکول جاتے تھے۔ اپنی زندگی کے اِس اور بعد کے دور کا انہوں نے خلاصہ اِس شعر میں کیا ہے

زندگی مُجھ سے کیا بسر ہوتی
زندگی نے کیا بسر مُجھ کو

اپنے بچپن اور لڑکپن کی عمر گزار کر جب انہوں نے فکرِ معاش میں ملازمت کے دوران کئی حوادث و تجربات کا سامنا کرنا پڑا۔

انہوں نے وفا کے بدلے جفا کرنے والے بھی دیکھے۔ محبت کی جگہ نفرت کرنے والوں سے بھی پالا پڑا۔ خلوص کی بجائے اُن سے بھی واسطہ پڑا جنہوں نے بیزاری کا اظہار کیا۔ وہ یہ سب دیکھتے اور سہتے رہے اور اُن کے حق میں دُعائیں کرتے رہے۔

یہ حقیقت ہے میری جان کے جو دُشمن ہیں
اُن کے حق میں بھی میں کرتا ہوں دُعائیں کتنی

زندگی سے عرشؔ کو شکایت بھی ہے اور گلہ بھی ہے۔ جا بجا اپنے اشعار میں اِس کا کھلا اعتراف بھی کیا ہے لیکن حیرت ہے کہ وہ اس سے بدظن اور نا اُمید نہیں ہوئے۔ اسے بُرا نہیں کہا بلکہ ہزار کُلفتوں کے باوجود زندگی کے حسین گوشوں کو تلاش ہی نہیں کرتے بلکہ دوسروں کو اِسے جینے کے مشورے سے بھی نوازتے ہیں۔ ساحل احمد اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:

"۔۔۔زندگی کے رمزی کنایات اور اشارتی پیکروں کو انہوں نے جس

طور سمجھا اور انہیں شعری تلازمات کا حصہ بنایا وہ صرف اُن کی صلاحیت ذہنیہ تھی
ورنہ زندگی ایسے ہزار پہلو رکھتی ہے جس تک رسائی پالینا مشکل امر ہے۔ انہوں
نے زندگی میں رنج وغم کے بھی چراغ جلتے دیکھے ہیں اور خوشی کے پھول بھی کھلتے
دیکھے ہیں۔''

- زندگی کے مسئلے میری طرح سمجھے گا کون — زندگی گزری ہے میری مسئلوں کے درمیاں
- کبھی دل میں جو تیری یاد کے غنچے چٹکتے ہیں — فضائے زندگی میں اک مہک سی پھیل جاتی ہے

اُن کے کلام کے مطالعہ کے بعد یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ عرشؔ کو زندگی نے نہیں بلکہ زندگی کو عرشؔ نے ہر مقام اور ہر قدم شکست سے دوچار کرتے ہوئے اُسے چیلنج کیا ہے کہ وہ چاہے کتنے ہی حربے آزمالے، وہ اُس سے دبنے یا ڈرنے والے نہیں:

ہزاروں حادثوں میں بھی سکون ہے دل کو
میں وہ چراغ ہوں جو آندھیوں میں جلتا ہے

وہ زندگی کے جور وستم اور اُس کے پیدا کردہ نامساعد حالات سے نہ مایوس ہوئے اور نہ ہی بددل۔ وہ ہر حال میں خوش ہیں اور مُسکراتے رہتے ہیں۔

حضرتِ عرشؔ کی صحبت ہو میسّر جب بھی
پورے ماحول میں پھولوں کی مہک رہتی ہے

عرشؔ کے زندگی کے نظریئے کو شرون کمار ورما یوں بیان کرتے ہیں:

''عرش کی نظر زندگی کے ہر پہلو پر ہے۔ زندگی کے مختلف رنگ، اُن سے پیدا ہونے والے دلِ شاعر کے احساسات، ردِ عمل اور شاعر کی اپنی مجبوریاں اُن کے اشعار میں محسوس کئے جاسکتے ہیں۔

-----اُس نے زندگی کو ایک محرک، مجسم، معتبر اکائی کے رُوپ میں پیش کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ عرشؔ نے زندگی سے عشق کیا ہے۔ یہی کمبخت اُس کی محبوبہ ہے۔ اِس کا ہر رنگ اُس نے دیکھا ہے۔ زندگی نے اُسے چرکے بھی دیئے

ہیں اور جھٹکے بھی، روشنی بھی دی ہے اور اندھیرے ہے اور تلخیاں بھی دی ہیں۔
عرشؔ نے اِس کے ہر غمزہ، ماہر ادا، ہر وار کو برداشت کیا ہے لیکن اُس نے اپنے
عشق میں کمی نہیں آنے دی۔"

(عرشؔ صہبائی۔ زندگی کا نباض)

زندگی تو عمر بھر برہم رہی ہم سے مگر
جس طرح چاہا ہے ہم نے، اِس طرح چاہے گا کون

اقبال انصاری کے خیال میں:۔

"۔۔۔۔۔زندگی کو پوری طرح سمجھ لینے کا دعویٰ تو کوئی بھی نہیں کر سکتا۔
عرشؔ صہبائی بھی یہ دعویٰ نہیں کرتے۔ وہ تو بس بڑی دل جمعی اور دل پذیری کے
ساتھ زندگی کی پرتیں کھول کر گہرائی میں اُترنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اُن
کی شاعری اُن کی اِس کاوش کا آئینہ ہے۔ ایک بات جو بڑی شدت سے اُن کی
شاعری میں خود کو محسوس کراتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے زندگی کو اپنے شعور میں
جیا ہے، اپنے احساس میں جیا ہے، فنکارانہ لطف کے ساتھ جیا ہے، لبوں پر شگفتہ
تبسم لئے ہوئے جیا ہے، ایک محترم حقیقت سمجھ کر جیا ہے۔۔۔۔۔۔ عرشؔ
صہبائی کے جہانِ شعری سے گزرتے ہوئے بار بار یہ محسوس ہوتا ہے کہ زندگی از
خود فن بن کر اُن کی شاعری میں سما گئی ہے۔"

(زندگی کا شاعر عرشؔ صہبائی۔ کشمیر عظمیٰ ۳، جون ۲۰۱۲ء)

میں نے تمام عمر گزاری ہے اس کے ساتھ
اِس زندگی سے بڑھ کر کوئی خوب رُو نہیں

ڈاکٹر شاہ نواز اور ڈاکٹر رفیق انجم نے عرشؔ کا منتخب کلام "عکسِ جمال" کے نام سے
چھاپا ہے۔ اِس میں شاہ نواز عرشؔ کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

"۔۔۔۔عرشؔ زندگی کا مزاج داں ہونے کے ساتھ ساتھ کربِ وجود کا

بھی شاعر ہے۔ اُس نے زندگی کو جن حالات اور رُخوں سے دیکھا ہے اُس کی صحیح تعبیر اپنے شعری منظر نامے میں پیش کی ہے۔ جب یکے بعد دیگرے قاری پر اُس کے اشعار کی پرتیں کھلتی ہیں تو قاری عرشؔ کے شعری دفتر میں کئی رنگ دیکھتا ہے۔"

یہ بڑے اعتماد اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ عرشؔ نے زندگی کے ہر پہلو کا بغور مطالعہ کیا ہے اور اپنے کلام میں اُسے خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ آخر میں زندگی کے تعلق سے عرش کے کچھ شعر دیکھئے:

- کوئی بھی ہو مرحلہ اُس سے گزر جاتے ہیں عرشؔ — ہم نہیں اُن میں جنہیں بارِ گراں ہے زندگی
- عرشؔ سنگِ میل ہوگا تیرا ہر نقشِ قدم — زندگی سے زندگی کا مُدّعا بن کے گزر
- جو بے ضمیر ہے اُس کی زندگی ہے ایسے — کسی مکاں میں کوئی زندہ لاش رہتی ہے
- خزاں کا عکس بھی ہے پَرتَو بہار بھی ہے — یہ زندگی غم و راحت کا آبشار بھی ہے
- بکھرتی ہے وہیں سے زندگی کی روشنی اکثر — یہ دیکھا ہے کہ جو بھی جھونپڑے تاریک ہوتے ہیں
- جس کے ہر انداز پر خود زندگی بھی ہو نثار — زندگی کی وہ بہارِ جاوداں بن کے رہو
- جو بھی لمحہ ہے تپتی ہوئی ریت ہے — زندگی کربلا کے سوا کچھ نہیں
- رموزِ زندگی ظاہر ہیں اُن پر — وہ سڑکوں پر جو پتھر توڑتے ہیں
- اِس سے بڑھ کر اور کیا ہوں گی نظر کی پستیاں — زندگی کو کم نظر بارِ گراں کہتے ہیں

☆☆☆

☆......ڈاکٹر محمد آصف ملک علیمی

عرشؔ کی شاعری میں آس اور یاس کی کشمکش

انسانی فطرت میں عجلت خمیر کا درجہ رکھتی ہے، جس کے سبب انسان اس بات کا متمنی رہتا ہے کہ اس کی ہر خواہش، آرزو اور مقصد جوں ہی اس کے نہاں خانۂ دِل میں انگڑئیاں لینے لگے تو فوراً ہی پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ لیکن ایسا ممکن نہیں کہ اس کی ہزاروں یا ہر خواہش اس کے معیاد کے مطابق اس کے ہاتھ لگ جائے۔ سچ کہا ہے غالبؔ نے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

قریب قریب ہر شعبۂ زندگی میں عرشؔ صہبائی کے خیال کے مطابق حسنِ حیات کا بہتر اور اُمید افزا ہونا لازم ہے۔ عرشؔ خواہش مند ہیں کہ سماج کا ہر طبقہ ہر لحظہ ترقی پذیر ہو۔ بہر حال انسانی قدریں ہر لمحہ محترم رہیں۔ فردِ آدم کو مذہب کے خانوں میں بانٹ کر نہ دیکھا جائے۔ فرقہ واریت کی درندگی کے سیاہ سائے انسانی محبتوں پر نہ پڑیں۔

فنی ناقدری کے حوالے سے عرشؔ یاس کی اوٹ میں چلے جاتے ہیں۔ ان کے یہاں آس اور یاس کی ایسی کشمکش ہے کہ سماجی خرابیوں کے سبب جوں ہی عرشؔ کے ذہنی افق پر یاسیت کا دھواں چھانے لگتا ہے وہیں جلد ہی منطقی طور پر آس کا آسمان بھی کھلنے لگتا ہے۔ اس طرح اگر عرشؔ کی شاعری کو آس اور یاس کی کشمکش کے مضامین کے تناظر میں مطالعہ کیا جائے تو مجموعی طور پر

عرشؔ کی شاعری مثبت رویے، بلند ہمتی، حوصلہ پروری اور رجائیت کا سراغ دیتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں؟ اس کا سبب یہ ہے کہ عرشؔ زندگی سے بیزار نہیں، وہ زندگی کے سرد و گرم سے فرار نہیں چاہتے۔ زندگی کی دھوپ چھاؤں دونوں میں زندہ دلی کے ساتھ جینا چاہتے ہیں۔ چونکہ زندگی ان کے بالیدہ شعور میں ایسی نعمت عظمیٰ ہے، جس کے سبب انسانیت کی خدمت کی جا سکتی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ اگر اس گراں قدر زندگی کو اس طرح جیا جائے کہ زندگی کی مثبت بہاروں میں خدمتِ خلق کے پھولوں کی خوشبو سے انسانیت کی سانسوں کو معطر کیا جائے تو زندگی سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔ بقول عرشؔ:

''میں نے سب سے زیادہ محبت زندگی سے کی ہے۔ کیونکہ زندگی ہی دوسروں کی خدمت کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔''

اولاً ہم یہاں پر عرشؔ کے اس کلام پر بات کریں گے جو یاس کی فضا لئے ہوئے ہے۔ کیوں کہ عرشؔ کے صغیر سنی کے حالات و کوائف خاصے تلخ رہے ہیں، بچپن اور شباب کے موسم میں انہیں امید کی روشنی کم کم نظر آتی رہی ہے۔ عرشؔ نے اپنی شیر خوارگی کے بائیس ایام ہی گزارے تھے کہ والدہ کی شفقتوں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بہن پہلے ہی فوت ہو چکی تھی، اب گھر کے ماحول میں صرف مردانہ کردار تھے۔ والد، پانچ سالہ بڑا بھائی اور عرشؔ۔ یہ تھی عرشؔ کی کل کائنات۔ ان مردانہ کرداروں کا المیہ یہ تھا کہ اکثر و بیشتر امور خانہ داری کی ذمہ داریوں کو بھی خود ہی نبھانا پڑتا تھا۔ اس طرح عرشؔ کو صغیر سنی ہی سے اہم محبتوں اور شفقتوں سے محروم رہنا پڑا۔ اسی سونے سونے ماحول میں عرش کا تخلیقی شعور بالغ ہوتا چلا گیا۔ ان حالات و کوائف کو عرشؔ کی تخلیقی شعری زبان میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

- آپ کی اک مسکراہٹ وہ مٹا سکتا نہیں — جو غم دوراں کا اس دل پر اثر برسوں سے ہے
- بارہا تھک کے گر پڑی ہے عرشؔ — زندگی آفتوں کی جھولی میں
- جیسے مجبور سی کوئی دُلہن — بے دلی سے رواں ہو ڈولی میں
- کتنے جاں سوز مراحل سے گزر تھا اپنا — زندگی رہ گئی اک آگ کا دریا بن کر

● زندگی کیا ہے یہ پوچھے کوئی ہم سے اے عرشؔ　　　تیر کر آئے ہیں ہم آگ کے دریا کتنے

شکوے کے ساتھ:

● تو نے رنگین بہاروں سے نوازا سب کو　　　میرے حصے میں مگر بادِ خزاں تک بھی نہیں

● گو میسر چھت نہ تھی دیوار کا سایہ تو تھا　　　موسموں کی زد میں آکر گر پڑی دیوار بھی

گھر کی شفقتوں اور محبتوں کی محرومیوں کے سبب عرشؔ کو اپنی تعلیم بارہویں جماعت تک ہی لے جانے کا موقعہ ملا۔ اس کا کرب ان کے لاشعور میں اب بھی پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ اس کرب اور اضطراب کو عرشؔ کی شعریات میں جا بجا محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بچپن کی حالت تو ناگفتہ بہ رہی لیکن زندگی اپنے آخری پڑاؤ میں بھی غم زدہ اور گھٹن کی شکار ہے۔ عصری نسلیں جدید آلات میں مصروف ہیں۔ والدین کے دل کی کوئی نہیں سُنتا۔ عرشؔ شریکِ حیات سے محروم ہیں۔ سر کا سودا اور دل کا غبار آخر نکلے تو کہاں سے نکلے۔ اس کرب، گھٹن، اضطراب اور محبت کی اس کمی کو عرشؔ مایوس ہو کر شعری قالب میں ڈھالتے ہیں:

● زندگی آج بھی رستا ہوا اِک زخم ہے عرشؔ　　　آج بھی صورتِ حال پُر امید نہیں

● زندہ رہنے کے اور معنی ہیں　　　سانس لینا کوئی دلیل نہیں

● ہم گزرتے بھی تو کس موڑ سے کس مرکز سے　　　حادثے پھیل گئے پاس کا صحرا بن کر

جب عرشؔ ادراک و بالیدہ شعور کی منزل کو پہنچے تو دنیا کے رنگا رنگ شعبہ جات کو تخلیقی و فن کارانہ نگاہ سے دیکھا تو اس دنیا میں ایک کردار کے کئی کئی چہرے نظر آئے۔ نا اہلوں کو منصبوں پر دیکھا۔ منصبوں کو بکتے پایا۔ آدمی کے گفتار و کردار میں تضاد نظر آیا۔ آدم کی شکل میں ایسے درندے تھے جو اپنے کرتبوں کے سبب فرشتے مشتہر ہوئے۔ جو رہنما اونچے منصبوں پر انسانی عظمت کا راگ الاپتے تھے وہی فرقہ واریت اور درندگی کا ننگا ناچ ناچتے اور نچواتے ہیں۔ ایسے درندوں کے انسان بننے سے عرشؔ مایوس نظر آتے ہیں۔ ان کی نظر میں ایسے کردار ہندوستان کی سلامتی کے لئے خطرہ ہیں۔ وہ وطن کوئی رہنے کا مقام ہے جہاں پاکیزہ مریم جیسی بنتِ حوّا کی آبرو ریزی ہوتی ہو۔ اس دنیا میں ایسے شہرِ ہوس آباد ہیں جہاں عصمت کا لبادہ دھجیاں بن کر اڑتا ہے۔ ایسے تعفن

زدہ سماج اور معاشرے سے کیا آس لگائی جاسکتی ہے۔ عرشؔ یاس کے کہرے میں کڑھتے ہوئے اس پراگندہ غبار کو زمینِ شعری کے حوالے کرتے ہیں۔

- جو لوگ غلط ہیں وہ یہاں چھائے ہوئے ہیں　　دنیا سے رہوں برسرِ پیکار کہاں تک
- جو نہیں راستوں کے واقف عرشؔ　　کارواں کے امیر ہوتے ہیں
- ہم ترستے ہیں کوئی صاحب کردار ملے　　یوں تو ہر گام پہ ہیں صاحبِ گفتار بہت
- ثابت نہ رہ سکی کسی مریم کی آبرو　　شہرِ ہوس میں دھجیاں بن کر اڑا لباس

اس مقام پر لسانی وجمالیاتی تخلیق توجہ طلب ہے۔ عرشؔ زیادہ تشبیہ، استعارہ اور علامت تخلیق کرنے کے قائل نہیں۔ وہ سلیس اور سادہ زبان کو شعری زبان بنانے کے حامی ہیں۔ لیکن جو فطری طور پر (شاعری کا جو طرۂ امتیاز ہے) تخلیقی زبان کا حسن شعر میں شامل ہو جاتا ہے، اس کا جمال ہی کچھ دیگر ہو جاتا ہے۔ آخری شعر پر غور کریں کہ عرشؔ نے پاک دامن بنتِ حوّا کی عصمت دری کے واقعات کو کس فنی کمال و جمال کے ساتھ شعر میں ڈھالا ہے۔ لفظ ''مریم'' اس تخلیقی ہنر مندی سے برتا ہے کہ جہاں پاکیزہ مریمؑ کی طرف تلمیحی طور پر ذہن پاکیزگی کا سفر کرتا ہے وہیں لفظ ''مریم'' علامت کے طور پر برت کر، ان تمام پاک دامن بناتِ حوّا کی نمائندگی کی ہے جن کی پاک دامنی پر روز ہوس کا کیچڑ پڑتا ہے۔ ان روح سوز سانحات کو اس سے زیادہ جمال اور فن کاری کے ساتھ شاید ہی پیش کیا جاسکتا ہے۔

عرشؔ کے حساس دل پر فن کی ناقدری کے سبب ایک ایسی گہری چوٹ پڑتی ہے جس کی اذیت بار بار دل میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اس چوٹ کا بار بار اپنے کلام میں اظہار کیوں کرتے ہیں۔ لیکن اتنا ضرور ہے قریب قریب ہر اچھے شاعر نے فن کی ناقدری کا رونا رویا ہے۔ آیا عرشؔ روایت کی پیروی کرتے ہوئے ایسے مضامین باندھتے ہیں یا عجلت کا شکار ہو کر فن اور سخن کی ناقدری پر شکوہ زن ہیں۔ راقم التحریر کی معلومات کے مطابق تقریباً شعر و ادب کی ہر محفل میں عرشؔ کو ان کا مقام دیا جاتا رہا ہے۔ فن اور سخن کی ناقدری پر عرشؔ مایوس نظر آتے ہیں یہاں تک کہ یقین کی حد تک یاس کا اندھیرا ان کے تخلیقی آسمان پر چھایا ہوا محسوس

ہوتا ہے۔ ممکن ہے جب جموں وکشمیر کلچرل اکادمی کا ''عرشؔ صہبائی نمبر'' منظر عام پر آئے گا تو عرشؔ کی ناقدری کا شکوہ دور ہو اور ان کے دل پر لگے گھاؤ پر مرہم کا کام کر سکے۔ ذیل کے اشعار سے یاسیت کی اوٹ میں دھندلائے ہوئے عرشؔ کے شعری شعور کو سمجھا جا سکتا ہے۔

- کوئی تقریب ہو شعر وادب سے لاکھ وابستہ — مگر اُس پر سیاست کا دھواں سا پھیل جاتا ہے
- جموں کو فن سے، فنکار سے کیا مطلب — یہ دھرتی ہر رنگ میں بنجر لگتی ہے
- ہم نے سمجھی نہ عرشؔ کی عظمت — ہم نے کتنا بڑا گناہ کیا
- مرے وطن میں ذہانت کی کوئی قدر نہیں — یہ بات آج بھی کہتا ہوں میں یقین کے ساتھ

اس طرح اگر عرشؔ کے ارتقائی شعور کا مطالعہ باریک بینی سے کیا جائے تو ان کے دل و دماغ کے تخلیقی آسمان پر یاسیت کی جو فضا چھائی ہوئی ہے اس کے مجموعی تاثر کی تفہیم ان کے ذیل کے اشعار سے آسان ہو سکتی ہے۔

- آج کا دور ہے زوال پذیر — ڈھلتا سورج ہے کیا ضیا دے گا
- پہلے طوفان میں نظر آتی تھی کشتی اے عرشؔ — اور اب کشتی میں طوفان نظر آتے ہیں
- معاشرے پہ ہم آنسو بہا چکے کتنے — مزید کیا کریں آنکھوں میں اب نمی بھی نہیں
- نہیں کوئی جو دیکھے جھانک کر اب — ہوائیں کھڑکیاں کیوں کھولتی ہیں

عرشؔ زندگی کے ابتدائی لمحات سے جوانی تک بہت ساری مصیبتوں سے دوچار رہے۔ بلند ہمتی اور جگر کاوی کے ساتھ نامساعد حالات کا مقابلہ کرتے کرتے ان میں خودداری، غیرت اور صبر وقناعت کے عناصر توانا ہوتے چلے گئے، جن کے سبب ان کی شاعری میں رجائی عناصر کی کثرت دیکھنے کو ملتی ہے۔ عرشؔ بغیر کسی خوف وخطر کے زندہ دلی اور عزم مصمم کے ساتھ سچائی کے دامن سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ غالبؔ کی طرح انہوں نے بھی زندگی کی دھوپ چھاؤں کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے، کہ جب تک زندگی ہے انسان غم سے نجات نہیں پا سکتا۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

(غالبؔ)

عرشؔ نے اپنی مصیبتوں، غم و الم اور سختیوں کو زندگی کے نشیب و فراز سے تعبیر کرتے ہوئے خود کو حوصلہ دیا ہے۔ وہ زندگی کو خالقِ صد انقلاب مانتے ہیں۔

زندگی میں اگر ناکامیوں کا سامنا ہو تو اسے عرشؔ منزلِ مقصود کے حصول کے لئے ذریعۂ شوق خیال کرتے ہیں۔ سخت کوشی، مشقت اور جفاکشی کا وہ احترام کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی نگاہ میں مزدور، محنت کش اور مفلس کا جھونپڑا محلات سے عظمت میں بلند تر ہے۔ عرشؔ کی سخت کوشی، جگر کاوی انہیں حوصلہ بخشتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شعری کائنات میں آس یا رجائی مضامین کا ایک وفور ہے جس کے ذریعہ وہ خود اور دوسروں کے حوصلوں میں جان پیدا کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ مذکورہ کیفیات، جذبات اور خیالات کو ذیل کے اشعار میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

- آج کے دور میں نایاب نہیں حق گوئی ۔۔۔ آج کے دور کا سقراط ابھی زندہ ہے
- کٹتی ہے تو کٹ جائے زباں اپنی مگر ہم ۔۔۔ ظلمت کو کسی طور ضیا کہہ نہیں سکتے
- عرشؔ بے باکی و حق گوئی ہے مذہب اپنا ۔۔۔ ہم نہ بدلیں گے کبھی وقت کی چالوں کی طرح
- میں ہوں اس دور کا سقراط مجھے قتل کرو ۔۔۔ زہر کا کوئی اثر مجھ پہ نہیں ہو سکتا
- یہ راز دہر میں سقراط پر ہی ظاہر تھا ۔۔۔ جو زہر حق کے لئے ہو وہ قند ہوتا ہے

ان اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے کہ تلمیحاتی پیرائے میں عرشؔ نے حق گوئی کے لئے جان کی قربانی کو آسان قرار دیا ہے۔

عرشؔ کے تخلیقی شعور میں زندگی کو بلند ہمتی اور سخت کوشی کے ساتھ جینے کا پیغام ملاحظہ کریں۔

- تنگ آ کر موت کو آواز دینا کچھ نہیں ۔۔۔ موت سے پیدا کوئی جینے کی صورت کیجئے
- ہے لذتِ حیات سے نا آشنا ابھی ۔۔۔ وہ بد نصیب دل کہ جو محروم غم سے ہے

اس سے پھوٹیں گے ہمیشہ نغمہ ہائے رنج و غم
موت کے ہاتھوں میں جب تک زندگی کا ساز ہے

- جھیلتا ہے جان پر جو سختیاں — زندہ رہنے کا وہی حقدار ہے
- عین ممکن ہے سنبھل جائے حیات — آپ رک جائیں اگر تھوڑی سی دیر
- اے گرفتارِ روایاتِ کہن — زندگی ہے خالقِ صد انقلاب
- مبارک ہے رہِ ہستی میں یہ ناکامیٔ پیہم — جو منزل دور ہو تو شوقِ منزل تیز ہوتا ہے
- مری نگاہ میں یہ جھونپڑے عظیم ہیں عرشؔ — یہ وہ جگہ ہے جہاں انقلاب پلتا ہے

- رستے میں چٹانیں ہوں لیکن اک موجِ رواں کو کیا مطلب
ہم اس سے بھی ٹکرائیں گے دنیائے غم کی دیوار چُنے

- حادثوں سے ہے متاعِ زندگی کی آبرو — زندگی کھاتی ہے کس کس موڑ پر ٹھوکر نہ دیکھ

- جو زندگی ہے تو غم بھی نہیں ساتھ ساتھ اس کے
کوئی ندّی نہیں جس میں بھنور نہیں ہوتے

- کبھی ثابت قدم رہتے ہیں پروردۂ ظلمت
ستارے کانپتے ہیں جب سحر نزدیک ہوتی ہے

- جینے والے ان حالات میں جیتے ہیں — جن میں جینے کی صورت کم ہوتی ہے

عرشؔ نے جہد و عمل اور عزم کے حوالے سے بعض ایسے اشعار بھی کہے ہیں جن پر اقبالؔ کے جہد و عمل کا عکس نظر آتا ہے۔

عرشؔ کے یہاں وطن کی تباہی کا سبب فرقہ پرستی ہے لیکن وہ اس بات پر پُر اُمید ہیں کہ اگر آپسی بھائی چارہ قائم رہے تو یہ ناعاقبت اندیش طاقتیں وطن کا بال بھی بیکا نہیں کرسکتیں۔

- عزم سے ہوتے ہیں حل سب مسئلے — عزم سے کٹتی ہیں زنجیریں کئی
- تیری ہستی سے نئے دور کا آغاز نہ ہو — حیف ہے تجھ پہ زمانے کو اگر ناز نہ ہو

اسی تناظر میں اقبالؔ کے یہ شعر بھی ملاحظہ ہوں۔

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

مضمون کے ابتدائی حصے میں ہم مطالعہ کر آئے ہیں کہ عرشؔ ناقدریٔ سخن کے سبب یاسیت کی دبیز چادر کے تلے دبے ہوئے معلوم ہو رہے تھے لیکن یہاں وہ اپنے کلام اور طرزِ سخن کے نادر ہونے پر تعلیانہ پیرائے میں رجائیت کے شامیانے میں پناہ لئے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

میرا اندازِ سخن ہی میری پہچاں ہے عرشؔ   اس قدر بھیڑ میں بھی ہے میری پہچان الگ

کلامِ عرشؔ کو اگر مثبت رویوں اور رجائی عناصر کے تناظر میں دیکھا جائے تو عرشؔ کے یہاں زندگی کے ہر پڑاو پر رجا و آس کا عنصر بھاری نظر آتا ہے۔ رجائی کیفیت کے اشعار ان کے یہاں کثرت سے پائے جانے کے دو سبب ہو سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ انہوں نے صغیر سنی سے تا حال جن نامساعد حالات کا مقابلہ کیا ہے وہ اسی رجائی کیفیت کا مرہونِ منت ہے۔ دوم یہ کہ جب انسان حد سے زیادہ کسی چیز سے مایوس ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ کسی مطلوب و مقصود کے حوالے سے احساسِ کمتری کی سرد فضا میں گھر جاتا ہے تو پھر جینے کے بہانے تلاش کرتا ہے اس طرح وہ احساسِ برتری یا رجائی مزاج کے لفظوں سے اپنے قلب و شعور کو مطمئن کرنے کی سعی کرتا ہے۔ بہر حال سبب جو بھی ہو عرشؔ کے یہاں بلند حوصلہ، سخت کوشی، جگر کاوی، یقین محکم اور جہدِ مسلسل کے عناصر غالب نظر آتے ہیں۔

ہم نے اس مضمون ''عرشؔ کی شاعری میں آس اور یاس کی کشمکش'' کو تین حصوں میں منقسم کیا ہے۔ اوّل عرشؔ کی شعریات میں یاس کے عناصر۔ دوم آسی یا رجائی رویئے۔ سوم آس یا یاس کی کشمکش۔ اس سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ عرشؔ کے جذبات، کیفیات اور ارتقائی تخلیقی ذہن و شعور کے تفہیم اور عرشؔ شناسی میں سہولت میسر آئے۔ آس اور یاس کو اب تک ہم نے الگ الگ خانوں

میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔اب ہم عرشؔ کی ان کیفیات، جذبات اور رویوں کا مطالعہ کرتے ہیں جو ان کی آس اور یاس کی کشمکش سے تخلیقیت کی منزل تک پہنچے ہیں۔ یہ کیفیت یا رویّہ تخلیق کار کے لئے اتنا تلخ ہوتا ہے کہ اس کا شعور، لاشعور اور قلبی واردات گومگو کی کیفیات کے شکار ہوتے ہیں۔ دوم دل میں اٹھنے والی ہوک اور ذہن میں پلنے والی الجھن کچھ زیادہ ہی جگر آزما ہوتی ہے۔عرشؔ کی آس اور یاس کی بٹھی میں تیار ہونے والے امتزاجی مضامین کی انفرادیت یہ ہے کہ عرشؔ اولاً منطق تقاضے کے مطابق سماج، فرد، فرقہ واریت کی خرابی اور حیات کے منفی رویّے یا حالت کو پیش کرتے ہیں معاً ہی وہ اس خرابی کا حل منطقی اور اصلاحی طور پر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا بہ الفاظ دیگر، اس بوڑھی بکھری دنیا کے پراگندہ ماحول سے عرشؔ جوں ہی مایوسیت کی فضا میں کڑھنے لگتے ہیں فوراً ہی مصرعۂ ثانی میں اس کی پراگندگی کے دھوئیں سے اصلاح اور بہتری کی روشن کرن پا کر پُر امید ہوتے نظر آتے ہیں۔ گویا ان کی کیفیت کو اس حساس شخص کی حالت و کیفیت سے سمجھا جا سکتا ہے جو نفیس و پاکیزہ ظاہر و باطن کا مالک ہو۔ اچانک فضا کی پراگندگی سے دم گھٹنے کے بعد پاکیزہ، صاف و شفاف فضا میں پھر سے سانس لینے لگے۔ عرشؔ اگر زندگی کی تکالیف سے مایوس ہونے لگتے ہیں تو فوراً زندگی کی راحت و غم کے دونوں پہلوؤں کو منطقی اور استدلالی پیرایئے میں زندگی جینے کی راہ آسان بنا لیتے ہیں۔ اگر انہیں معاشرے کی فرسودہ روایات و رسومات سے گھٹن ہونے لگتی ہے تو ان کی درستگی کے لئے کمربستہ نظر آتے ہیں۔غرض کہ ان کے شعری مضامین میں انسانی ہمدردی، دردمندی، اخلاقی قدر، انسانی عظمت، حق گوئی اور جذبۂ اصلاح کے عناصر خمیر کا درجہ رکھتے ہیں۔عرشؔ نے تقسیمِ وطن کے دل سوز سانحہ کو بھی دیکھا۔ بعد تقسیم فرقہ وارانہ فسادات میں انسانی لہو کی نہروں کے علاوہ بنتِ حوا کی آبروریزی کے لبادے اڑتے ہوئے دیکھے۔ جموں و کشمیر کے شہروں، بازاروں اور گاؤں کو اجڑتے بستے، بستے اجڑتے ہوئے بھی مشاہدہ کیا۔ انہوں نے سماجی، سیاسی، معاشرتی اور ادبی تحریکوں اور رجحانات کی نبضوں کو بھی ٹٹولا ہے۔عرشؔ اگر چہ کسی تحریک یا رجحان سے وابستہ نہیں رہے لیکن پھر بھی ایک فن کار کے تخلیقی شعور پر اس زمانے کے حالات، تحریکات اور رجحانات کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ ہر تحریک، رجحان کی آواز اور رویّوں کو ہم ان

کی شاعری میں دیکھ سکتے ہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی کتاب ''زندگی'' ان کے سامنے رہی ہے۔ حالات و واقعات کا ابھرنا اور ڈھلنا، ایک فن کار کا بہت کچھ عرفانِ حیات و کائنات دے جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ذیل کے کلامِ عرشؔ میں ہم ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

- یادِ خزاں رہے سہے تنکے بھی لے اڑی　　　دے کر دلِ حزیں کو تسلّی بہار کی

اس شعر کو عرشؔ کے صغیر سنی کے حالات، شریکِ حیات کے گزر جانے اور عام حالات کی مختلف کروٹوں کے تناظر میں دیکھیں۔ مصرعۂ اوّل میں یاس کی کیفیت ''بادِ خزاں رہے سہے تنکے بھی لے اڑی'' سے طاری ہو رہی ہے لیکن مصرعۂ دوم میں یاس سے آس کے سفر کے لئے ''دے کر دلِ حزیں کو تسلّی بہار کی'' امید کی ایک راہ ''تسلّی'' نکالنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ پھر لسانی جمالِ ''بادِ خزاں'' اور ''تسلّی بہار کی'' متضاد ترکیبوں کے ذریعے پیدا کیا ہے۔ آس اور یاس کی اسی کشمکش کو آنے والے اشعار میں بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

- جامِ مے گو اپنی قسمت میں نہ تھا　　　پھر بھی ذکرِ جام ہم کرتے رہے
- غنیمت ہے کہ راحت و غم پہلو بہ پہلو ہیں
  وگرنہ زندگی بے کیف سا افسانہ بن جائے
- وقت کی سب ستم ظریفی ہے　　　ورنہ انسان بُرا نہیں ہوتا
- دنیا کی روایت نے برباد کیا ہے　　　دنیا کی روایات کو سلجھانا پڑے گا
- نظامِ نو کے اجارہ دارو، یہ خوب تنظیم ہے چمن کی
  کسی کو حاصل ہوا گلِ تر، کسی کو خارِ چمن ملا ہے
- سلسلہ ہائے رسوماتِ کہن چھوڑ گئے　　　اپنے اجداد کی جاگیر پہ رونا آیا
- وہ پستیٔ کردار ہو یا پستیٔ اخلاق　　　اس دور کی ہر بات کو سلجھانا پڑے گا
- بشر ہی سے اُمیدیں ہیں ہزاروں　　　بشر ہی کا چلن بگڑا ہوا ہے
- زندگی ایک مرقّع ہے غم و راحت کا
  خار و گل دونوں سے تزئینِ چمن ہوتی ہے

● رشتہ جو مصائب سے ہے توڑا نہیں جاتا　　اس ناؤ کو منجدھار میں چھوڑا نہیں جاتا

● راحتیں ابرِ رواں بن کر بکھر جائیں گی عرشؔ
زندگی کی ہر حقیقت غم کے پس منظر میں دیکھ

● وہی سفینہ کنارے پہ جا لگا آخر
جسے سمجھتے تھے سب ڈوب جانے والا ہے

● خودکشی لفظ دین ہے ان کی　　عرشؔ جو زندگی سے ہار گئے

● یہ زندگی کہ مدھو بن، بن ہے اس کو کیا کہیے
کہیں ہیں یاس کے کانٹے، کہیں ہیں آس کے پھول

عرشؔ کی شاعری میں زندگی کے جینے کا مثبت رویہ جھلکتا ہے۔ ایک مقام پر عرشؔ کا شعر پڑھ کر میر تقی میرؔ کی یاد آجاتی ہے۔ ممکن ہے عرشؔ کے تخلیقی شعور میں میرؔ کے شعر کا فیض رہا ہو۔ میر تقی میرؔ نے دنیا کی بے ثباتی پر تجربے کا اظہار کیا ہے۔ اس شعر کے پڑھنے کے بعد میرؔ کے یہاں زندگی کی آس نہیں رہتی۔ جب کہ عرشؔ نے اس یاسیت کی فضا کو اپنے تخلیقی شعور اور آسمانِ دل پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ عرشؔ کے یہاں کلی کھلی حسن و جمال کے ساتھ، اس کے کھلنے سے تو اُس کا مستقبل روشن نظر آتا تھا لیکن زمانے کی بے راہ روی نے اُس کے حسنِ آبرو کو غارت کر دیا۔ ان کے تخلیقی شعور اور تخیلی جست نے کلی کی بہاروں کو پُر جمال بنانے کی کوشش تو ضرور کی ہے لیکن زمانے کے ظالم ہاتھوں نے اُس کے حسین تبسم کو داغ دار بنا دیا۔ عرشؔ اور میرؔ دونوں کے شعر ملاحظہ ہوں ؎

● کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات　　کلی نے یہ سن کر تبسم کیا
(میرؔ)

● کلی جو پھول بنی، بے طرح بکھرتی گئی　　اسے کہا تھا تبسم سے ہم کنار نہ ہو
(عرشؔ)

عرشؔ کے شعر میں یاس کے ساتھ آس کے امکانی در بھی کھلتے ہیں۔ اگر ظالم، سیاہ کردار

کے ہتھے ''کلی''، نہ چڑھتی تو 'کلی' کا جوانی کے بعد جمال کچھ دو چند ہوتا۔ اس شعر کے ملفوظ متن کے علاوہ کچھ متن غیر ملفوظ یا محذوف بھی ہے، جسے ہر ذوقِ سلیم رکھنے والا قاری بخوبی سمجھ سکتا ہے اور اس شعر کے حسن سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

عرشؔ نے جہاں شاعرانہ اسلوب میں پیغامی اسلوب میں یاس سے یک دم نکلتے ہوئے آس کے جذبات کے ساتھ سماجی، تمدنی اصلاحی رویوں کو بھی پیش کیا ہے۔ سماج جہاں فرقہ وارانہ درندگی کی بدصورتی کا شکار نظر آتا ہے وہیں اسے انسانی قدروں کا پُر جمال چہرہ بھی دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جوں ہی وہ فرقہ واریت کی درندگی سے وحشت زدہ ہو کر نا اُمید ہونے لگتے ہیں، وہیں فوراً امیر کارواں بن کر اس کی درشتگی کے پیغام سناتے ہوئے تازہ نظر آتے ہیں۔ اس مقام پر عرشؔ فکرِ اقبالؔ اور اسلوبِ اقبالؔ کے قریب نظر آنے لگتے ہیں۔ اس کیفیت کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

- بزرگو، نوجوانو، ہم جلیسو اور وطن والو
  جنوں کے دائروں کو توڑ کر باہر نکل آؤ
- تمہیں گھیرے ہوئے ہے آہنی دیوار ظلمت کی
  دلوں میں نفرت و کینہ، نگاہوں میں حقارت سی

☆

- نہ جانے کس طرح تم کو سکوں ملتا ہے وحشت میں
  بہاتے ہو لہو تم دوسروں کا، یہ بھی سوچا ہے
- تمہارے جسم کا حصہ ہیں جن کو کاٹتے ہو تم
  تمہارا ہی لہو ہے یہ کہ جس کو چاٹتے ہو تم
- اٹھو ان پستیوں سے اور اس مذہب کو اپناؤ
  جسے انسانیت کہتے ہیں جو سب سے مقدس ہے

● چلو یہ عہد کریں حق کے راستے پر چلیں گے ہم
ہوا ہے آج تک جو اُس کو یکسر بھول جائیں گے

اس ارتقائی شعور کا تسلسل کے ساتھ مطالعہ کئے جانے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ عرشؔ کا تخلیقی شعور پہلے مایوس، پھر پر اُمید آخر کار یاس اور آس کی کشمکش میں الجھتا ہوا مضطرب روح کے ساتھ اپنے باطنی خول سے باہر نکل آتا ہے اور امیرِ کارواں بن کر معاشرے اور مذہب کے مصنوعی چہروں سے نقاب کشائی کرتے ہوئے ظلم و درندگی کی آہنی تاریک دیوار کو پھاند کر انسانی قدروں کے کشادہ میدان میں آ کر دم بھرتا ہے تا کہ اس جہاں کے جہنم کو جنت بنانے میں اپنا کردار ادا کر سکے۔

☆☆☆

ماخذ:

۱۔ شکست جام، عرشؔ صہبائی، مکتبہ اردو ادب جموں ۱۹۵۸ء
۲۔ شگفتِ گل، عرشؔ صہبائی، مکتبہ اردو ادب جموں ۱۹۶۱ء
۳۔ صلیب، عرشؔ صہبائی، چاند پریس جموں ۱۹۷۱ء
۴۔ یہ جھونپڑے یہ لوگ، عرشؔ صہبائی، مکتبہ اردو ادب جموں ۱۹۷۶ء
۵۔ اسلوب، عرشؔ صہبائی، مکتبہ اردو ادب جموں ۱۹۹۱ء
۶۔ ریزہ ریزہ وجود، عرشؔ صہبائی، ہندوستان آرٹ پریس جموں ۱۹۹۵ء
۷۔ اساس، عرشؔ صہبائی، یاسر گولڈن پبلشنگ ہاوس ۲۰۰۰ء
۱۱۔ توازن، عرشؔ صہبائی ۱۲۔ خوشبو تیرے بدن کی، عرشؔ صہبائی
۱۳۔ شبنم تیری یادوں کی، عرشؔ صہبائی
۱۴۔ عکس جمال، عرشؔ صہبائی، جے کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی، ۲۰۰۷ء
۱۵۔ نایاب، عرشؔ صہبائی
۱۶۔ چشم نیم باز، عرشؔ صہبائی ۱۷۔ چشم نیم باز، عرشؔ صہبائی
۱۸۔ عرشؔ صہبائی (اردو غزل کی عہد ساز شخصیت)، کوشل کرن ٹھاکر، مانوی پرکاش، پنج تیرتھی جموں ۲۰۱۳ء

☆.....ڈاکٹر اعجاز حسین شاہ

عرشؔ صہبائی کی نظمیہ شاعری

عرشؔ صہبائی کی رومانی نظموں کے مطالعے سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ ان کا عشق ارضی ہے اور ان کا محبوب کوئی خیالی یا تصوراتی محبوب نہیں بلکہ ہمارے سماج اور معاشرے سے تعلق رکھنے والا جیتا جاگتا محبوب ہے۔ عرشؔ صہبائی جذبۂ عشق کی تمام تر کیفیات سے بخوبی واقف ہیں۔ جب عاشق کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اُس کا محبوب پوری توجہ سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے تو اُس وقت عاشق پہ کس قسم کی کیفیت طاری ہوتی ہے اسے وہی محسوس کر سکتا ہے جس نے عشق کی لذت چکھی ہو اور جوان راہوں سے گزرا ہو۔ ان کی نظموں کے درج ذیل اشعار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کا گزر بھی ان راہوں سے ہوا ہے:

بہت ہی تیز ہوجاتی ہیں دل کی دھڑکنیں اس پر
طبیعت بے طرح جس سے مری گھبرانے لگتی ہے
نہ جانے ڈوب سی جاتی ہیں کیوں احساس کی نبضیں
نظر میں دور تک اک برق سی لہرانے لگتی ہے

(دو آنکھیں)

میرے ارمان بھی بے تاب سے ہو اُٹھتے ہیں
میں بھی انسان ہوں، انسان سے بڑھ کر تو نہیں

مجھ پہ بھی مست نگاہوں کا اثر ہوتا ہے
میرے پہلو میں بھی دل ہے، کوئی پتھر تو نہیں

(شکوہ)

عرشؔ صہبائی کا گزرا ہوا وقت مایوسیوں اور تلخیوں کے باوجود کئی خوبصورت اور دل کش یادوں سے وابستہ ہے جن کا تذکرہ انہوں نے نازک جذبات، خوبصورت تشبیہات و پیکر تراشی کے ذریعے نہایت ہی فنکاری کے ساتھ اپنی بعض رومانی نظموں میں کیا ہے۔ محبوب کا وصل، ناز و نیاز کی باتیں، گلے شکوے، ز ونخرے، روٹھنا منانا اور دل آویز حسن و ادائیں ایسی شیریں یادیں ہیں جو عالم خلوت میں ان کو رہ رہ کر تڑپاتی ہیں۔ اس ضمن میں ان کی نظم ''یادِ رفتہ'' کے یہ بند دیکھئے جن میں ہجر و فراق، کسک اور تڑپ اور سوز و گداز کی کیفیت پائی جاتی ہے:

تمہارے ذہن پر نقش ہوں گی کچھ حسیں یادیں
مرے دل جو تنہائی میں اکثر گدگداتی ہیں
تمہارے قرب میں بیتی ہوئی وہ دل نشیں گھڑیاں
مرے احساس میں فانوس بن کر جگمگاتی ہیں
وہ پہروں چاندنی شب میں ادائے بے نیازی سے
تمہارے نو شگفتہ ہونٹ محوِ نغمہ آرائی
وہ ساکت سی فضا میں چار جانب اک حرارت سی
وہ بے حس زندگی میں اک حیات افروز انگڑائی

☆

غمِ دوراں کے ہاتھوں پھر نہ دیکھی شکل تک اُن کی
مگر سنتے ہیں اب بھی چاندنی میں مسکراتی ہیں
جہاں سے ہم کبھی دونوں ترنم باز گزرے تھے
وہ راہیں آج بھی تنہائیوں میں گنگناتی ہیں

عرشؔ صہبائی ایک زندہ دل عاشق ہیں۔ انہیں خلوت میں اپنے محبوب کی یاد تو ستاتی ہے، اس کی جدائی کا غم تو تڑپاتا ہے لیکن اس کی نوبت چاکِ گریباں تک نہیں پہنچتی۔ وہ ایک کمزور دل اور بے بس عاشق کی مانند دردِ فراق سے گھبرا کر تمنائے وصل کی خاطر دوزانو ہو کر گریہ وزاری نہیں کرتے بلکہ اپنے محبوب کے وصل سے زیادہ زندگی میں رونما ہونے والے مصائب وآلام کا سامنا کرنے، مایوسیوں اور تلخیوں سے نبرد آزما ہونے کو حاصلِ زندگی سمجھتے ہیں۔ دراصل ان کے یہاں رومانی اور خالص جمالیاتی اقدار سے زیادہ زندگی کی دوسری قدریں معنویت رکھتی ہیں:

اپنے جلووں کو ابھی رہنے دو پابندِ نقاب
میری نظروں کو ابھی دید کی فرصت ہی نہیں
میں گرفتار ابھی اور ہی افکار میں ہوں
مجھ کو اس لطف و عنایت کی ضرورت ہی نہیں

(شکوہ)

تیرا ہر ناز گوارا ہے مرے دل کو مگر
تیرے ارشاد کی تعمیل نہیں ہوسکتی
میں گرفتارِ مصائب ہوں، مری دنیا میں
تیرے جذبات کی تکمیل نہیں ہوسکتی

(خواب)

ان مذکورہ اشعار میں اردو زبان وادب کے نامور نظم نگار فیض احمد فیض کا ''اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا'' والا انداز بیان اور لب ولہجہ دیکھنے کو ملتا ہے۔

عرشؔ صہبائی ترقی پسند تحریک سے وابستہ تو نہیں رہے لیکن سماج کا ایک بیدار ذہن اور حساس فنکار ہونے کے سبب ان کی شاعری پر اس تحریک کے اثرات صاف دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی نظمیہ شاعری میں معاشرے کی فلاح و بہبود کے علاوہ انقلابی جذبہ بھی موجود ہے۔ انہوں نے اپنی نظمیہ شاعری میں متوسط طبقے اور بالخصوص پست طبقے کے لوگوں کے مسائل کو سماج کے

سامنے لانے کی جو کوشش کی ہے اس میں وہ پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کی نظم ''یہ جھونپڑے یہ لوگ'' کے یہ بند دیکھئے جس میں انہوں نے جھونپڑوں میں زندگی بسر کرنے والے مفلس لوگوں کی تنگ دستی اور بے بسی کا پورا خاکہ بڑی خوبی وفنی مہارت سے پیش کیا ہے۔

- یہ رینگتے ہوئے تاریک جھونپڑوں کے مکیں — یہاں کے لوگ ہیں یا چلتی پھرتی لاشیں ہیں
  ہر ایک دل پہ کئی زخم ہیں تمنا کے — ہر ایک روح پہ غم کی کئی خراشیں ہیں
- ہیں دل شکستہ بہت وقت کے مظالم سے — مگر یہ صابر و شاکر ہیں فاقہ مستی میں
- کہاں سے لائے کوئی ان کے حوصلے کا جواب — گلہ زبان پہ نہیں کوئی تنگدستی میں

سماج اور معاشرے کی فلاح و بہبودی اور نچلے طبقے کے مسائل کی عکاسی کے علاوہ ان کی نظموں میں ترقی پسند شعراء جیسا انقلابی جذبہ بھی موجود ہے جس کی مثالیں ان کی حب الوطنی پر لکھی گئی نظموں میں آسانی سے مل جاتی ہیں۔ اس ضمن میں ان کی نظم ''میرے وطن! میرے حسیں خواب کی تعبیر'' کا یہ بند یکھئے:

مر مٹنے کی رنگین ادا لے کے اُٹھے ہیں
دیوانے ترے عزم نیا لے کے اُٹھے ہیں
اک ہاتھ میں پرچم ہے تو اک ہاتھ میں شمشیر
اے میرے وطن! میرے حسین خواب کی تعبیر

عرشؔ صہبائی ایک حقیقت پسند اور راست گو انسان ہیں۔ ان کی نظم ''سقراط'' کے یہ چند اشعار دیکھئے جن میں انہوں نے اپنی حقیقت پسندی اور راست گوئی کا بیان پُرکشش انداز میں کیا ہے:

میں ہوں اس دور کا سقراط مجھے قتل کرو
زہر کا کوئی اثر مجھ پہ نہیں ہوسکتا
رنج اٹھاتا ہوں میں اظہارِ حقیقت کے لئے
میرے سینے میں ہیں رستے ہوئے زخموں کے نشان

میری آنکھوں میں عجب نشہ، عجب عالم ہے
میری رگ رگ میں ہے زہرابِ الم کی مستی
میں ترس جاتا ہوں اے کاش کوئی مجھ کو ملے
دبے الفاظ میں اس بات کی تصدیق کرے

☆

آج کے دور میں نایاب نہیں حق گوئی
آج کے دور کا سقراط ابھی زندہ ہے

☆

عرشؔ صہبائی کی چھ مصرعوں پر مشتمل مسدس کی ہئیت میں لکھی گئی نظم ''ادائے سلام'' روانی، بندش کی چستی، زبان اور انداز و اسلوب کے اعتبار سے ایک عمدہ نظم ہے۔ ادبی حلقوں میں اس نظم کی کافی سراہنا ہوئی۔ دراصل یہ نظم جوشؔ ملیح آبادی کی ایک نظم میں شامل مصرعہ ''اُس نے مجھے سلام کیا کس ادا کے ساتھ'' پر تضمین ہے۔ عرشؔ صہبائی نے اس مصرعہ پر اتنی خوبصورت تضمین کر کے اپنی اُستادانہ مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے بھی یہ نظم جوشؔ کی نظم سے مماثلت رکھتی ہے۔ عرشؔ صہبائی کی اس نظم کو دیکھئے:

چہرے سے اپنے گیسوئے مشکیں سنبھال کر
پردے سے اپنا چاند سا مکھڑا نکال کر
بانکی ادا سے ریشمی آنچل اُچھال کر
دیوانہ وار آنکھوں میں آنکھوں کو ڈال کر
کچھ مسکرا کر اور جبین تک اٹھا کے ہاتھ
اُس نے مجھے سلام کیا کس ادا کے ساتھ

اب جوشؔ ملیح آبادی کی اس نظم کو ملاحظ کیجئے جس کے مصرعہ پر عرشؔ کی مذکورہ بالا نظم تضمین ہے اور یہ اندازہ کیجئے کہ کس قدر خوبصورت تضمین ہے۔

آنکھوں میں غنچہ ہائے نوازش نچوڑ کر
میرے دلِ شکستہ کو نرمی سے جوڑ کر
ہونٹوں پہ نیم موجِ تبسم کو توڑ کر
مری طرف خفیف سی گردن کو موڑ کر
کل صبح راستے میں سہانی حیا کے ساتھ
اُس نے مجھے سلام کیا کس ادا کے ساتھ

عرشؔ صہبائی کی نظمیہ شاعری میں منظر نگاری، جذبات نگاری اور فطرت کی منظر کشی کے وہ اعلیٰ نمونے نہیں ملتے جو ہمیں ان سے قبل نظم نگار شعرا نظیرؔ، چکبستؔ، محرومؔ، جوشؔ، فیضؔ، مخدومؔ اور اخترؔ شیرانی وغیرہ کی نظموں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ عرشؔ صہبائی نے اپنی نظمیہ شاعری میں زیادہ توجہ موضوع، ہئیت اور زبان و اسلوب پر مرکوز رکھی لیکن جہاں کہیں انہیں موقع ملا تو اپنی نظموں میں منظر نگاری اور جذبات نگاری کے نمونے بھی پیش کیے۔ ان کی نظم ''کھوکھلے جسم، بے تاب روحیں'' کے یہ اشعار دیکھئے جن میں انہوں نے کینسر کی بیماری میں مبتلا مریضوں کے جذبات کی عکاسی بڑے سلیقے اور موثر انداز سے کی ہے:

منتظر موت کا ہر کوئی نظر آتا ہے
کھوکھلے جسم ہیں جو کرب میں ہیں ڈوبے ہوئے
اور بے تاب ہیں روحیں کہ ملے ان کو نجات
کاٹے کٹتے نہیں ہیں قید کے لمحاتِ حزیں
تلخ ہے زہر مگر پھر بھی پیے جاتے ہیں
نا اُمیدی میں بھی یہ لوگ جیے جاتے ہیں

اس طرح کی ہلکی سی جذبات نگاری ان کی اکثر نظموں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ انہوں نے اپنی نظم ''یہ جھونپڑے، یہ لوگ'' میں جھونپڑوں اور ان میں رہنے والے لوگوں کی حالتِ زار کے جو مناظر پیش کیے ہیں وہ قابل تحسین ہیں۔ اس ضمن میں ان کی اس نظم کے یہ دو بند دیکھئے:

یہ جھونپڑے بھی عجب ہیں کہ جن میں شام و سحر
خوشی کا ذکر نہیں، راحتوں کا نام نہیں
بڑا کثیف اندھیرا ہے ان کی قسمت میں
کوئی بھی دن نہیں ایسا جو مثلِ شام نہیں
یہ بے بسی، یہ نحوست، یہ یاسیت کہ یہاں
عروسِ سرخوشی آتے ہوئے جھجکتی ہے
عجب گھٹن ہے عجب زہر ہے فضاؤں میں
حیات اپنے مقدر پہ ہاتھ ملتی ہے

عرشؔ صہبائی نے اپنی نظمیہ شاعری میں زبان واسلوب کی طرف خاص توجہ دی ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں سادہ، سلیس، رواں اور شائستہ زبان کا استعمال فنی مہارت سے کیا ہے۔ الفاظ کا توازن اور اشعار میں ان کا بلیغ استعمال، مصرعوں کی بندش وچستی، خوبصورت تشبیہات اور دل کش استعارات کے برمحل استعمال نے ان کی نظموں کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں کہیں بھی علامتی انداز اختیار نہیں کیا۔ انھوں نے ہر موضوع کو نظموں میں سیدھے سادھے انداز میں بڑی خوبی، ندرت و جدت سے بیان کیا ہے۔ ان کی رومانی نظموں میں غزل اور خاص کر تغزل کا گہرا رنگ پایا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی غزلیہ شاعری کی طرح نظمیہ شاعری میں بھی تفصیل کے بجائے ایجاز واختصار کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ ان کی نظمیں مختصر ہونے کے باوجود اپنے اندر وسیع مفہوم رکھتی ہیں۔ غزلوں کی نسبت ان کی نظموں کی تعداد بہت کم ہے لیکن انھوں نے جو نظمیں تخلیق کی ہیں وہ قابلِ رشک ہیں۔

☆......ڈاکٹر کوشل کرن ٹھاکر

عرشؔ۔ یہ نصف صدی کی ہے عبادت میری

(مختلف شعری مجموعوں کا اجمالی جائزہ)

عرشؔ صہبائی کو ریاست جموں وکشمیر کے اُردو شعراء میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ اگر چہ اُنہوں نے شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے جن میں غزل، قطعہ، نظم اور دوہا شامل ہیں لیکن بنیادی طور پر اُن کی طبیعت غزل گوئی کی طرف مائل ہے اور اسی میدان میں عالمی سطح پر اُن کی پہچان قائم ہوئی ہے۔ اُن کے زیادہ شعری مجموعے غزلیات پر مشتمل ہیں۔ ایسا نہیں کہ اُن کے جو مجموعے نظم، قطعہ اور دوہا سے تعلق رکھتے ہیں وہ کسی طرح بھی کم اہمیت کے حامل ہیں۔ موصوف نے جن اصناف میں طبع آزمائی کی ہے وہ اُن کے فنی رموز سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کے اظہارِ اسالیب پر اُنہیں پوری قدرت حاصل ہے۔ اُن کی شاعری محض رسمی شاعری نہیں بلکہ اس میں روایت اور جدت کا حسین امتزاج ہے۔ یہاں روایت سے مُرادفن ہے۔ اُن کے کلام میں بالخصوص غزلوں میں جدیدیت کے ساتھ ساتھ کلاسیکی شاعری کا لوچ اور رس ملتا ہے۔ حیرت کا مقام ہے کہ وہ جدید شاعری کے سخت مخالف ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اُن کی نظر میں جدید شاعری ابہام کا دوسرا نام ہے جو فنّی لوازمات سے بہت پرے ہے۔ اُنہوں نے زندگی میں اپنے دور کی مختلف تحریکوں کے علاوہ واقعات و حادثات کو اپنی شاعری میں نمایاں جگہ دی۔ اُنہوں نے عوام کے دلوں کی دھڑکنوں کو محسوس کیا اور انہیں اشعار میں ڈھالنے کی

کوشش کی جس میں وہ بے حد کامیاب ہیں۔ اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ اُن کے بیشتر اشعار زبان زدِ خواص و عوام ہیں۔ اُنہوں نے تقریباً تمام موضوعات پر غزلیں کہی ہیں۔ لہٰذا غم جاناں اور غم دوران کے ساتھ ساتھ سماجی نابرابری، سیاست اور دوسری سماجی بُرائیوں پر بھی طنز کے نشتر چلائے ہیں اور یہ نشتر قاری کے دل میں اُتر جاتے ہیں کیونکہ ان کا تعلق حقائق سے ہوتا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو جو اُن کی نظر سے بچ گیا ہو۔ اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ بعض ایسے موضوع بھی ہیں جنہیں آج تک کسی شاعر نے نہیں چھوا۔ اُن کے خیالات کا نیا پن اور جدتِ اسلوب باعثِ کشش ہے۔ نصف صدی سے بھی زیادہ اپنے تخلیق سفر میں عرشؔ صہبائی نے اُردو ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ ہر لحاظ سے ناقابلِ فراموش ہیں۔

اب اُن کے مجموعوں کا اجمالی جائزہ لیا جائے گا تا کہ اُن کے بارے میں ہم نے جو رائے قائم کی ہے اُس کا جواز مل سکے۔ آج دُنیائے شاعری میں اُن کی شاعری کی گونج ہے جو چند لوگوں کو چھوڑ کر ہر ذی فہم اور باشعور قاری کو صاف سنائی دیتی ہے۔

شکستِ جام:

''شکستِ جام'' عرشؔ صہبائی کا سب سے پہلا مجموعۂ کلام ہے جو ۱۹۵۸ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ جس نسخہ کا ہم حوالہ دے رہے ہیں یہ طبع ثانی ہے۔ جہاں تک اس مجموعے کی اشاعتِ اوّل کا تعلق ہے وہ بہت کم وقت میں نایاب ہوگیا۔ اس سے اس مجموعہ کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ طبعِ ثانی کا نسخہ حاصل کرنے میں بھی مشکل پیش آئی۔

عرش صہبائی کا یہ مجموعہ اپنی فنّی خوبیوں کی وجہ سے بہت مقبول ہوا۔ اگرچہ ''شکستِ جام'' پر رسائل میں جو تبصرے ہوئے اُن میں کہیں کہیں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ مجموعہ میں ان کا منتخب کلام شامل ہے جب کہ حقیقت میں یہ بات نہیں ہے۔ اُن کے کلام میں بھرتی کا کوئی شعر نہیں ہوتا اس لئے اُن کے کلام کو منتخب کلام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ ان کا ابتدائی مجموعہ ہے اس لئے ہم شاعر سے مضمون آفرینی کی توقع بھی نہیں رکھتے جبکہ اس کے بعد شائع ہونے والے

مجموعوں میں مضمون آفرینی عام ہے۔

مجموعہ میں شامل ایسے اشعار کی تعداد زیادہ ہے جن میں ساقی، جام، مے خانہ اور شراب وغیرہ کا ذکر ہے۔ یعنی اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جام وصہبا کی مختلف کیفیات سے خوب آشنا ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ''شکستِ جام'' میں جو کلام شامل ہے وہ اُس وقت کہا گیا تھا جب وہ اس کیفیت سے آشنا نہیں تھے۔ اس شعر میں انہوں نے خود اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

جامِ مے گو اپنی قسمت میں نہ تھا
پھر بھی ذکرِ جام ہم کرتے رہے

عرشؔ ساقی اور مے خانے کے پردے میں عجیب وغریب مضامین نکال لیتے ہیں۔ مثلاً واعظ، شیخ اور برہمن وغیرہ پر طنز ہر شاعر کے ہاں موجود ہے۔ عرشؔ بھی شیخ پر عجیب انداز میں طنز کرتے ہیں۔

جنابِ شیخ بھی آئے ہیں اے ساقی زیارت کو
عقیدت ہے انہیں بھی تیرے میخانے سے تھوڑی سی

یہاں ''زیارت'' اور ''عقیدت'' کے استعمال نے عرشؔ صہبائی کے اندازِ شعر گوئی کو بالکل الگ کر دیا ہے۔ مے کے سرور سے انسان لڑکھڑا جاتا ہے، ٹھوکریں کھاتا ہے، گرتا ہے لیکن عرشؔ صاحب ایک دوسری صورت بیان کر رہے ہیں۔ یہ خیال واقعی ایک نیا خیال ہے۔

ہر گام پر تھیں ٹھوکریں راہِ حیات میں
لیکن بہ فیضِ ساغر و مینا سنبھل گئے

اسی نوعیت کا یہ شعر بھی دیکھئے۔

مے کدے میں جب میسر ہے سکون
کون کافر سجدۂ دیر و حرم کرتا رہے

وہ زمانے کے غموں کی نجات مے کشی میں تلاش کرتا ہیں۔ ایک شعر میں فرماتے ہیں۔

ہم بادہ کشی ترک تو کرسکتے ہیں لیکن
دل پر غمِ دوراں کا اثر اور بڑھے گا

عرشؔ اُس زمانے میں جوشؔ ملیح آبادی سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اُن کے مضامین کو عرشؔ نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ جوشؔ اپنی اس رباعی میں جبرئیل سے جس انداز سے بات کرتے ہیں وہ انہیں کا حصّہ ہے۔ یہ انداز اور اسلوب جوشؔ ہی کے ہاں مل سکتا ہے۔ دوسرے کسی شاعر کی کیا مجال کہ وہ فرشتے سے اس طرح کلام کرے۔ یہ رباعی ملاحظہ کیجئے۔

یہ رات گئے عین طرب کے ہنگام
پرتو پر پڑا پشت سے کس کا سرِ جام
تم کون ہو؟ جبرئیل ہو، کیوں آئے
سرکار! فلک کے نام کوئی پیغام

یہ جلالِ شعری جوشؔ کے سوا شاذ ہی کسی کے ہاں ہو۔ عرشؔ کے ہاں بھی اس کا ہلکا سا پرتو کہیں کہیں نظر آجاتا ہے۔

یہ کس نے صدا دی درِ ہستی پہ اجل نے
کہو دو کہ ٹھہر جائے ابھی کام بہت ہے

مناسب یہ ہوگا کہ ہم ''شکستِ جام'' سے مختلف نوعیت کے اشعار قارئین کی خدمت میں پیش کریں جن میں مختلف تجربات ہیں، مختلف خیالات ہیں۔ یہ تمام باتیں عرشؔ صاحب کو اُن کے اندازِ بیان اور اسلوب کے ذریعہ دوسروں سے الگ کرتی ہیں۔ ایسا صرف طوالت کے پیشِ نظر کیا جارہا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہیں ہوگا کہ عرشؔ صہبائی کی شاعری اور اُن کی زندگی میں کوئی فرق نہیں۔ وہ اپنے کہے پر عمل پیرا بھی ہیں۔

- ڈھونڈتا پھرتا ہے جاکے جس کے بُت خانے میں تو — خدمتِ مخلوق میں ہے وہ ثوابِ زندگی!
- آدمی آفاتِ ہستی سے اگر چاہے نجات — مشکلوں کا خیر مقدم ہر قدم کرتا رہے
- تنگ آکر موت کو آواز دینا کچھ نہیں — موت سے پیدا کوئی جینے کی صورت کیجئے

- ہے لذتِ حیات سے نا آشنا ابھی وہ بدنصیب دل کہ جو محروم غم سے ہے
- جھیلتا ہے جان پر جو سختیاں زندہ رہنے کا وہی حقدار ہے
- ممکن نہیں کہ عقدۂ تقدیر وا نہ ہو انساں کرے جو کوششِ پیہم تو کیا نہ ہو
- غنیمت ہے کہ راحت اور غم پہلو بہ پہلو ہیں وگرنہ زندگی بے کیف سا افسانہ بن جائے

مجموعے کے آخر میں عرشؔ نے ایک قطعہ بہ عنوان ''ادائے سلام'' شامل کیا ہے۔ یہ موضوع جوشؔ ملیح آبادی کے ایک قطعہ میں شامل مصرعہ ''اُس نے مجھے سلام کیا اس ادا کے ساتھ'' پر تضمین ہے۔ جب عرشؔ کے کلام پر ایم فل کیا گیا تھا تو اُس میں اس قطعہ کے حوالے سے لکھا گیا تھا کہ یہ چربہ معلوم ہوتا ہے۔ حق بات یہ ہے کہ یہ اُن کے مصرعہ پر تضمین ہے۔

چہرے سے اپنے گیسوئے مشکیں سنبھال کر
پردے سے اپنا چاند سا مکھڑا نِکال کر
بانکی ادا سے ریشمی آنچل اُچھال کر
دیوانہ وار آنکھوں میں آنکھوں کو ڈال کر
کچھ مسکرا کر اور جبیں تک اٹھا کے ہاتھ
اُس نے مجھے سلام کیا کس ادا کے ساتھ

جوشؔ کا قطعہ بھی دیکھئے۔

آنکھوں میں غنچہائے نوازش نچوڑ کر
مرے دلِ شکستہ کو نرمی سے جوڑ کر
ہونٹوں پر نیم موجِ تبسم کو توڑ کر
مری طرف خفیف سا گردن کو موڑ کر
کل صبح راستے میں سہانی حیا کے ساتھ
اُس نے مجھے سلام کیا کس ادا کے ساتھ

اب قارئین خود اس کا فیصلہ کریں کہ کتنی خوبصورت تضمین ہے۔

شگفتِ گل:

''شگفتِ گُل'' عرشؔ صہبائی کا دُوسرا مجموعہ کلام ہے جو ۱۹۶۱ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ یہ مجموعہ ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ پہلے مجموعے کے تین سال کے قلیل عرصہ کے بعد شائع ہوا۔ چونکہ شاعر کی طبیعت میں آمد ہے اس لئے یہ قلیل عرصہ حیرت انگیز نہیں۔ اس مجموعہ میں ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ ہر غزل کے ساتھ جناب او۔ پی۔ شرما کی بنائی گئی سکیچ نُما تصویریں ہیں۔ جو اس انداز سے بنائی گئی ہیں کہ شعر کا مفہوم سمجھنے میں آسانی ہو۔ دُوسرے معنوں میں تصویروں کی زبانی غزلوں کی شرح کی گئی ہے ورنہ ان کے بغیر بھی اشعار کا مفہوم واضح ہے۔ ''شگفتِ گُل'' کے بھی دو ایڈیشن شائع ہوئے تھے۔ دوسرا ایڈیشن سکیچ نما تصویروں کے بغیر ہے کیوں کہ عرشؔ صہبائی کی شاعری جدید شاعری نہیں کہ جو ابہام سے پُر ہو اور شاعر سے یہ پوچھنا پڑے کہ اُس نے کیا کہا ہے۔ اس مجموعے کا انتساب ہر اُس شخص کے نام ہے جسے اُردو زبان سے محبت ہے۔ اس مجموعہ کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کا فن خاصی ترقی کر چکا ہے۔ ''شگفتِ جام'' اور ''شگفتِ گُل'' میں نمایاں فرق دکھائی دیتا ہے۔ اگر ''شگفتِ جام'' میں شراب، ساقی، رند، میخانہ ایسے الفاظ اور علامتوں کی بالا دستی تھی تو ''شگفتِ گُل'' میں زندگی کے مختلف حقائق اور مسائل کی طرف توجہ دی گئی ہے اور اس انداز کے اشعار عرشؔ کے قلم سے نکلے ہیں۔

- اے گرفتارِ روایاتِ کُہن — زندگی ہے خالقِ صد انقلاب
- آدمی کو کرنا پڑتا ہے سرِ تسلیم خم — دب نہیں سکتی کبھی جو وقت کی آواز ہے
- اس سے پھوٹیں گے ہمیشہ نغمہ ہائے رنج و غم — موت کے ہاتھوں میں جب تک زندگی کا ساز ہے

اس مجموعے میں عرشؔ زمانے سے ٹکر لیتے دکھائی دیتے ہیں اور ہر روایت اور رسم کو بدل دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ زندگی کے پورے نظام سے نالاں نظر آتے ہیں۔ یہ شعر دیکھئے۔

- بدلنا ہے مجھے اے عرشؔ زندگی کا نظام — بلا سے لاکھ رُسومِ کہن کے پہرے ہیں
- دُنیا کی روایات نے برباد کیا ہے — دُنیا کی روایات کو سُلجھانا پڑے گا

● اگرچہ آئیں گی مشکلیں بھی، اگرچہ کھائیں گے ٹھوکریں بھی
مگر نہ ہاریں گے اپنی محبت بدل کے رکھ دیں گے ہم زمانہ

عرشؔ اس مجموعے میں پہلے سے بھی زیادہ جوش اور ولولے کے ساتھ کمربستہ نظر آتے ہیں۔ وہ جس طرح کا انداز اور اسلوب اختیار کرتے ہیں وہ اُنہیں ترقی پسند شعراء کی صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

● سلسلہ ہائے رسوماتِ کہن چھوڑ گئے — اپنے اجداد کی جاگیر پہ رونا آیا
● کٹتی ہے تو کٹ جائے زباں اپنی مگر ہم — ظلمت کو کسی طور ضیا کہہ نہیں سکتے
● نظامِ نو کے اجارہ دارو یہ خوب تنظیم ہے چمن کی — کسی کو حاصل ہوا گُلِ تر کسی کو خارِ چمن ملا ہے

اس مجموعہ میں عرشؔ کا فن اور نکھر گیا ہے کلام کی تاثیر میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ پہلے مجموعے کی نسبت انداز اور اسلوب میں مزید روانی آئی ہے بلکہ زیادہ شگفتگی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کا ایک سبب شاید یہ رہا ہو کہ تبصرہ جات اور آراء جو "شکستِ جام" پر ہوئے وہ عرشؔ کے لئے بڑے حوصلہ افزا تھے۔ اِن سے اُن کے شعور کی پختگی پر بھی اثر پڑا۔ انہوں نے شاعری کی ابتدائی منازل میں ہی ثابت کر دیا کہ وہ اپنے جذبات اور خیالات کو اُستادانہ مہارت کے ساتھ پیش کرنے کا ہُنر جانتے ہیں لیکن بقول عرشؔ اُن کے کلام میں جو خوبیاں بھی ہیں قدرتی ہیں۔ وہ ایک طالب علم ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ اُن کے یہ اشعار بھی توجہ طلب ہیں ۔

● وہ پستیٔ کردار ہو یا پستیٔ اخلاق — اس دوّر کی ہر بات کو سلجھانا پڑے گا
● بشر ہی سے اُمیدیں ہیں ہزاروں — بشر ہی کا چلن بگڑا ہوا ہے

اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ عرشؔ ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ اُن کا شعور پُختہ ہے۔ غزل کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ زبان و بیان پر قدرت اور خیال میں ندرت ہونے کے باعث اُن کے کلام میں تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی اور معمولی سے معمولی بات کو بھی اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ وہ بے حد دلکش اور پُر تاثیر ہو جاتی ہے۔ لہجے میں نرم روی اور زبان میں مٹھاس ایسی خصوصیات ہیں جو عرشؔ کو غزل گو شعراء میں ایک خاص مقام عطا

کرتی ہیں۔ اس مجموعے میں خیال کی بلندی، جذبات کی عکاسی، نازک خیالی اور تخیل پروازی کی جگہ جگہ اچھی مثالیں مل جاتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

- عرشؔ پھر کچھ بھی نہیں لُطف سخن گوئی کا ۔۔۔ بات میں حُسنِ سخن کا اگر انداز نہ ہو
- بے زبانی بھی تو رکھتی ہے زباں ۔۔۔ خامشی بھی عالمِ تقریر ہے
- کُچھ نہیں کھُلتا نظر کے سامنے ۔۔۔ آپ ہیں یا آپ کی تصویر ہے
- ہر گھڑی، ہر پل نئی فکرِ مُدام ۔۔۔ آپ کو ہے کس قدر میرا خیال

عرشؔ زندگی میں ناکامیابی کو کامیابی کی پہلی سیڑھی گردانتے ہیں اور ہر حال میں جینے کی تلقین کرتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ چاہئے راہ میں کتنی ہی مشکلات آئیں اُن کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہئے۔ بقول اُن کے وہی شخص عزت کے قابل ہے جو اپنا راستہ خود بناتا ہے۔ اس طرح وہ حالات کا رُخ موڑ دیتا ہے۔ اُن کے یہ اشعار دیکھئے۔

- تعظیم کے قابل ہے وہی شخص جہاں میں ۔۔۔ جس شخص نے حالات کا منہ موڑ دیا ہے
- مبارک ہے رہِ ہستی میں یہ ناکامیٔ پیہم ۔۔۔ جو منزل دُور ہو تو شوقِ منزل تیز ہوتا ہے

زندگی میں تجربات و مشاہدات کی وسعت کے ساتھ ساتھ عرشؔ کی شاعری میں بھی وسعت پیدا ہوئی اور اُنہوں نے بادہ، ساغر اور حسن و عشق جیسے روایتی مضامین کے دائرہ سے اپنے آپ کو نکال کر زندگی کی حقیقتوں کو اپنانا شروع کر دیا۔ جس کا ثبوت ہمیں اُس وقت مل جاتا ہے جب ہم ''شکستِ جام'' کے شاعر کو ''شگفتِ گل'' میں ایک نئے انداز سے نغمہ سرا دیکھتے ہیں۔

صلیب:

''صلیب'' ۱۹۷۱ء میں منظر عام پر آیا۔ عرشؔ صہبائی کا یہ شعری مجموعہ بے حد مقبول ہوا۔ اگر چہ اس مجموعے کی بیشتر غزلیں طویل بحر میں ہیں لیکن ان کے اثر اور تاثیر میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ عرشؔ اس میں فنی اور معنوی اعتبار سے پختہ تر نظر آتے ہیں۔ اس مجموعہ میں شامل کلام میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ وہ زندگی کی مختلف کیفیات کی ترجمانی بھی کرتے ہیں اور تخیل کو بھی

کام میں لاتے ہیں۔ قہقہے بھی لگاتے ہیں اور طنز کے تیر بھی چلاتے ہیں۔ زندگی کے حقائق کو نہایت دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں۔ عرش حق گو ہی نہیں بے باک اور صاف گو بھی ہیں۔ اس بات کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

عرش بے باکی و حق گوئی ہے مذہب اپنا
ہم نہ بدلیں گے کبھی وقت کی چالوں کی طرح

ایک اور شعر دیکھئے۔

ان سخت مراحل سے گزرنا نہیں آساں
بے باکی و حق گوئی بھی اک کوہ کُنی ہے

عرش خود عزم و حوصلے والے انسان ہیں اور عزم و حوصلہ ہی کی تلقین وہ دوسروں کو بھی کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک دُنیا کی مشکل سے مشکل منزل بھی عزم و حوصلہ سے پائی جا سکتی ہے۔

عزم سے ہوتے ہیں حل سب مسئلے
عزم سے کٹتی ہے زنجیریں کئی

وہ عزم و حوصلہ کے اس قدر قائل ہیں کہ وہ اُسے تقدیر سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اُن کا یہ شعر و دیکھئے۔

جن کی رگ رگ میں رواں ہو جذبۂ عزم و عمل
موڑ دیتے ہیں وہی رُک گردشِ تقدیر کا

عرش حوصلے اور عزم کے ساتھ ساتھ انسان کے دل کو محبتوں سے معمور دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُن کے نزدیک محبت وہ جذبہ ہے جو انسان کو صحیح معنوں میں انسان بناتا ہے۔ اُن کے خیال میں محبت سے نفرت کی تاریکیوں میں اُجالے کی کرن پھوٹتی ہے۔ محبت ہر قسم کے اندھیرے کو دُور کر دیتی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ فرمایئے۔

دل محبت سے اگر معمور ہے
ظلمتوں میں بھی ہیں تنویریں کئی

اگر محبت کا جذبہ دل میں ہوگا تو انسان، انسانوں کی طرح رہے گا۔ ایک دوسرے کے دُکھ میں شامل ہوگا۔ جو عوام اور ملک دونوں کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ موصوف ایک جگہ کہتے ہیں۔

عرشؔ جب تک ہندو مسلم یہاں ہیں متحد
بال بیکا کر نہیں سکتا کوئی کشمیر کا

عرشؔ کے کلام میں کشمیر کا ذکر کئی حوالوں سے ہوا ہے، کبھی وہ محبوب کی خوبصورتی کا مقابلہ کشمیر سے کرتے ہیں تو کبھی اس کی ٹھنڈی اور معطر ہوا کو محبوب کی یاد سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔

رُوح کو اک تازگی ملتی ہے اُن کی یاد سے
وادیٔ کشمیر کی ٹھنڈی ہواؤں کی طرح

یہ جھونپڑے یہ لوگ:

۱۹۷۶ء میں ''یہ جھونپڑے یہ لوگ'' کے نام سے عرشؔ صہبائی کا ایک اور مجموعہ اشاعت پذیر ہوا۔ اس سے پہلے شائع شدہ شعری مجموعوں سے یہ مجموعہ اس نوعیت سے الگ ہے کیوں کہ اس میں صرف نظمیں اور قطعات ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ عرشؔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور ان کا بیشتر شعری سرمایہ اسی صنف پر مشتمل ہے لیکن اُنہوں نے شاعری کی دوسری اصناف کو بھی نہایت کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔

عرشؔ زبان پر عبور رکھتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ وہ اپنے خیالات کو بڑے خوبصورت اور دلنشیں انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اُن کی نظموں کا مطالعہ کرنے کے بعد چند باتیں نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں۔ مثلاً حق گوئی، طنزیہ پہلو اور ترقی پسندی اُن کے کلام کے اہم جُزو ہیں۔ وہ اپنی زندگی میں ان پر عمل پیرا بھی ہیں۔

سچ کہنا ہر دوّر میں مشکل فن رہا ہے۔ ہر دوّر میں سچ بات کہنے والوں کو طرح طرح کی اذیتیں برداشت کرنا پڑی ہیں اور یہ سلسلہ ایسے ہی جاری رہے گا۔ یونان کے مشہور و معروف فلسفی سقراط کے نام سے کون واقف نہیں۔ اس میں دو رائے نہیں کہ آج بھی جھوٹ کا بول بالا ہے اور یہی کامیابی کی سیڑھی ہے تاہم حق گو اُس زمانے میں بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ یہی بات عرشؔ نے اپنی نظم ''سقراط'' میں بیان کی ہے۔ یہ نظم اُردو شاعری میں انفرادیت کی حامل ہے۔ عرشؔ نے زندگی بھر حق گوئی کے لئے بے شمار پریشانیاں اٹھائی ہیں لیکن وہ اپنی عادت سے مجبور ہیں۔ جو بات سچ ہوتی ہے اُسے برملا کہہ دیتے ہیں۔ اس نظم میں اُنہوں نے اپنے آپ کو اس دوّر کا سقراط کہا ہے۔

میں ہوں اس دوّر کا سقراط مجھے قتل کرو
زہر کا کوئی اثر مجھ پر نہیں ہوسکتا

حق گوئی کے لئے چاہے اُن کے دوست دُشمن ہو جائیں یا اُن کی طرف سے کوئی بھی نقصان پہنچے، عرشؔ اُس کی پرواہ نہیں کرتے۔ لہٰذا نظم کے آخر میں اس طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

آج کے دوّر میں نایاب نہیں حق گوئی
آج کے دوّر کا سقراط ابھی زندہ ہے

یہ نظم قاری کے دل و ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ ہندو پاک کے کئی رسائل میں شائع ہو چکی ہے اور قارئین نے اسے بے حد پسند کیا ہے۔

اِس مجموعہ میں ''سقراط'' کے علاوہ اور کئی نظمیں ہیں جو قاری کی کشش کا باعث ہیں۔ اس لحاظ سے یہ مجموعہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ عرشؔ کو نظم گوئی پر بھی دسترس حاصل ہے۔ طنز اس مجموعے کی ایک اور نمایاں خصوصیت ہے۔ طنز اگر چہ عرشؔ کا موضوع نہیں لیکن کہیں کہیں جہاں اس کی ضرورت ہوتی ہے، عرشؔ اس سے کام لینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ مثلاً آج کل کی سیاست اور سیاست دانوں سے کون واقف نہیں۔ سب کو معلوم ہے کہ وہ عوام سے کس طرح کھیلتے ہیں اور کس طرح اُن کی معصومیت کا استحصال کرتے ہیں۔ وہ چناؤ کے وقت عوام سے ووٹ

حاصل کرنے کے لئے کیا کیا حربے استعمال کرتے۔ اُن کی ایک نظم ''الیکشن'' کے یہ اشعار دیکھئے۔

ووٹ کے دستیاب ہونے تک
ہر بشر کو گلے لگاتے ہیں
جب مِلے اقتدار تو نیتا
اپنی جنتا کو بھول جاتے ہیں

''یہ جھونپڑے یہ لوگ'' عرشؔ کے شعری مجموعے کا نام بھی ہے اور اسی عنوان سے اس مجموعے میں ایک نظم بھی ہے۔ اس نظم میں عرشؔ ایک ترقی پسند شاعر کی طرح غریبوں اور مفلسوں کے ترجمان کی حیثیت سے بات کرتے نظر آتے ہیں۔ اُن لوگوں کی حالت اور اُن کی زندگی کا خاکہ اس نظم میں کھینچا گیا ہے جن کو نہ دو وقت کی روٹی میسّر ہے اور نہ ہی سر چھپانے کے لئے چھت۔ وہ جو محنت کرتے ہیں اُس وقت کا فائدہ دوسرے اُٹھاتے ہیں۔ وہ خود بھُوکے پیٹ سونے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اُن کی مجبوری، تنگ دستی اور لاچاری کو عرشؔ نے نہایت عمدہ طریقے سے پیش کیا ہے۔ ان تمام حقائق کے باوجود شاعر مایوس نہیں۔ نظم کے آخری حصے میں عرشؔ فرماتے ہیں کہ ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ لوگ صرف اسی طرح زندگی جئیں گے اور مر جائیں گے بلکہ یہی لوگ صورتِ حالات کو سمجھیں گے اور اپنے حق کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ اور بالآخر اک انقلاب کی بُنیاد بن جائیں گے۔ نظم کا آخری بند پوری نظم کا خلاصہ ہے:

کہیں کہیں کوئی آوازِ حق اُبھرتی ہے
کہیں کہیں کوئی مدھم چراغ جلتا ہے
مری نگاہ میں یہ جھونپڑے عظیم ہیں عرشؔ
یہ وہ جگہ ہے جہاں انقلاب پلتا ہے

اس مجموعے میں عرشؔ نے منظر نگاری یا جذبات نگاری کی طرف خاص توجہ نہیں دی۔ جوشؔ ملیح آبادی کی طرح اُنہوں نے فطرت کی منظر کشی بھی نہیں کی تاہم جہاں کہیں موقعہ مِلا اُنہوں نے نہایت عمدہ مناظر پیش کیے ہیں۔ شاعری کی ایک اور صنف قطعہ کو بھی اُردو ادب میں

ایک خاص مقام حاصل ہے۔ کسی شاعر کے کلام میں چار ایسے مصرعے مل جائیں جن میں ایک خیال کو تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہو اسے قطعہ کہا جاتا ہے۔ اس میں قافیہ کی پابندی بھی ہوتی ہے۔

اُردو میں اخترؔ انصاری، احمد ندیم قاسمی، نریش کمار شادؔ اور اخترؔ اور نیوی نے بحیثیت قطعہ گو شاعری میں شہرت حاصل کی ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے ایسے شعراء ہیں جنہوں نے شاعری کی دُوسری اصناف کے علاوہ قطعہ پر بھی طبع آزمائی کی۔ دوّرِ جدید کے شعراء میں عرشؔ صہبائی نے بھی قطعہ گوئی کے اصول وضوابط کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اس صنف کو اپنایا ہے۔

عرشؔ ایک بلند پایہ غزل گو اور نظم گو شاعر تو ہیں مگر اُن کے قطعات بھی کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ اس مجموعے میں منظومات کو چھوڑ کر ان کے قطعات بھی خاصے کی چیز ہیں۔ عرشؔ نے جس طرح غزلیات یا پھر منظومات میں مختلف موضوعات و مضامین کو پیش نظر رکھا ہے اِس دوّر کی اخلاقی پستی کی بات کرتے ہیں تو کسی ملک اور سماج میں پھیلی ہوئی بُرائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ کہیں کہیں سیاست اور سیاست دانوں کی بُرائیوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ اقتدار اور وقار شروع ہی سے انسان کی بہت بڑی کمزوری رہی ہے اور یہ حاصل کرنے کے لئے سیاست دان کچھ بھی کر گزرتا ہے۔ اس بات کو کتنے خوبصورتی سے عرشؔ نے بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں اُن کا یہ قطعہ ملاحظہ فرمائیں۔

بے بسوں اور بے سہاروں پر
ستم بے پناہ کرتا ہے
اقتدار و وقار کی خاطر
آدمی ہر گناہ کرتا ہے

اِسی سلسلے میں یہ قطعہ بھی توجہ طلب ہے۔

اتفاقاً اگر کوئی کم ظرف
بَرسَرِ اقتدار آتا ہے

اختیارات کے خمار میں وہ
اپنی اوقات بھول جاتا ہے

عرشؔ کے قطعات پڑھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ اُنہوں نے ادب کے ساتھ زندگی کا بھی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ اُنہوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ایک خوبصورت ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ اُن کے اکثر قطعات زندگی کی سچائیوں کے آئینہ دار ہیں۔ دُنیا میں مفلسی انسان کو احساسِ کمتری کا شکار بنا دیتی ہے۔ دیکھئے اُنہوں نے احساسِ کمتری کو کس رنگ میں پیش کیا ہے۔

دل میں احساسِ کمتری لا کر
سَو طریقوں سے رنج دیتی ہے
مفلسی آدمی کے ہونٹوں سے
مُسکراہٹ بھی چھین لیتی ہے

کُچھ الفاظ بڑے غریب ہوتے ہیں۔ وہ شاعری میں استعمال نہیں کئے جاتے۔ ایسے الفاظ میں طوائف بھی ایک ایسا ہی لفظ ہے جسے سُنتے ہی کڑواہٹ محسوس ہوتی ہے اور یہ طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔ عرشؔ نے ایک قطعہ میں اس لفظ کو اس خوبصورت انداز سے استعمال کیا ہے کہ یہ لفظ قاری کی توجہ بن جاتا ہے اور اس کے استعمال کے بغیر قطعہ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہی عرشؔ کی مشاقّی کا ثبوت ہے۔ وہ مُردہ لفظ میں بھی جان ڈالنے کا ہُنر جانتے ہیں۔

جس کو کہتے ہیں دوستی کا فرض
بھُول کر بھی ادا نہیں کرتی
وہ طوائف ہے عرشؔ یہ دُنیا
جو کسی سے وفا نہیں کرتی

اس قطعہ میں زندگی کی حقیقت کی کتنی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔ ایک نئے اور اچھوتے خیال کو شاعر نے کتنی خوبصورت تشبیہ دیتے ہوئے بیان کیا ہے۔ یہ قطعہ ہر لحاظ سے قابلِ غور ہے۔

بارہا تھک کے گر پڑی ہے عرشؔ
زندگی آفتوں کی جھولی میں
جیسے مجبور سی کوئی دُلہن
بے دلی سے رواں ہو ڈولی میں

عرشؔ کے کلام کی سب سے بڑی خوبی اُن کا انداز اور اسلوب ہے۔ اس مجموعے میں بھی یہ چیز نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔

اسلوب:

''اسلوب'' ۱۹۹۱ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ یہ مجموعہ بھی غزلیات پر مشتمل ہے۔ اس میں شامل غزلیں زیادہ صاف اور پُر کشش ہیں۔ چھوٹی بحروں میں اشعار کہنے پر عرشؔ کو عبور حاصل ہے لیکن وہ طویل بحروں میں بھی دلکشی اور تاثیر برابر قائم رکھتے ہیں اور بے حد کامیاب ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر اُنہیں چھوٹی اور طویل بحروں میں شعر کہنے پر یکساں عبور حاصل ہے۔ اگر چھوٹی بحروں میں کہی گئی غزلوں کے اکثر اشعار زبان زدِ خاص و عام ہے تو طویل بحروں کے بھی کئی اشعار پڑھنے یا سُننے کے بعد از بر ہو جاتے ہیں۔ بات پھر وہیں ختم ہوتی ہے کہ اُن کی شاعری قدرتی ہے جو دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ چونکہ اُن کے ہاں اشعار آمد کی صورت میں اترتے ہیں اس لئے بات کا ذکر بے معنی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کن بحروں میں کہے گئے ہیں۔ ہم یہاں ایک طویل بحر میں کہی گئی غزل کا ایک شعر پیش کرتے ہیں۔

پھولوں سے کنارہ کش ہوکر دامن میں ہزاروں خار چُنے
ہم لوگ بھی کیا دیوانے ہیں جینے کے لئے آزار چُنے

یہاں اس بات کا ذکر خالی از دلچسپی نہیں ہوگا کہ قافیہ اور ردیف کس قدر مربوط ہیں اور بامعنی بھی۔ شعر میں کوئی ایسا لفظ نہیں جس کی جگہ کسی دوسرے جگہ کو استعمال کیا جائے۔ عرشؔ الفاظ کی نشست و برخاست پر بھی پوری توجہ دیتے ہیں، بلکہ اس فن میں بھی وہ ماہر ہیں۔ یہی وجہ ہے

کہ اُن کا کلام اُستادانہ کلام کے زمرے میں آتا ہے اور اہلِ ادب نے اس کا اعتراف کشادہ دلی سے کیا ہے۔ اس سلسلے میں اسی بحر میں کہی گئی غزل کا ایک اور شعر دیکھئے ؎

رستے میں چٹانیں ہوں لیکن اِک موجِ رواں کو کیا مطلب
ہم اس سے بھی ٹکرا جائیں گے دُنیا غم کی دیوار چُنے

مذکورہ اشعار میں دوسری خوبیوں کے علاوہ ان میں جو رجائیت کا جذبہ ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ آپ کی توجہ اس شعر کی طرف بھی مرکوز کروائی جاتی ہے ؎

ہزاروں سازشیں پنہاں ہیں اُن کے اِک تبسم میں
انہیں پھر بھی یہ ضد ہے وہ ہمارے مہرباں ٹھہرے

جیسا کہ پہلے بھی اس بات کی نشاندہی کی جا چکی ہے عرشؔ کی شاعری کا محور زندگی ہے اور وہ زندگی کو ہی اپنا محبوب مانتے ہیں۔ ان کی شاعری زندگی کے ارد گرد گھومتی ہے۔ اس لئے زندگی کی طرح اس میں روانی اور تسلسل ہے۔ عرشؔ ادب برائے ادب کے نہیں بلکہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ اس کے پیشِ نظر ڈاکٹر جاوید وششٹ عرشؔ کو ''مغنیِ حیات'' کے لقب سے نوازتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

''عرش صہبائی نے اپنی غزلوں میں زندگی کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ خود اپنا محور بن جاتی ہے۔ ان کی غزل میں آ کر زندگی خود غزل بن جاتی ہے۔''

عرشؔ نے اپنے ذاتی مشاہدے کی بنا پر زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ انہوں نے قدم قدم پر زندگی کے پیچ و خم کو محسوس کیا ہے بلکہ اُس سے گزرے ہیں۔ اسی لئے اُنہوں نے اسے اپنے اشعار میں ڈھالا ہے۔ کبھی قارئین کے سامنے زندگی کی بے ثباتی کا راز فاش کیا ہے اور کبھی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے نزدیک زندگی ایک امتحان ہے۔ اس میں جو مشکلات اور حادثات پیش آتے ہیں وہی حاصلِ زندگی ہیں۔ وہ ہر حال میں زندگی کو بامعنی خیال کرتے ہیں اور اس سے ہر حال میں محبت کرتے ہیں۔ وہ زندگی کے ہر پہلو کو سمجھتے ہیں۔ زندگی کے بارے میں اچھا بُرا سب اُن کی نظروں میں رہتا ہے۔

- کسی بھی زاویئے سے عرشؔ اس کو دیکھئے مگر — قدم قدم پہ زندگی ہے امتحاں لئے ہوئے
- زندگی گزری ہے میری مسئلوں کے درمیاں — زندگی کے مسئلے میری طرح سمجھے گا کون؟
- زندگی تُو عمر بھر ہم سے رہی برہم مگر — جس طرح چاہا ہے ہم نے اس طرح چاہے گا کون؟
- کتنے جاں سوز مراحل سے گزرتا اپنا — زندگی رہ گئی اِک آگ کا دریا بن کر
- زندگی کیا ہے یہ پوچھے ہم سے کوئی اے عرشؔ — تیر کر آئے ہیں ہم آگ کے دریا کتنے

عرشؔ نے اپنی شاعری میں نئی تہذیب پر بھی طنز کیا ہے کہ اس دوّر میں مال وزر کی زیادہ قدر و قیمت ہے اور اخلاقی قدروں کا زوال ہوتا جا رہا ہے۔ آج کل کے سائنس اور ٹیکنالوجی کے دوّر میں انسان نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ اُس کا اپنا وجود خطرے میں پڑ گیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اتنا ترقی یافتہ سمجھتا ہے کہ اخلاقی قدریں اُس کی نظر میں بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ عرش ایسی تہذیب سے نفرت کرتے ہیں جس میں اخلاق نام کی کوئی چیز نہ ہو۔ عرشؔ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انسان پُرخلوص اور حقیقت پسند ہونا چاہئے، وہ غریب ہی کیوں نہ ہو۔ عرشؔ کو اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ آج کل کے دوّر میں بااخلاق اور ایماندار شخص کو بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس کی اخلاق پسندی اور ایمانداری ہی اُس کی سزا کا باعث بنتی ہے۔ اس کے باوجود عرشؔ چاہتے ہیں کہ ہر انسان حقیقت پسند اور ایماندار ہو اور اُسے اپنے ضمیر کو زندہ رکھ کر زندگی گزارنی چاہئے۔ اس ضمن میں اُن کے چند اشعار حاضر ہیں۔

- اور ہی کچھ رنگ لائی ہے نئی تہذیب عرشؔ — ورنہ اخلاق و وفا کے پیڑ بے سایہ نہ تھے
- اخلاص بنا دے گا ہمیں اپنا ہی دشمن — کیا علم تھا بے جرم سزائیں بھی ملیں گی
- ہم ترستے ہیں کوئی صاحب کردار ملے — یوں تو ہر گام پہ ہیں صاحبِ گفتار بہت
- ہر اِک شے سے برتر ہے تیرا ضمیر — اگر یہ تیرے پاس بانوں میں ہے
- میں کبھی منصور کی صورت، کبھی سقراط ہوں — حق پرستی نے کیا دُنیا میں لافانی ہے

''اسلوب'' میں شامل غزلوں کے چند اشعار ایسے بھی ہیں جن میں عرشؔ نے ہندی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اُردو زبان کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں سے بھی

دلچسپی رکھتے ہیں۔ اُردو شاعری میں ہندی الفاظ کا استعمال کوئی نیا نہیں۔ دوسرے بہت سے شاعروں نے بھی ایسا کیا ہے۔ عرشؔ کا کمال یہ ہے کہ اُنہوں نے ہندی کے الفاظ کو اُردو لہجہ عطا کیا ہے جس سے وہ غیر مانوس نہیں لگتے بلکہ یہ الفاظ قاری کو فطری معلوم ہوتے ہیں اور اشعار میں سلاست اور روانی برقرار رہتی ہے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں جو مندرجہ بالا بات کی تصدیق کرتے ہیں۔

- یہ زندگی کا مدھوبن ہے اس کو کیا کہیئے　　کہیں ہیں یاس کے کانٹے کہیں ہیں آس کے پھول
- اپنے وطن سے عرشؔ بہت دور لے گیا　　کس سے کہیں یہ وقت کا کیسا بہاؤ تھا
- ہم مسافر ہیں نکل جائیں گے ہر بستی دور　　اور ہم کو ڈھونڈتی پُروائیاں رہ جائیں گی
- ہم زندگی کی ناؤ کو کھیتے تو کس طرح　　دریائے حادثات کا اُلٹا بہاؤ تھا
- پھر اُس کے بعد مل نہ سکا کوئی ہم سفر　　یہ زندگی کی راہ میں کیسا پڑاؤ تھا

عرشؔ اُردو، ہندی، انگریزی، پنجابی اور ڈوگری سے بخوبی آشنا ہیں۔ ڈوگری تو خیر اُن کی ماں بولی ہے۔ اس سے محبت فطری ہے مگر اُردو سے اُنہیں بے پناہ لگاؤ ہے۔ وہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

عرشؔ مجھ کو ڈوگری بولی بھی ہے بے شک عزیز
ہاں مگر اُردو زباں کی اور ہی کچھ بات ہے

اساس:

''اساس''، عرشؔ صہبائی کا چھٹا مجموعۂ کلام ہے جو ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کا انتخاب جناب کرشن نندہ کرشنؔ نے کیا ہے۔ تزئین ممتاز اعظمی کی ہے اور اس کا انتساب عرشؔ صاحب نے جناب یش پال ملک ایڈوکیٹ (کرنال) کے نام اپنے اس شعر سے کیا ہے۔

رموزِ فن پر بھی حاصل ہے دسترس اُس کو
سخن پرست نہیں وہ سخن شناس بھی ہے

یہ مجموعہ ۱۲۸ صفحات پر مُشتمل ہے اور اس میں کُل ۸۱ غزلیں شامل ہیں۔ اس مجموعے میں عرشؔ صاحب کا فن اپنے عروج پر دکھائی دیتا ہے۔

انسان بین الاقوامی حادثات اور واقعات سے تو بظاہر غیر متاثر رہ سکتا ہے لیکن اپنے گرد وپیش کے حالات سے جو براہِ راست اُس کی ذات پر ضربیں لگاتے ہیں اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور پھر شاعر و ادیب تو کُچھ زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ عام انسان اپنے تاثرات کو بیان کرنے پر قادر نہیں رہتا لیکن شاعر و ادیب اپنے اس تاثر کو اپنے جذبے کی بھٹی میں تپا کر اس انداز سے نظم ونثر کی صورت میں بیان کر جاتا ہے کہ وہ تاثر، وہ احساس صرف اُس کا تاثر نہیں رہتا بلکہ سب کا تاثر بن جاتا ہے۔ اس طرح وہ آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیتا ہے اور جو شاعر اس میں کامیاب ہوجاتا ہے اُس کے اشعار میں تاثیر پیدا ہو جاتی ہے اور اُس کا بیان اس شعر کا مصداق ہو جاتا ہے۔

میرا درد شامل تھا جیسے ہر اِک میں
سُنی میں نے ہر داستاں روتے روتے

عرشؔ کی شاعری بھی یہی انداز لئے ہوئے ہے۔ یہ چیز حاصل کرنے کے لئے عرشؔ صاحب نے کتنی سعی کی ہے، کتنی ریاضت کی ہے اس کا اندازہ کچھ اُن کے اس شعر سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

شاعری مجھ کو نہ کیوں کر ہو دِل و جاں سے عزیز
عرشؔ یہ نِصف صدی کی ہے عبادت میری

عرشؔ صاحب کی شاعری کا محور زندگی ہے۔ اُنہوں نے زندگی کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اِس کے نشیب وفراز کو بخوبی سمجھا اور اِسے اپنے اشعار میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ اُنہوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بیان کیا ہے۔ جہاں ایک طرف غم کی کیفیات کی عکاسی کی ہے وہیں دوسری طرف انبساط و مسرت کی دُھندلی دُھندلی تصویریں بھی کھینچی ہیں۔ جہاں ایک طرف وہ ہنسی کی عظمت کے قائل نظر آتے ہیں وہیں اس کی ارزانی کے درد کا احساس بھی اُن کے کلام میں

موجود ہے اور یہ سب کچھ بے سبب نہیں ہے بلکہ اُن کے نزدیک زندگی مختلف کیفیات، احساسات اور رنگوں کا مرکب ہے۔ چنانچہ اِن اشعار میں وہ اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

- جو زندگی ہے تو غم بھی ہیں ساتھ ساتھ اس کے　　کوئی ندّی نہیں جس میں بھنور نہیں ہوتے
- زندگی ایک مرقّع ہے غم و راحت کا　　خار و گُل دونوں سے تزئینِ چمن ہوتی ہے

عرشؔ بُنیادی طور پر چونکہ غزل کے شاعر ہیں اسی لئے اُن کے کلام کا بیشتر حصّہ اِسی صنف میں ہے۔ یہ مجموعہ بھی غزلوں پر ہی مشتمل ہے۔ غزل کی باریکیوں اور اس کے فن پر عرشؔ کی بڑی مضبوط پکڑ ہے۔ اُنہوں نے اگرچہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی ہے لیکن غزل کے مخصوص موضوعات پر اُنہوں نے خصوصیت کے ساتھ توجہ دی ہے۔ غزل میں ہمیشہ محبوب کی بے التفاتی دکھائی جاتی ہے۔ انہیں جذبات کو عرشؔ اپنے انداز سے پیش کرتے ہیں۔

کہاں کی راحتیں، رنج و ملال دے کے گیا
وہ شخص دل کو غمِ لازوال دے کے گیا

آج انسان نے اس قدر ترقی کر لی ہے کہ ایک مُدت پہلے تک وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ انتہا درجہ تباہ کُن اسلحے کے ساتھ ساتھ حیرت انگیز خلائی ترقیاں بھی اس نے کر لی ہیں۔ تاہم آج کا انسان پہلے سے زیادہ خوش نہیں ہے بلکہ خوف و ہراس میں زندگی گزار رہا ہے۔ موت اس کے احساسِ تکبر پر کاری ضرب لگا رہی ہے۔ اس بات کو عرشؔ صاحب نے اپنے انداز سے بیان کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

تیرا دعویٰ کہ خلاؤں کو کرے گا تسخیر
دسترس میں تیری یہ عمرِ رواں تک بھی نہیں

اب عرشؔ صاحب کے چند اشعار دیکھئے کہ اُنہوں نے کس انداز سے آج کے کرب کو نمایاں کیا ہے۔

- اُن کے چہروں سے کچھ بھی ہو ظاہر　　لوگ اندر سے زخم خوردہ ہیں

- نہ آئینوں میں کوئی شکل تک اُبھرتی تھی ۔۔۔ تمام شہر ہی لپٹا ہوا غبار میں تھا
- میں ہوں کس حال میں کیوں کر مجھے معلوم ہو عرشؔ ۔۔۔ ایک مُدت سے میری خود سے ملاقات نہیں

عرشؔ صاحب کو زندگی میں کافی تلخیوں اور مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ بچپن میں ماں کے پیار سے محروم ہو گئے۔ جوانی میں بھی حالات کچھ سازگار نہیں رہے۔ تعلیم بھی مکمل نہیں کر سکے۔ گو عام طور پر اُن کے کلام میں اس کا پرتو نہیں دکھائی دیتا مگر پھر بھی کہیں کہیں ہلکے ہلکے اشارے ضرور مل جاتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

- تو نے رنگین بہاروں سے نوازا سب کو ۔۔۔ میرے حصّے میں مگر بادِ خزاں تک بھی نہیں
- ڈھونڈتے ہی رہ گئے ہم راحتوں کے سلسلے ۔۔۔ زندگی میں ہر قدم پر غم کی زنجیریں ملیں

عرشؔ اُن شعراء میں سے ہیں جو زندگی میں ہر قسم کے مصائب کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ چاہے کتنے ہی دُکھ اور مصیبتیں اُن پر ٹوٹ پڑیں وہ کبھی شکایت نہیں کرتے بلکہ اس کے برعکس غم کو ہمدم و دوست خیال کرتے ہیں اور اسی واسطے خود بھی عزیز رکھتے ہیں اور دوسروں کو بھی تلقین کرتے ہیں۔

کم سے کم ان آنکھوں کو آنسوؤں سے نم رکھنا
جس طرح بھی ممکن ہو غم کو محترم رکھنا

ایسا لگتا ہے کہ زندگی کے آلام و مصائب عرشؔ صاحب کے لئے باعثِ تشویش نہیں ہیں بلکہ وہ اُن سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان تلخیوں سے وہ زندگی کو خوبصورت بناتے ہیں۔ اُن سے ایک دائمی رشتہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ قطعی اس رشتے کو توڑنا نہیں چاہتے۔

رشتہ جو مصائب سے ہے توڑا نہیں جاتا
اس ناؤ کو منجدھار میں چھوڑا نہیں جاتا

عرشؔ صاحب کے نزدیک یہ مصائب و آلام زندگی کو با مقصد بناتے ہیں۔ اس کو وہ رونق بھی بخشتے ہیں۔ انسان کو بُلند حوصلے کے ساتھ جینے کا انداز بھی سِکھاتے ہیں۔ لہٰذا وہ حادثوں کو دعوت دیتے ہیں۔

- ان سے بڑھتے ہیں دلوں کے حوصلے ۔۔۔ ہر قدم پر حادثے ملتے رہیں

جب چلے جھونکے غمِ ایام کے ساتھ اپنے حوصلے لائے بہت

عرشؔ صاحب فرماتے ہیں کہ مسرت تو ایک عارضی عمل ہے جب کہ غمِ زندگی کو دوام حاصل ہے۔ وہ زندگی میں ہر قدم پر حادثوں کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ فرمائیے۔

لوگ ترسا کئے مسرت کو
ہم غمِ زندگی کے قائل تھے

عرشؔ کے نزدیک غم، زندگی کا لازم وملزوم حصہ ہے۔

جینے کی خاطر غم لازم ہوتے ہیں
یہ کشتی طوفان کے سہارے چلتی ہے

راحتیں اُن کے نزدیک کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ وہ اُن کو ابرِ رواں کے مترادف سمجھتے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔

راحتیں ابرِ رواں بن کر بکھر جائیں گی عرشؔ
زندگی کی ہر حقیقت غم کے پس منظر میں دیکھ

حق پرستی اِس دور میں ندارد ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج بھی دُنیا میں ایسے لوگ ہیں جو کسی قیمت پر بھی اس کا دامن نہیں چھوڑتے۔ کون کون سی مصیبت حق پرست انسان کو اٹھانی نہیں پڑتی لیکن اہلِ دل اِسی راستے کو چُنتے ہیں۔ عرشؔ صاحب بھی ایسے لوگوں میں سے ایک ہیں۔ وہ اپنے اس حوصلے کو بھی حق پرستی کا ہی مرہونِ منت خیال کرتے ہیں۔

حق پرستی نے بھی کیا حوصلہ بخشا مجھ کو
جان سولی پہ مگر لب پہ فُغاں تک بھی نہیں

حُسن وعشق غزل کا محبوب موضوع ہے۔ گویا عورت کا تذکرہ اس کی خوبی ہے۔ نظموں میں عورت پر بہت سی نظمیں مل جاتی ہیں۔ کہیں اس کے حُسن وجمال کے حوالے سے، کہیں اس کی مجبوریوں کے حوالے سے۔ عرشؔ صاحب نے بھی عورت کی مجبوری ولاچاری کو بھی موضوع بنایا ہے۔ یہ اگرچہ غزل کا موضوع نہیں ہے۔ تاہم عرشؔ نے اسے اپنے خاص انداز سے غزل کا

موضوع بنادیا ہے۔ایک شعر ملاحظہ فرمایئے۔

پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے رقص کرے
حُسن کے پاؤں میں گھنگرو نہیں دیکھے جاتے

مندرجہ بالا شعر میں عورت کے تقدس کی بات کی گئی ہے۔ وہ تقدس جو کبھی عورت کے باعثِ فخر ہوا کرتا تھا لیکن پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے آج وہ اسی کے پاؤں کا گھنگرو بن کر رہ گیا ہے۔اب ایسا زمانہ آیا ہے کہ عورت کو مقدس چیز ماننا تو دُور، کھُلے عام چوراہوں پر اُس کی عصمت لوٹی جارہی ہے۔

عصمتیں لُٹتی ہیں اِس دوَر میں چوراہوں پر
وہ مناظر ہیں کہ آنکھوں میں چبھن ہوتی ہے

شاعر اکثر تعلّی سے کام لیتے ہیں۔کوئی بھی شاعر اپنی تعریف کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ ہر کوئی اپنے اپنے انداز سے اپنی برتری ظاہر کرتا ہے۔کہیں کہیں تو مبالغے کی حد ہوجاتی ہے۔مثلاً میرؔ کا یہ شعر دیکھئے۔

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

عرشؔ نے بھی کہیں کہیں تعلّی سے کام لیا ہے۔لیکن اس میں بھی وہ اپنے خاص انداز و اسلوب کے سبب سے ایک بات پیدا کردیتے ہیں۔

ہم نے اے عرشؔ غزل کو نیا آہنگ دیا
باوجود اس کے کہ ہم اہلِ زباں تک بھی نہیں

عرشؔ صاحب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ معمولی سے معمولی بات کو بھی نہ صرف دِلکش بنادیتے ہیں بلکہ اُس میں ایک جدّت پیدا کرتے ہیں۔

یہ پھیل جاتی ہیں جنگل کی آگ کی صورت
اگرچہ کہنے کو باتوں کے پر نہیں ہوتے

تشبیہ اور استعارے سے جہاں ایک طرف کلام میں حُسن پیدا ہوتا ہے وہیں یہ چیز کلام میں معنوی وسعت بھی پیدا کرتی ہے۔ اکثر شعراء اس کا استعمال اپنے کلام میں کرتے ہیں۔ عرشؔ صاحب نے بھی ان کا استعمال ایک جدّت اور نُدرت کے ساتھ کیا ہے۔

جو زندگی ہے تو غم بھی ہیں ساتھ ساتھ اس کے
کوئی ندّی نہیں جس میں بھنور نہیں ہوتے

مختصراً عرشؔ کی شاعری میں خلوص اور صداقت پائی جاتی ہے۔ اُن کی غزلوں میں اُن کی شخصیت کا بھرپور احساس ہوتا ہے جو دِل و دماغ میں آتا ہے اُس کو بے تکلف کاغذ پر لکھ دیتے ہیں۔ اُن کے کلام میں اِظہار کی لطافت قاری کا دِل موہ لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عرشؔ نے ادبی دُنیا میں ایک منفرد مقام حاصل کرلیا ہے۔

ریزہ ریزہ وجود:

''ریزہ ریزہ وجود'' ۱۹۹۵ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس میں منظومات اور قطعات شامل ہیں۔ ان میں سے بعض منظومات اور قطعات ایسے بھی ہیں جو عرشؔ صہبائی کے مجموعۂ کلام ''یہ جھونپڑے یہ لوگ'' کی بھی زینت بنے تھے۔ اس مجموعے میں قابلِ تعریف یہ بات بھی ہے کہ انہوں نے ڈاکٹر جاوید وششٹ (مرحوم) جو اُردو ادب کی مستند ہستی تسلیم کئے گئے ہیں، کا مضمون ''مغنیِ حیات۔ عرشؔ صہبائی'' شامل کر کے اس اہم مضمون کو محفوظ کرلیا ہے۔ اگرچہ یہ مضمون کئی ادبی رسائل میں شائع ہوکر شہرت حاصل کر چکا ہے۔ زیرِ نظر مجموعے کا آغاز عرشؔ نے جس شعر سے کیا ہے اُس میں بڑی خوبی کے ساتھ مجموعے کے نام کو عرشؔ نے شعر میں ڈھال دیا ہے۔ یہ شعر توجہ طلب ہے۔

کتنے رنگیں خواب بُنتا ہوں
ریزہ ریزہ وجود چُنتا ہوں

اِس میں شک نہیں کہ عرشؔ کا اندازِ بیاں نہایت پُر اثر ہے۔ وہ تشبیہ اور استعارے کو بہت کم استعمال کرتے ہیں مگر جہاں کہیں استعمال کرتے ہیں تو ایک جدّت اور نُدرت کے ساتھ وہ اُن مضامین کو جو عام طور پر زیرِ استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ اپنے انداز اور اسلوبِ بیاں سے بالکل منفرد بنا دیتے ہیں۔ بیشتر اشعار پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ وہ غالبؔ کے ہم خیال ہیں اور اس بات کی تصدیق کرتے نظر آتے ہیں۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

ہم اس شعر پر آپ کی توجہ دِلانا چاہتے ہیں۔

دل کہ تھا آرزوؤں کا مسکن
خُونِ حسرت میں تربہ تر دیکھا

اِس شعر کی داد بے حد ضروری معلوم ہوتی ہے۔ غضب کی جدّت پسندی ہے۔

سب کا ہوں مگر کوئی بھی اپنائے نہ مجھ کو
میں بھی ٹوٹے ہوئے رشتے کی طرح ہوں
میں ڈوبنے والوں کا بھی بنتا ہوں سہارا
تسلیم یہ مجھ کو کہ میں تنکے کی طرح ہوں

یہاں اگر جناب عبدالقادر سروری (مرحوم) کے عرشؔ کے بارے میں تحریر کئے گئے مضمون کی ان سطور کا حوالہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

(مطبوعہ ''کشمیر میں اُردو'' جے اینڈ کے اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز، تیسرا حصّہ ۱۹۸۴ء، ص: ۸۳)

''مترنم بحریں اور شگفتہ زمینیں عرشؔ کی شاعری کی خصوصیت ہے لیکن محض صوری محاسن ہی ان کی شاعری کی اہم خصوصیت نہیں، وہ زبان، محاورے، طرزِ ادا اور شعری محاسن کی نگہداشت کے ساتھ ساتھ معنی کا بھی دھیان رکھتے ہیں۔ حیات اور کردار کے بارے میں ان کے اپنے کچھ تجربات اور مشاہدات ہیں۔ یہ

موضوع غزل کی شاعری کے لئے نئے نہیں لیکن جب شاعر کا ذاتی احساس اسے دہراتا ہے تو وہ نئے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ مثلاً غالبؔ کی طرح جو زندگی کو بندِ غم جانتے ہوئے بھی ایک عملی مفکر کی طرح اس کے امکانات سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے اور اسے عدمِ زندگی پر بہر حال فوقیت دینے پر مجبور تھے۔ عرشؔ بھی زندگی میں تلاشِ راحت وعشرت میں ناکام رہ کر بھی زندگی کے قدر دان ہیں۔ کہتے ہیں۔

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوں گی نظر کی پستیاں
زندگی کو کم نظر بارِ گراں کہتے رہے

غالبؔ نے وفاداری کا ایک معیار بتایا تھا۔ عرشؔ اربابِ وفا کی پہچان بتاتے ہیں۔

اے عرشؔ یہ پہچان ہے اربابِ وفا کی
ہر حال میں جیتے ہیں مگر کچھ نہیں کہتے

ضرورت تو اِس بات کی ہے کہ سروری صاحب کا تمام مضمون نقل کیا جائے لیکن یہ سلسلہ بہت طویل ہو جانے کا خدشہ ہے۔

عرشؔ اگرچہ روایتی انداز کو بہت عزیز رکھتے ہیں لیکن وہ جدید موضوعات کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ عرشؔ کا مطالعۂ حیات وکائنات اور مشاہدۂ فطرت وحقیقت بڑا گہرا ہے اور قابلِ تعریف یہ بات ہے کہ وہ ان سب موضوعات کو غزل کی زبان اور انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اُن کا کلام پڑھ کر اس بات پر ایمان لانا پڑتا ہے:

''اس دوّر میں آپ غزل کی آبرو ہیں اور اپنے اسلوب کے واحد تخلیق کار۔''

جب ہم عرشؔ کی شاعری پر سنجیدگی کے ساتھ نظر ڈالتے ہیں تو یہ احساس شدت کے ساتھ اُبھرتا ہے کہ موصوف نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور اس کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کے حقائق کو کسی لمحہ بھی فراموش نہیں کر پاتے۔ اُن کی نظر میں اخلاقی قدریں بے حد اہمیت کی حامل ہیں۔ اس بات کا عکس اس شعر میں ہے۔

اخلاق کے بدن سے نہ مجھ کو اُتاریئے
تہذیبِ زندگی کا پُرانا لباس ہوں

یہ حقیقت ہے کہ ایسے اشعار صرف عرشؔ ہی کہہ سکتے ہیں۔ عرشؔ نے زندگی میں جو کچھ محسوس کیا اُس کا اظہار کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ وہ ایک مخلص اور ایماندار شخص ہیں۔ اس بات کی نشاندہی اُن کے اس شعر سے ہوتی ہے ؎

اے عرشؔ بن سکا نہ کبھی میں زمانہ ساز
اتنا ضرور ہے کہ زمانہ شناس ہوں

عرشؔ زندگی سے کتنی محبت کرتے ہیں، اسے کتنا چاہتے ہیں اُن کے کلام میں جا بجا اس کا اظہار موجود ہے۔ یہ محبت کی انتہا ہے۔ یہ شعر دیکھئے ؎

انہیں عزیز ہے پھر بھی جو اس کے شیدا ہیں
چلو حیات شکستہ سا اک مزار سہی

ایسا شروع سے ہوتا آیا ہے کہ قدرت اپنے راز کبھی افشا نہیں کرتی لیکن دُنیا میں ایک ایسی مخلوق بھی ہے جس کے دل پر یہ راز افشا ہوتے ہیں اور یہ مخلوق ہے شاعر۔ لیکن شاعر پوری ذمہ داری کے ساتھ محسوس کرتا ہے کہ اگر اُس کو قدرت کا کوئی راز پتہ ہے تو اس کا اظہار نہ کرے۔ اس کا اعتراف عرشؔ اس طرح کرتے ہیں ؎

یہی تقاضائے قدرت ہے چُپ رہوں میں عرشؔ
ہر ایک راز مرے دل پہ آشکار سہی

اِس بات کو وہ ایک اور انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

مُجھ سے نہ پوچھ میری حقیقت کی داستاں
میں زندگی کا راز ہوں اس کو نہ فاش کر

عرشؔ کی شاعری ایک بیکراں اور گہرا سمندر ہے۔ اس کی کہاں تک تعریف کی جائے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ قدرت کی دین ہے۔ عرشؔ صاحب خود اعتراف کرتے ہیں کہ اُن کی

قابلیت کو کوئی دخل حاصل نہیں۔ ریاست جموں وکشمیر گزشتہ تین دہائیوں میں جن حالات سے دوچار رہی ہے اور تمام لوگ جس طرح حالات کے شکار رہے ہیں، عرشؔ اس سے غافل نہیں رہے ہیں۔ انہوں نے وقت وقت پر بڑی بے باکی کے ساتھ اس کا اظہار کیا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ زندگی میں تعمیری نظریہ رکھتے ہیں۔ وہ ماضی کے دل شکن حالات سے کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ اسی طرح وہ مستقبل سے پُر امید ہیں۔ یہ شعر دیکھئے۔

وحشت کا جو طوفان امنڈ آیا ہے ہر سُو
اس سیلِ رواں کا کہیں ٹھہراؤ تو ہوگا

عرشؔ کے دل میں محبوب کے لئے کتنی محبت ہے۔ وہ اس کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔ اس شعر میں ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ محبوب کی طرف سے مسلسل ستم توڑے جانے پر بھی وہ کبھی اس کا گِلہ نہیں کرتے بلکہ مسکرا کر اُسے ٹال دیتے ہیں۔ لیکن مسکرا کر ٹالنے کا یہ انداز اُن کا اپنا انداز ہے۔

میں تو پلکوں پر بٹھاؤں گا تمہیں
تم مرے سینے پہ پتھر توڑنا

یہ شعر اُن کے انداز کو اور بھی نمایاں کرتا ہے۔

یہی کہ جورِ مسلسل سے دل یہ ٹوٹ گیا
ڈر اسی بات کی خاطر تو شرمسار نہ ہو

دُنیا میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو زوال پذیر نہیں۔ جو بھی اس دُنیا میں آیا ہے اُسے ایک دن میں فنا ہونا ہے۔ انسان کو کسی صورت میں بھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ اس نازک مسئلے کو عرشؔ صاحب کس خوبصورتی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

کلی جو پھول بنی، بے طرح بکھر سی گئی
اِسے کہا تھا تبسم سے ہمکنار نہ ہو

ہم پہلے بھی اس بات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ عرشؔ کے کلام میں رجائیت کا عنصر کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ کوئی بھی صورتِ حالات ہو وہ ہمیشہ روشن مُستقبل کی طرف پُر امید نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اس کا اثر اُن کے کلام پر بھی ہے۔ ایک شعر حاضر ہے ؎

جن کو ہے پرواز کی دُھن وہ کبھی رُکتے نہیں
پُر کشش ہے کس قدر دانہ و دام اپنی جگہ

عرشؔ زندگی میں رنج و غم اور حادثات کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اُن کی نظر میں یہی زندگی کی بنیاد ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ انسان انہیں کی بدولت زندگی کو جینا سیکھتا ہے۔ ان کی وجہ سے زندگی کا حُسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ خود اپنی زندگی میں بہت سے دل شکن مرحلوں سے گزرنے کے باوجود اُن کی زبان پر کبھی شکایت کا لفظ نہیں آیا۔ فرماتے ہیں ؎

- تمام زندگی کانٹوں کے درمیاں گزری — خُدا کا شکر میں شرمندۂ بہار نہ تھا
- ہم اپنی زندگی میں جس کا ذکر کر سکتے — کوئی بھی واقعہ اس درجہ خوشگوار نہ تھا
- کبھی ہم ایسے مقامات سے بھی گزرے ہیں — ہزار غم تھے مگر کوئی غمگسار نہ تھا

مندرجہ بالا اشعار سے ظاہر ہے کہ اُن کی زندگی مسلسل پریشانیوں کا شکار رہی ہے۔

بات صرف حادثات تک ہی محدود نہیں۔ عرشؔ نے دوسرے مضامین کے ساتھ تصوف کے مسائل کو بھی اپنی شاعری میں اہم مقام دیا ہے۔ یہ اشعار دیکھئے ؎

- عجیب سلسلہ ہوگا سکوت کا اُس وقت — نہیں تھا کچھ بھی زمانے میں جب خُدا کے سوا
- جئیں ہم اُس کی خوشی تو مریں ہم اُس کی خوشی — یہ کیا کہ ہم کو کسی شے پہ اختیار نہ ہو

عرشؔ نے جو نظمیں ''یہ جھونپڑے یہ لوگ'' سے لے کر ''ریزہ ریزہ وجود'' میں شامل کی ہیں۔ اُنہیں دہرانا مناسب نہیں لیکن نظم ''وراثت'' جس میں جذبۂ حُب الوطنی شامل ہے اور نظم ''نہیں ایسا نہیں ہوگا'' یہ دونوں نظمیں صرف اس مجموعہ میں شامل کی گئی ہیں۔ نظم ''ایسا نہیں ہوگا'' جموں کے ۱۲ جنوری ۱۹۸۹ء کے ایک دلدوز واقعہ سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی۔

نظم ''نہیں ایسا نہیں ہوسکتا'' میں عرشؔ نے قومی یکجہتی کو اپنانے اور مذہبی تعصب سے

دور رہنے کی تلقین کی ہے۔ حالانکہ وہ خود کہتے ہیں کہ وہ تعصب کا شکار ہیں۔ وہ اس نظم کے ذریعے ہم سب کو یہ درس دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے دِلوں میں ایک دوسرے کیلئے جو تعصب، نفرت اور نگاہوں میں جو حقارت بس چکی ہے اُس کو چھوڑ کر ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ پیار اور محبت کے ساتھ رہنا چاہئے۔ نفرت کی دیوار کو گرا کر ایک ہو کر چلنا چاہئے۔ عرشؔ کی نظروں میں سب سے بڑا مذہب انسانیت ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ دُنیا کا ہر ایک فرد اسی مذہب کو اپنائے۔ وہ مذہبی تعصب کو جڑوں سے اُکھاڑنے کیلئے کوشاں نظر آتے ہیں۔ یہ اشعار توجہ طلب ہیں۔

- بہاتے ہو لہو تم دوسروں کا یہ بھی سوچا ہے ۔۔۔ یہ جانے کس طرح تم کو سکوں ملتا ہے وحشت میں
- تمہارا ہی لہو ہے یہ کہ جس کو چاٹتے ہو تم ۔۔۔ تمہارے جسم کا حصہ ہیں جن کو کاٹتے ہو تم
- جسے انسانیت کہتے ہیں جو سب سے مقدس ہے ۔۔۔ اُٹھو ان پستیوں سے اور اس مذہب کو اپناؤ
- ہوا ہے آج تک جو اُس کو یکسر بھول جائیں ۔۔۔ چلو یہ عہد کرلیں حق کے رستے پر چلیں گے ہم

عرشؔ معمولی سے معمولی بات کو بھی ایسے انداز اور اسلوب میں بیان کرنے کا ہُنر رکھتے ہیں جس سے اُس میں دل کشی اور نُدرت پیدا ہوتی ہے۔ ان کے مضامین پاکیزہ ہوتے ہیں اور وہ انہیں صاف، رواں اور سلیس طور پر ادا کر جاتے ہیں۔

نایاب:

''نایاب'' عرشؔ صہبائی کا وہ شعری مجموعہ ہے جو ۲۰۰۴ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس میں ''ایک شخصیت: ایک ادارہ'' کے تحت میر امتیاز حسین ایڈوکیٹ، ڈوڈہ جو ریاست کی ایک اہم شخصیت ہیں، رقم طراز ہیں:

> ''عرشؔ صہبائی نے سماج میں چھپی ہوئی تلخیوں، سختیوں اور بے راہ روی کو زبان دے کر ایک لازوال پیغام دیا ہے۔ اُن کی شاعری بامعنی اور فکر انگیز ہے۔ فنی اسلوب کی گرفت کے ساتھ ساتھ عرشؔ صاحب کی شاعری کا اچھوتا پہلو یہ ہے کہ انتہائی آسان اور سلیس زبان کا استعمال کیا گیا ہے جس سے اُن کی شاعری

مجھے ایسے نیم خواندہ قاری کے دل میں اُتر جاتی ہے۔ عرشؔ صہبائی نے اُردو غزل کو نئی وسعتوں سے ہمکنار کر کے اُردو شاعری میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ عرشؔ ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے روایت سے ہٹ کر اُردو غزل کو نیا اسلوب دیا۔''

حالات پر گہری نظر رکھتے ہوئے انسانی کرب اور بے چینی کو محسوس کرتے ہوئے آپ ایک ایسے ترقی پسند شاعر ہیں جن کی بے باکی دل کو چھو جاتی ہے۔ عرشؔ صاحب ایک چلتے پھرتے ادبی ادارے سے کم نہیں۔ اس مجموعے میں شامل ''عرشؔ صہبائی۔ زندگی کا نباض'' کے تحت اُردو کے ایک مستند ادیب شرون کمار ورما (مرحوم) تحریر فرماتے ہیں:

''......اُس نے زندگی کو ایک متحرک، مجسم، معتبر اِکائی کے روپ میں پیش کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ عرشؔ نے زندگی سے عشق کیا ہے۔ یہی کمبخت اس کی محبوبہ ہے۔ اس کا ہر رنگ اس نے دیکھا ہے۔ زندگی نے اسے چرکے بھی دیئے ہیں اور جھٹکے بھی، روشنی بھی دی ہے اور اندھیرا بھی۔ اپنے حُسن کا جادو بھی جگایا ہے اور اپنی کثافت کا شکار بھی۔ لطافت سے اس کی جھولی بھی بھری ہے اور تلخیاں بھی دی ہیں۔ عرشؔ نے اس کے ہر غمزہ، ماہر ادا، ہر وار کو برداشت کیا ہے، لیکن اس نے اپنے عشق میں کمی نہیں آنے دی۔''

لیجیئے اب آپ ''نایاب'' سے مختلف نوعیت کے اشعار ملاحظہ کیجیئے۔

- کچھ تو ہوگا اُفق کے اُس جانب — آ چلیں سرحدوں کے پار کبھی
- ایک ندّی ہوں نہیں کم یہ مقدر میرا — راستہ دیکھتا رہتا ہے سمندر میرا
- ہر کوئی شہر میں بے نام و نشاں رہتا ہے — کس کو معلوم ہے یہ کون کہاں رہتا ہے
- اور بڑھ جائے گا کچھ میری عبادت کا وقار — میری بستی سے کبھی میرا خُدا بن کے گزر
- رموزِ زندگی ظاہر ہیں اُن پر — وہ سڑکوں پر جو پتھر توڑتے ہیں
- کیوں چڑھاتے ہو رنگ مذہب کا — کیوں دلوں میں یہ زہر بھرتے ہو

- جس نے نئے کردار تراشے ہیں جہاں میں
ہم ایسے ہر افسانے کا آغاز رہے ہیں
- مجھ کو یہ معلوم ہے کیونکر تھا وہ میرے خلاف
اُس کا اندازہ تھا اس سے میرا قد گھٹ جائے گا
- وہ بھی خوب زمانہ ہوگا
جب نہ زمانے میں ہم ہوں گے
- وہی سفینہ کنارے پہ جا لگا آخر
جسے سمجھتے تھے سب ڈوب جانے والا ہے
- دل میں رہیے کہ مرے دیدۂ تر میں رہیے
دونوں گھر آپ کے ٹھہرے کسی گھر میں رہیے
- جو بھی لمحہ ہے تپتی ہوئی ریت ہے
زندگی کربلا کے سوا کچھ نہیں
- عرشؔ ہم کون ہیں کیا خود سے ہے رشتہ اپنا
کچھ سوالات پریشان سے کر جاتے ہیں
- اسی خیال پر ہے روح بھی عمل پیرا
لباس ہے جو پُرانا اُتارتے رہیے
- ہر اک نافہم ہے اپنا مخالف
ہمیں معلوم ہے ہم جانتے ہیں
- موت سے کھیلتے ہیں دیوانے
پھر بھی لب پہ ہنسی سی رہتی ہے
- جنابِ عرشؔ کا شاید یہیں قیام نہ ہو
کہیں پہ کوئی شکستہ سا گھر تلاش کریں

توازن:

جب ہم عرشؔ صہبائی کے شعری مجموعوں پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ طے کرنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے کہ کون سے مجموعے کو اہم قرار دیا جائے۔ حق بات یہ ہے کہ اُن کا ہر مجموعہ الگ اہمیت کا حامل ہے۔ اگر اُن کی ایک غزل کے اشعار کا انتخاب کرنا پڑے تو بھی مشکل ہے کیونکہ ہر شعر میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے ہر مجموعہ میں اس کا مُصنّف الگ نظر آتا ہے۔ انہیں مجموعوں میں ''توازن'' بھی شامل ہے۔ یہ مجموعہ ۲۰۰۵ء میں اشاعت کے مراحل سے گُزرا ہے۔
جب ہم ''توازن'' پر نظر ڈالتے ہیں تو سب سے پہلی غزل کے مطلع میں ہی کھو کر رہ جاتے ہیں۔

میں اپنی ذات کے اک بیکراں حصار میں ہوں
نظر میں دُور تک بکھرے ہوئے غُبار میں ہوں

ایسی منظر کشی کرنا بے حد مُشکل ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ عرشؔ کی

شاعری سب سے الگ ہے۔

عرشؔ کی شاعری کا حالات سے ایک ایسا رابطہ ہے جو قاری کو حقائق کے قریب لاتا ہے۔ آج کے دور پر یہ مقطع پورا اُترا تا ہے۔

جو نہیں راستوں کے واقف عرشؔ
کاروان کے امیر ہوتے ہیں

زندگی کے بارے میں عرشؔ صاحب کا تجزیہ کتنا برحق ہے۔

آج کی زندگی کی اور کیا کروں تفسیر
جس طرح راہ میں کاغذ کا کوئی ٹکڑا سا

اُنہوں نے اپنے بارے میں جو کچھ کہا ہے اُس میں ذرا بھی مبالغہ آمیزی نہیں۔

عرشؔ میں اس کے سوا اور کوئی وصف نہیں
جب بھی ملتا ہے تو لگتا ہے کہ ہے اپنا سا

مصرعۂ اوّل سے ہم اتفاق نہیں کرتے۔ اُن میں 'اور کوئی وصف' کی بجائے اور کئی وصف ہیں۔ یہ اُن کی انکساری ہے اگر وہ ایسا کہتے ہیں۔ لیجئے اب مختلف نوعیت کے اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

یہ عین لازمی ہے کہ ہر بات حد میں ہو
لبریز ہو تو جامِ چھلکتا ضرور ہے

اس شعر کی طرف توجہ دلانا چاہوں۔

گو میسّر چھت نہ تھی دیوار کا سایہ تو تھا
موسموں کی زد میں آکر گر پڑی دیوار بھی

یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بغیر کسی تشریح کے مختلف اشعار قارئین کی خدمت میں پیش کئے جائیں۔ ورنہ یہ سلسلہ بہت دُور پہنچ جائے گا۔

● میں سمجھتا ہوں ہر اک کو اپنی طرح یہ مری بھول ہے اور کچھ بھی نہیں

- ہوتا نہیں ہے دائمی انسان کا عروج — سورج بھی شام پڑنے پہ ڈھلتا ضرور ہے
- مُبہم سی بیکراں سی لکیروں میں قید ہے — انسان حادثوں کے جزیروں میں قید ہے
- جو زندگی میں مصلحت سے ماورا ہیں عرشؔ — ملتے ہیں ایسے لوگ مگر خال خال سے
- آسمانوں پر اُڑ رہا ہے جو — وہ یقیناً زمیں پہ آئے گا
- دل شگفتہ ہے اس طرح اے عرشؔ — جس طرح کوئی پھول کھلتا ہے
- جس محبت سے غم ملے اُس کو — اس محبت سے کون ملتا ہے
- میں تجھ سے بچھڑ کر یوں رہتا ہوں پریشاں سا — جیسے کسی کھنڈر میں اک روح بھٹکتی ہے
- یقیں جو رکھتا نہیں ہاتھ کی لکیروں میں — وہ اپنا رشتہ مقدر سے توڑ دیتا ہے
- روح کی کوئی بھی نہیں منزل — پھر بھی گرمِ سفر سی رہتی ہے
- مُسکراتے ہوئے چہروں پہ نہ جانا ہرگز — کب کوئی جانتا ہے کون ہے تنہا کتنا
- وہ مری زندگی کا محور ہے — اُس کے بارے میں اور کیا کہنا
- دلوں سے محو نہ ہو پائیں گے کسی صورت — ہم اپنی یاد کے کچھ ایسے نقش چھوڑ چلے
- یہ حادثہ ہر اک پہ گزرنا ہے کسی روز — شیرازۂ ہستی کو بکھرنا ہے کسی روز
- میں اپنے حال پر اے عرشؔ مسکراتا ہوں — کچھ اور ہو نہ ہو یہ بات میرے بس میں ہے

دسترس:

عرشؔ صہبائی کے تمام شعری مجموعے اہم اور قابلِ قدر ہیں۔ یہ بات اُن کے کسی مخصوص شعری مجموعہ کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔ زیرِ نظر مجموعہ ''دسترس'' بھی اُن میں سے ایک ہے۔ یہ مجموعہ ۲۰۰۷ء میں اشاعت کے مراحل طے کرنے کے بعد قارئین کے ہاتھوں تک پہنچا تھا اور قارئین نے اس کی ہر طرح پذیرائی کی۔ عرشؔ کی شاعری کی عظمت کا اعتراف ہر ذی فہم قاری نے کیا ہے۔ اُن میں جسٹس آر پی سیٹھی سابق جج سپریم کورٹ آف انڈیا بھی شامل تھے۔ انہوں نے اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا تھا:

''......اُنہوں نے غزل کو ایک نیا رنگ روپ دے کر ماضی کی روایت
پرستی سے نکال کر اسے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے اثرات سے بچا کر وہ
حیثیت اور عظمت بخشی ہے جو شاید باوجود چاہنے کے بھی نہ کر پائے ہوں۔''

اس مجموعہ میں شامل کسی غزل کو بھی نظر نہیں کیا جا سکتا اور پھر جب اُس غزل میں سے کسی ایک شعر کا انتخاب کرنا ہو تو وہ اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ لیجئے اس مشکل کام کی ابتدا کرتے ہیں۔ اگر آپ کی نظر سے اُن کا یہ مجموعہ گزرا ہو تو آپ اس بات کی تصدیق کریں گے ہم سو فیصد سے بھی زیادہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔

- کتنی آوازوں کا اک شور مچا ہے مجھ میں — ایسا لگتا ہے کہ اک شہر بسا ہے مجھ میں
- عرشؔ جس راہ گزر پر ہو مصائب کا ہجوم — ہم کو مرغوب وہی رہ گزر ہوتی ہے
- انہیں کے دم سے ہے پھولوں کی آبرو قائم — مجھے عزیز ہیں کانٹے چمن کے پھول نہیں
- بشر کی زندگی کتنی حسیں عمارت ہے — یہ کیسے مان لوں اُس کو کوئی اساس نہیں
- وہ جو دیتا تھا حوصلہ سب کو — سنتے ہیں اُس نے خودکشی کر لی
- یہ راز دہر میں سقراط پر ہی ظاہر تھا — جو زہر حق کے لئے ہو وہ قند ہوتا ہے
- زندگی تنہا نہیں ہے جانبِ منزل رواں — حادثوں کا کارواں بھی اس سفر کے ساتھ ہے
- اُبھرتا ہے یہ اکثر کوئی گہری چوٹ پڑنے پر — کہ دل میں جو بھی نغمہ ہو رہینِ ساز ہوتا ہے
- جہاں پہ رُوح بدلتی ہے اک لباس نیا — رہِ حیات میں ایسا پڑاؤ ہوتا ہے
- جواب کے لئے درکار ہیں کئی صدیاں — سوال اُس کا مگر مختصر سا لگتا ہے
- عرشؔ کی طبعِ موزوں کا ہے یہ عالم — وہ نغموں کے ہار پروتا رہتا ہے
- کل بھی غُربت کے سائے تھے اے عرشؔ — آج بھی دورِ تنگ دستی ہے
- زندگی! تجھ کو جانتے ہیں ہم — یہ ادائیں یہ ناز رہنے دے
- شاید اُنہیں پسند تھے طوفاں کے زیر و بم — ساحل کے پاس آ کے سفینے پلٹ گئے
- جب تک وہ مرے ساتھ ہیں سرگرمِ سفر عرشؔ — یہ زندگی کے راستے ہموار بہت ہیں

- ہم جانتے تھے وقت وہ نزدیک ہے اے عرشؔ جب فن کا یہاں کوئی خریدار نہ ہوگا
- جو حق پرست ہیں وہ مستحق سزا کے ہیں خُدارا دیکھنا اِن میں مرا بھی نام ہے کیا؟

چشمِ نیم باز:

عرشؔ صہبائی کے کسی شعری مجموعہ کو بھی لے لیجئے اُس میں شامل کلام ہی متاثر نہیں کرتا بلکہ ہر مجموعہ کا نام بھی تحسین طلب ہے۔ انہیں مجموعوں میں سے ایک مجموعہ ''چشمِ نیم باز'' ہے۔ یہ مجموعہ ۲۰۰۷ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ دوسرے مجموعوں کی طرح اس مجموعہ کی بھی بے حد پذیرائی ہوئی۔ حیرت کا مقام تو یہ ہے کہ عرشؔ صہبائی کے جتنے مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں اُن میں سے کسی مجموعہ کا نسخہ خود مصنف کے پاس موجود نہیں۔ جب بھی کسی مجموعہ کی ضرورت پڑتی ہے وہ اپنے اُن قارئین سے حاصل کرتے ہیں جو اُن کے بہت قریب ہیں۔ اتنے قریب ہونے کے باوجود وہ یہ شرط عائد کر دیتے ہیں کہ عشرہ میں متعلقہ مجموعہ اُنہیں واپس مل جانا چاہیے اور ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے عرشؔ صہبائی خوش قسمت ہیں کہ اُن کا کلام اس قدر مقبول ہے۔ چونکہ اُن کے کلام میں آمد ہے اس لئے وہ بڑی تیز رفتاری کے ساتھ شعر کہتے ہیں اور گویا قدرت اُن کے وسیلے سے خود شعر کہتی ہے۔ تیز رفتاری کے ساتھ شعر گوئی کا یہ عالم ہے کہ ''چشمِ نیم باز'' اور ''دسترس'' دونوں مجموعے ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئے۔ اس وقت تک اُن کے انیس شعری مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ خیر آیئے ہم ''چشمِ نیم باز'' میں شامل کلام سے بعض اشعار سے لُطف اندوز ہوں۔ عرشؔ صہبائی کا کلام پڑھنے کے بعد اس بات پر ایمان لانا پڑتا ہے کہ عرشؔ صہبائی اُردو شاعری کے عہد ساز شاعر ہیں۔ اُن کے کلام کا جو معیار ہے وہ سب سے بلند ہے۔ اس بات کو جناب ایم صادق بٹ سابق ڈسٹرکٹ سیشن جج (مرحوم) نے اپنی ایک مختصر رائے میں اس طرح تسلیم کیا ہے:

> ''عرشؔ صہبائی کی شاعری کی حدیں محدود نہیں ہیں اور اُن کی شاعری برصغیر کے غزل گو شعراء کے لئے ایک چراغِ راہ ہے۔ اُن کی شاعری کے اندر

ایک ایسا کرتب چھپا ہوا ہے جسے صرف اہلِ نظر اور اہلِ قلم پہچان سکتے ہیں۔ اُنہوں نے زندگی کے نشیب و فراز کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور محسوس کیا ہے۔"

- دیکھتا ہوں آج میں تنہا کھڑا ہوں راہ میں — یاد آتا ہے کہ مری زندگی میں تو بھی تھا
- آپ کو اپنی ہی دُنیا سے کبھی فُرصت نہیں — میری دُنیا میں بھی آتے میری دُنیا دیکھتے
- زندگی مجھ سے کیا بسر ہوتی — زندگی نے کیا بسر مُجھ کو
- اور پھیلے گی تن کی عریانی — آ گئے خوش نما لباس بہت
- ہر خوشی منتقل ہوئی اُن کو — غم کی جاگیر میرے پاس رہی
- زندگی کو اگر جینا ہے — جھونپڑوں میں اسے بسر کرنا

عکسِ جمال:

"عکسِ جمال" عرش صہبائی صاحب کا منتخب کلام ہے جسے ڈاکٹر رفیق انجم اور ڈاکٹر شاہنواز نے مُرتب کیا ہے۔ یہ مجموعہ ۲۰۰۷ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ یہ مجموعہ ہر لحاظ سے قابلِ ستائش ہے۔ انتخاب سے مُرتبین کے اعلیٰ شعری مذاق کا اندازہ ہوتا ہے اور اس بات کا علم بھی ہوتا ہے کہ عرش صاحب کے کئی قدر دان ہیں۔ چونکہ کلام چند مختلف مجموعوں سے لیا گیا ہے اس لئے اشعار کے حوالے کی قطعاً ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ حقیقت ہے کہ مجموعہ کی کافی پذیرائی ہوئی ہے۔ مجموعہ میں ایسی بہت سی غزلیں ہیں جن کے اشعار زبان زدِ خواص وعوام ہیں۔

خدوخال:

عرش صہبائی کا "خدوخال" واحد مجموعہ ہے جو کسی وجہ سے ڈھنگ کا شائع نہیں ہوا۔ یہ ۲۰۰۸ء میں منظرِ عام پر آیا۔ بہر حال یہ ضرور ہے کہ اُن کا کلام محفوظ ہوگیا۔ اس مجموعہ میں بھی غزلیات شامل ہیں۔ ہم پھر اُس مسئلے سے دو چار ہیں جو مسئلہ عرش صاحب کے کلام میں سے

منتخب اشعار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ قدم قدم پہ نئے تجربات اور مشاہدات سے ہمکنار ہوں گے۔ پھر اُن کے کہنے کا جو انداز ہے وہ ہر خیال کو ایک نیا لب ولہجہ عطا کرتا ہے۔ اُن سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ اُنہیں غزل میں نئی زمینیں ایجاد کرنے سے کیا حاصل ہوا تو اُن کا یہ مختصر جواب ہوتا ہے کہ جب غزل میں نئی زمین ہوگی وہ تو نئے خیالات کا تقاضا کرے گی۔ اُس صورت میں فرسودہ اور کئی بار استعمال شُدہ موضوعات نہیں آئیں گے۔ اُنہوں نے واقعی ایسا کر کے ثابت کر دکھایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو شاعری میں بے شمار ایسے شعراء ملیں گے جنہوں نے عرشؔ صاحب کی ایجاد کردہ زمینوں میں غزلیں کہی ہیں لیکن اُن میں سے ایسے بہت کم ہیں جنہوں نے اس کا اعتراف کیا ہے جبکہ یہ ایک اخلاقی فرض ہے۔

ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اُس میں صحت مند قدریں مفقود ہیں اس لئے اُن کی طرف توجہ نہیں دینی چاہئیے۔ لیجئے ہم ''خدوخال'' میں شامل غزلیات سے مختلف اشعار کا انتخاب آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

- جو زندگی میں ہر گھڑی خلوت پسند ہے ــــ وہ خواب کی طرح مری آنکھوں میں بند ہے
- خزاں کا عکس بھی ہے پرتوِ بہار بھی ہے ــــ یہ زندگی غم و راحت کا آبشار بھی ہے
- جو بے ضمیر ہے اُس کی ہے زندگی ایسے ــــ کسی مکان میں کوئی زندہ لاش رہتی ہے
- پُروقار سی اک انجمن میں رہتے ہیں ــــ جو لوگ سایۂ دار و رسن میں رہتے ہیں

خوشبُو ترے بدن کی:

عرشؔ صہبائی کے شعری مجموعوں کا اک ایسا سلسلہ ہے جو ختم ہونے میں نہیں آتا۔ انہیں پڑھنے کے بعد مزید کلام پڑھنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اُس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ کلام میں انفرادیت ہے اور سب سے بڑی خوبی کہ شعر کہنے کا ڈھنگ قاری کے مذاق کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ان کے شائع شدہ شعری مجموعوں میں ''خوشبو تیرے بدن کی'' بھی ایک الگ مجموعہ ہے جس کی اپنی پہچان ہے۔ یہ مجموعہ ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔ یہ دیوناگری میں ہے۔

ہم اس میں سے چیدہ چیدہ اشعار آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ لیجئے توجہ فرمایئے۔

- دل کے زخم ہرے ہوتے ہیں ساون میں — اس موسم میں غم کا میلہ لگتا ہے
- ثابت نہ رہ سکی کسی مریم کی آبرو — شہرِ ہوس میں دھجیاں بن کر اُڑا لباس
- میرا جشنِ وفات کب ہوگا — مُجھ کو اس میں شریک ہونا ہے
- کبھی ثابت قدم رہتے ہیں پروردۂ ظلمت — ستارے کانپتے ہیں جب سحر نزدیک ہوتی ہے
- بگڑی ہوئی سماج کی صورت ہے اس طرح — جیسے کسی چِتا میں کوئی ادھ جلا بدن
- جھونپڑوں کا بھی احترام کرو — جھونپڑوں میں بھی لوگ رہتے ہیں
- اس میں غم بھی ہیں اور راحت بھی — زندگی کا یہ رکھ رکھاؤ ہے

تجھ بن چین کہاں:

عرشؔ صہبائی کا یہ شعری مجموعہ اُردو دوہوں پر مُشتمل ہے جو ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔ دوہے بُنیادی طور پر ہندی کی صنف ہے لیکن اُردو نے اسے اپنالیا ہے۔ اُردو میں بے شمار ایسے مجموعے شائع ہو چکے ہیں جو دوہوں سے متعلق ہیں لیکن یہ شعری مجموعہ کی اپنی الگ پہچان ہے۔ عرشؔ صہبائی نے دوہوں کا مزاج ہی بدل ڈالا ہے جنہیں پڑھنے کے بعد قاری یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ دوہا اُردو شاعری کی صنف ہے۔ عرشؔ صہبائی کو بنیادی طور پر غزل کا شاعر قرار دیا گیا ہے۔ اس کا جواز یہ ہے کہ اُنہوں نے زیادہ کلام غزل کی شکل میں کہا ہے۔ ورنہ حق بات یہ ہے کہ اُنہوں نے شاعری کی جس صنف میں بھی کلام کہا اُسے عروج پر پہنچادیا۔ اُن کے دوہوں میں نئے نئے مضامین ملیں گے جن کا تعلق براہِ راست زندگی سے ہے۔ زندگی کے بارے میں عرشؔ صہبائی کے تجربات اور مشاہدات ہیں وہ قدرے مختلف ہیں۔ دوسرے الفاظ میں موصوف زندگی کے ہر پہلو میں انفرادیت رکھتے ہیں۔ اس بات کو کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ شاعری کی دوسری اصناف جن میں اُنہوں نے شاعری کی ہے۔ دوہوں میں بھی اُن جیسی شعریت ہے، فنی

لوازمات ہیں۔ حق بات تو یہ ہے کہ اُن کے دوہوں پر بھی غزلیت چھائی ہوئی ہے۔ انفرادیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔

آج کے دور کی شاعری میں ان باتوں کا فقدان ہے۔ اس لئے اس پر تنگ بندی کا شائبہ ہوتا ہے۔ عرشؔ صہبائی نے دوہوں کو الگ پہچان دی ہے۔ اِن میں اُن کے دوسرے کلام کی طرح پاکیزگی بھی ہے۔ کہیں سطحی پن کا احساس نہیں ہوتا۔ اُن کے ہاں زبان کا معیار بھی قائم ہے۔ ان باتوں کو دوہرانے کی بجائے آپ کی خدمت میں اُن کے بعض دوہے پیش کئے جاتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے۔ قارئین محسوس کریں گے کہ کوئی مضمون بھی ہو عرشؔ صہبائی اُسے اپنے انفرادی انداز میں پیش کرتے ہیں:

کہیں یہ کانٹے پھول ہیں کہیں یہ چھاؤں دھُوپ
کہنے کا وہ ایک ہیں لیکن کتنے رُوپ

- اُس کی نگاہِ شوق سے بکھریں رنگ ہزار — اُس کی اک اک بات میں نغموں کی جھنکار
- پہلے وہ ناراض تھا اب ہے دل سے دُور — چھوٹے چھوٹے زخم ہی بنتے ہیں ناسُور
- یہ ہے نازک آئینہ اس میں آئے نہ بال — دل کے رشتے ٹوٹ کر ہوتے نہیں بحال

جہاں عرشؔ کے دوہوں میں وارداتِ قلب اور جذبات کی شدت ملتی ہے وہیں وہ سیاست سے بھی ہم آہنگ نظر آتے ہیں:

- بات بڑی دلچسپ ہے لیکن ہے یہ عجیب — غُربت ہے قائم وہیں مٹے ہیں صرف غریب
- دُنیا میں ایمان کا رہے نہ کوئی نشان — ہر اک گھر میں چاہیے ایک سیاست دان
- کیسے چھپے گی بات یہ سب کو ہے معلوم — کل بھی ہم محکوم تھے آج بھی ہیں محکوم
- ذہن سے یہ مفلوج ہیں عقل سے کوسوں دُور — پھر بھی سیاسی رہنما کس درجہ مشہور

عرشؔ نے ایسے دوہے بھی کہے ہیں جن کا مضمون ذہن میں آنا بڑا مشکل ہے۔

- کتنا گہرا زلزلہ کوئی نہیں آواز — جب انساں کے جسم سے رُوح کرے پرواز
- کہنے کو عورت مگر قدرت کا شہکار — ایک کھلونے کی طرح بِکے سرِ بازار

- پینے کو پانی نہیں بجلی کا بحران اس پر بھی کہتے ہو اپنا دیش مہان

عرشؔ ہندی الفاظ کا بھی کس خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں۔

ریزہ ریزہ کر گئے اُن نینوں کے بان
پھر بھی کوئی زخم ہے اور نہ کوئی نشان

بعض دوہے دل کیا رُوح میں اُتر جاتے ہیں۔

- گوری تنہا ہے اگر ساون ہے بے رنگ جھولے لاتعداد ہیں جھولے کس کے سنگ
- عرشؔ سیاست دان ہیں ہر اِک بات میں تیز بدی کے شیدائی مگر نیکی سے پرہیز
- جو بھی سیاست دان ہے چہرے پر ہے نُور ماہر ہے تقریر میں اور عمل سے دُور

دِل کو چھوتے ہوئے یہ دوہے بھی دیکھیے۔

- کاش کبھی وہ بھیجتے رسماً کوئی سلام ہم اتنی سی بات پر بِک جاتے بے دام
- رہتا ہوں کس رنگ میں کیا ہے میرا حال سچ کہنا تم نے کبھی خود سے کیا سوال

عرشؔ کے دوہوں میں کچھ تلخ باتیں بھی ملتی ہیں لیکن یہ باتیں حقائق پر مبنی ہیں۔

- اندر سے ہیں بھیڑیئے باہر سے ہیں مور اعلیٰ عہدوں پر یہاں فائز رشوت خور
- ہر لمحہ کرتے رہے حق گوئی کا جاپ اِس طرح ہم بن گئے اپنے دُشمن آپ
- آج کی یہ تہذیب ہے اِک بھدّا سا داغ جیسے مرگھٹ پر کوئی بجھتا ہوا چراغ

سائے تیری یادوں کے:

''سائے تیری یادوں کے'' بیک وقت اُردو اور ہندی میں ۲۰۱۰ء میں منظرِ عام پر آیا۔ عرشؔ صہبائی کا کوئی مجموعہ لیجیۓ انفرادیت کا حامل ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ اُن کا کون سا مجموعہ سب سے اچھا ہے۔ اسے قُدرت کی دین کے سوا کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کا کلام خوبیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہم یہاں اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتے ہیں کہ مجموعہ میں سے کن اشعار کا انتخاب کیا جائے۔ بہر حال بسم اللہ کرتے ہیں۔

● زندگی حادثوں کی ہے تقریب　　وقت نامہ نگار ہوتا ہے

● اِن مناظر سے نگاہیں کبھی مانوس نہ تھیں　　عرشؔ آویزاں ہیں ہر چہرے پہ کتنے چہرے

● عرشؔ سنگِ میل ہوگا تیرا ہر نقشِ قدم　　زندگی سے زندگی کا مدعا بن کر گزر

● اپنے ماحول کا ہر اک فنکار　　عمر بھر قرض دار ہوتا ہے

● کچھ سیاست ہے جُرم کی دُنیا　　کچھ قوانین اتنے سخت نہیں

یہ بات واقعی حیران کن ہے کہ عرشؔ نے کیسے کیسے خشک مضامین کو اشعار کے سانچے میں ڈھال کر انہیں زندہ و جاوید کر دیا ہے۔

● گو مساوات کا ہے شور بہت　　لوگ ورنہ غریب ہیں کتنے

● جو سیاست کی دین ہیں اے عرشؔ　　وہ اندھیرے مہیب ہیں کتنے

● بس اتنی داستانِ مختصر ہوں　　میں خود ہی زخم خود ہی چارہ گر ہوں

● نہ ٹوٹ پائیں گی ہرگز کوئی بھی صورت ہو　　مری وفائیں ہیں یہ کانچ کا گلاس نہیں

جواز:

''جواز'' عرشؔ صہبائی کا تازہ ترین مجموعہ کلام ہے جو ۲۰۱۱ء میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آیا ہے۔ ۱۲۸ صفحات پر مشتمل اس مجموعۂ کلام میں کل ۱۱۵ غزلیں شامل ہیں۔

عرشؔ صاحب نے مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے مگر غزل اُن کی محبوب ترین صنف ہے۔ عرشؔ صہبائی کا کلام اپنی متعدد خصوصیات کی بنا پر مشہورِ زمانہ ہے۔

''جواز'' کی غزلیں مختلف کیفیات پر مشتمل ہیں۔ عرشؔ صاحب ایک حق گو اور حق پرست شاعر ہیں۔ عرشؔ کی بے باکی اور حق گوئی اُن کے کلام سے صاف چھلکتی ہے۔ حق پرست انسان کو اپنی زندگی میں کن کن مُشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کن کن مراحل سے اُس کا گُزر ہوتا ہے۔ ایک حق گو انسان کو زہر کا پیالہ تک بھی پینا پڑتا ہے۔ اس ضِمن میں عرشؔ صاحب کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

● جہاں بھی حق پرستوں کا ہے مقتل		وہیں اِک لاش میری بھی پڑی ہے

اِسی شعر سے عرشؔ صاحب نے ''جواز'' کی شروعات کی ہے۔ اس شعر کو پڑھنے کے بعد یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ عرشؔ بھی اُن لوگوں میں سے ہیں جو حق گوئی کیلئے اپنی جان تک قربان کر سکتے ہیں۔

مجھ کو حق پر کیا گیا قربان		یہ شہادت مجھے نصیب ہوئی

حق بات کہنے کے لئے بہت ہمت کی ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔ لہٰذا حق گو اور با اصول انسان کو ہمیشہ مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

وہ بن جاتا ہے وجہ نکتہ چینی		جسے حاصل ہو اِس کی ہم نشینی

بظاہر اس شعر میں 'اُس کی' سے مراد حقیقت گوئی سے ہے لیکن عرشؔ مخالفتوں سے گھبراتے نہیں ہیں بلکہ کچھ یوں فرماتے ہیں۔

● نظر انداز کر دینا اسے تم		زمانے کی ہے عادت نکتہ چینی

● راہِ حق میں کتنے پیچ وخم ملے		راہ رَو اس پر تازہ دم ملے

عصرِ حاضر میں انسانیت کی زبوں حالی کے بارے میں عرشؔ صاحب بہت باریکی سے سوچتے ہیں۔ اِسی لئے اُن کے اشعار دورِ حاضر کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔ ایسے حالات میں عرشؔ کو سکون نہیں ملتا۔ ایک مقطع ملاحظہ فرمائیں۔

نہ ہو سکا کوئی لمحہ سکوں کا عرشؔ		لگتا ہے جیسے مُدتیں گزریں جئے ہوئے

اِن سب کے باوجود بھی عرشؔ صاحب کے دِل میں انقلاب کی اُمید برقرار رہتی ہے اور وہ بے سکونی میں بھی سکون محسوس کرنے لگتے ہیں۔ دیکھئے۔

صبح ہوتے ہی وجود اُن کا بکھر جاتا ہے		وہ اندھیرے جو سرِ شام مسکراتے ہیں

مُشکلات وحادثات کے سامنے سینہ سپر ہو کر کھڑے رہنا اور مسلسل جدوجہد کرتے رہنا ہی زندگی کا دوسرا نام ہے۔ زندگی کرنے کا یہ طریقہ عرشؔ صاحب کو بے حد عزیز ہے۔ یہ اشعار دیکھئے۔

● اُسے یہ دُھن کہ سنور جائے گُلستاں اُس کا		اگرچہ برق کی زد میں ہے آشیاں اُس کا

- جن کو جلنا ہوتا ہے وہ چراغ جلتے ہیں ‏ ‏ ‏ ‏ تیز تر ہواؤں کا کتنا زور ہوتا ہے

عرشؔ صاحب نے اپنے لئے ہمیشہ الگ راہ چُنی۔ عام راہ سے ہٹ کر چلنا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ اُن کی شاعری میں ہر جگہ انفرادیت کی چھاپ نظر آتی ہے۔

شبنم تیری یادوں کی:

جس طرح عرشؔ صہبائی کے دوسرے شعری مجموعوں کے ناموں کے اندر بے پناہ شعریت اور وقار ہے اسی طرح زیرِ نظر شعری مجموعہ ''شبنم تیری یادوں کی'' بھی اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا ہے۔ اس کا سنِ اشاعت ۲۰۱۳ء ہے۔ اس پر بغیر کوئی تبصرہ کئے ہم اس میں سے یہ اشعار قارئین کی نذر کرتے ہیں۔ ان اشعار سے اس شعری مجموعہ کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ عرشؔ صہبائی نے آج تک شعری میدان میں کتنا خوشگوار سفر طے کیا ہے اور اُنہوں نے کتنا قیمتی شعری اثاثہ اُردو ادب کے لئے مخصوص کیا ہے جو ایک مثال ہے۔

- کیا کروں اس میں سکونت اختیار ‏ ‏ ‏ ‏ سَو عذابوں کا نگر ہے زندگی
- اِس کو اک پل بھی سکوں حاصل نہیں ‏ ‏ ‏ ‏ ہر گھڑی محوِ سفر ہے زندگی
- سوچتی ہے کس سے یہ پالا پڑا ‏ ‏ ‏ ‏ خنداں میرے حال پر ہے زندگی
- کر گزرتی ہے جو اس کے دل میں ہو ‏ ‏ ‏ ‏ کس قدر آشفتہ سر ہے زندگی
- یہ مجھے پہچان ہی پائی نہیں ‏ ‏ ‏ ‏ عرشؔ کتنی کم نظر ہے زندگی

چند اور اشعار ملاحظہ کریں۔

- ذکر شامل ہوا ہے جب اُن کا ‏ ‏ ‏ ‏ داستاں قابلِ شنید ہوئی
- جس سے پھر واپسی ممکن نہیں ہوگی اے عرشؔ ‏ ‏ ‏ ‏ ہم کو در پیش کبھی ایسا سفر بھی ہوگا

☆☆☆

☆......محمد یاسین گنائی

فرش سے عرش تک کا سفر۔۔۔عرشؔ صہبائی

کشمیر میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز کب اور کس کے ہاتھوں ہوا ہے؟ یہ ایک غور طلب مسئلہ ہے۔ شاعری جس کے دامن میں کئی اصناف زیرِ سائے ہیں ان میں اگر غزل کے آغاز کی بات کریں تو مختلف محققین نے مختلف اور متضاد آرا پیش کیں ہیں۔ بعض اہل خرد ملا محسن خانی کو اولیت کا تاج پہناتے ہیں، تو بعض کے نزدیک کمال الدین حسینی اندرابی رسواؔ پہلے غزل گو شاعر ہیں۔ عبدالغنی قبول، محمد حشمت اور مرزا علی تقی محشر کے نام بھی اولیت کی دوڑ سے باہر نہیں رکھے جا سکتے ہیں۔ بعض محققین فارسی اور کشمیری زبان کے مشہور شاعر محمود گامی کو بھی اس فہرست میں جگہ دیتے ہیں۔ لیکن غزل کی تاریخ کے اعتبار سے، اس کے فنی لوازمات اور دستیاب غزل کے نمونوں کی جانچ پڑتال کے بعد کشمیر میں اردو غزل کا باقاعدہ آغاز میرزا کمال الدین حسینی رسواؔ سے ہوتا ہے۔ رسوا شہنشاہِ ہند حضرت اورنگ زیبؒ کے صاحب زادے شہزادہ محمد اکبر کے دربار میں ملازم تھے۔ رسواؔ کے انتقال کے بعد ان کے شاگرد بچھمی رام نے ان کے خطوط کا مجموعہ ''رقعاتِ خاتم الکمال'' کے نام سے شائع کیا تھا جس میں ان کے فارسی خطوط کے علاوہ اردو کی ایک مناجات اور پانچ غزلیں شامل ہیں۔ انہیں پانچ غزلوں کی بنیاد پر ہمارے محققین نے ان کو ریاست کا پہلا غزل گو شاعر تسلیم کیا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر قدوس جاوید لکھتے ہیں:

''سترہویں صدی کے آخر اور اٹھارویں صدی کے اوائل کے کشمیر الاصل

شاعر مرزا کمال الدین حسینی اندرابی رسؔوا کو کشمیر کا اولین اردو غزل گو تسلیم کیا جائے۔ اگرچہ رسؔوا کی غزلوں کے موضوعات گھسے پٹے ہیں، الفاظ کے برتاو میں کسی معتبر لسانی نظام کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ پھر بھی رسؔوا شمالی ہند کے ابتدائی دور کے شعراء جعفر زٹلی، افضل اور فضلی کے معاصر اور رسؔوا کی غزلوں کی لسانی ساخت میر و سودا کی غزلوں کی لسانی ساخت سے قریب بھی نظر آتی ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ رسؔوا کو کشمیر کا اولین اردو غزل گو شاعر نہ تسلیم کیا جائے۔"[1]

رسؔوا کے بعد ریاست میں اردو غزل کے باقاعدہ ارتقاء کے سلسلے میں شاعرِ کشمیر غلام احمد مہجور کا بھی اہم مقام رکھتا ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جو شعراء منظر عام پر آئے ہیں۔ ان میں طالب کاشمیری، میر غلام رسول نازکی، شہہ زور کاشمیری، غ۔ م۔ طاوس، میکش کاشمیری، رسا جاودانی، تنہا انصاری، مرزا کمال الدین شیدا، شوریدہ کاشمیری، غلام علی بلبل، قیصر قلندر، حامدی کاشمیری، عرش صہبائی وغیرہ شامل ہیں۔ زیرِ نظر شعراء کے علاوہ بھی بیسویں صدی میں درجنوں شعراء ریاست میں غزل کے منصبۂ شہود پر آچکے ہیں۔ لیکن ان تمام شعراء میں جن چند شعراء کی دھوم برصغیر ہند و پاک میں مچی ہوئی ہے اور تا حال ان کا قلم موجزن نظر آتا ہے۔ ان میں عرشؔ صہبائی کا نام شامل ہے۔

عرش صہبائی ریاست کے سر برآوردہ غزل گو شاعر ہیں۔ ان کا شعری سفر پچھلے ساٹھ برسوں سے جاری ہے۔ انہوں نے اردو غزل کو خصوصاً اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ ان کے ڈیڑھ درجن شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ وہ ریاست کے سب سے زیادہ زود گو اور بسیار نویس شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں روایتی مضامین کے ساتھ ساتھ ترقی پسند اور جدید موضوعات بھی ملتے ہیں۔ عرش کی غزلوں میں زندگی اور متعلقات زندگی کے بے شمار پہلو جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ وہ انسانی اقدار کی پاسداری کرنے والے شاعر ہیں۔ ان کی غزلیں فکر و احساس کی تازہ کاری کا عمدہ نمونہ پیش کرتی ہیں۔

- کتنی آوازوں کا شور بپا ہے مجھ میں — ایسا لگتا ہے کوئی شہر بسا ہے مجھ میں

● روداد ہم اسے دیدتر کچھ نہیں کہتے
کہنے کو بہت کچھ ہے مگر کچھ نہیں کہتے

● بدلنا ہے مجھے اے عرشؔ زندگی کا نظام
ملس سے لاکھ رسوم کہن کے پہرا ے ہوں

شاعری کے علاوہ عرشؔ نے ''سُدھا جین انجم: اپنے کلام کے آئینہ میں'' کے عنوان سے ایک کتاب بھی تیار کی ہے۔جس میں جموں سے تعلق رکھنے والی شاعرہ سدھا جین انجم کی شاعری کو ترتیب دیا گیا ہے۔اس کتاب میں عرشؔ نے انجم کی حیات، ادبی خدمات، شاعری کے محاسن اور ان سے اپنی ذاتی ملاقات کو اس طرح جوڑا ہے کہ یہ کتاب تیار ہو گئی۔باتوں باتوں میں ہی انجم کی پوری زندگی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ایک ادیب یا شاعر کا یہ بھی حق بنتا ہے کہ وہ دوسروں کی خدمات کو بھی عوام تک پہنچائے اور اس ضمن میں عرشؔ کا یہ کارنامہ بھی گراں قدر ہے۔ایک جگہ عرشؔ انجم کے شاعرانہ محاسن کے بارے میں لکھتے ہیں:

''انجم صاحبہ نے اپنے اشعار میں جو زبان استعمال کی ہے نہایت شستہ اور سادہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ اُن کے اشعار پڑھنے کے بعد دل میں اُتر جاتے ہیں اور اکثر اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دو شخص آپس میں بات چیت کر رہے ہیں۔''

اتنا ہی نہیں عرشؔ نے میرؔ، مصحفیؔ، آزادؔ وغیرہ کے راستے پر چل کر شعراء کے تذکرے بھی ترتیب دیئے ہیں۔جن کے نام ''انجم کدہ'' اور ''یہ جانے پہچانے لوگ'' رکھا ہے۔''یہ جانے پہچانے لوگ'' ۱۹۶۶ء میں منظر عام پر آنے والا ان کا بہترین تذکرہ ہے۔اس تذکرے میں عرشؔ نے اردو کے چالیس منفرد شعراء کا تذکرہ کیا ہے۔پرانی رسم کو برقرار رکھتے ہوئے انہوں نے شاعر کا مختصر تعارف اور چند اشعار نمونے کر طور پر پیش کیے ہیں۔شعرا کا تعارف پیش کرنے سے ان کے اندازِ بیان، طرز تحریر اور الفاظ کے انتخاب کا ہنر خوب کھل کر سامنے آتا ہے۔عرش صہبائی ۱۹۳۰ء میں جنم لینے والے کنول میرٹھی کا تعارف ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

''حساس ہونے کے باعث اکثر خاموش رہتے ہیں۔کم گوئی کے ساتھ ساتھ صاف گوئی بھی ان کی عادت میں شامل ہے۔زندگی میں مختلف حادثات کا شکار رہے ہیں جس کا عکس ان کے کلام میں جا بجا ملتا ہے۔ان کا کیف آفرین

ترنم اور پُر سوز کلام محفلِ شعر و سخن میں ایک عجیب سماں باندھ دیتا ہے۔''

عرش نے اس تذکرے کے آخر میں اپنے چند قطعات اور غزلیں بھی شامل کی ہیں۔ اس تذکرے کی خاص اہمیت یہ ہے کہ عرش نے ایسے چالیس شعراء کا انتخاب کیا ہے جو اردو دنیا میں زیادہ دھوم دھام اور مقبول عام کا رتبہ نہیں رکھتے ہیں۔ عرش نے اپنی بساط کے مطابق ان شعراء کی شاعری کو قارئین تک پہنچانے کی احسن کوشش کی ہے۔

وہ خود اس تذکرے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اس تذکرے میں بیشتر غیر متعارف شعراء کا کلام شامل کیا گیا تھا۔۔۔
> ہمارے ملک میں ایسے کئی باصلاحیت اور ذہین فنکار ہیں جو جماعت بندی سے کوسوں دور ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات منظر عام پر نہ آسکیں اور اپنے تذکرے مرتب کرتے وقت اکثر مرتبین نے انہیں نظر انداز کر دیا۔''

عرش صہبائی نے جہاں دیگر گمشدہ شعراء کی کہکشاں کو ایک راہ متعین کر کے دی ہے وہاں اپنی شاعری کو بھی فرش سے عرش تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ان کے درجنوں شعری مجموعوں کا مطالعہ کرنے کے بعد متعدد خوبیاں نظر آتی ہیں۔ انہوں نے دبستان لکھنو سے تعلق رکھنے والے شعراء کی طرح سینکڑوں لمبی بحر والی غزلیں لکھی ہیں اور دبستان دہلی سے تعلق رکھنے والے میر، درد، داغ، مومن کی طرح کثیر تعداد میں چھوٹی بحر والی غزلیں بھی لکھی ہیں۔ گویا ان کی غزلوں میں چھوٹی اور لمبی بحر والی غزلوں کا ایک خوبصورت سنگم نظر آتا ہے۔ چند لمبی بحر والی غزلوں کے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

● جو چشمِ باطن سے دیکھئے ہے یہ اک مقدس مقام ساقی
یہاں بھی ہو امتیازِ مذہب تو میکدے کو سلام ساقی

● کسے فرصت ہے ماضی کی پُرانی داستاں چھیڑے
غمِ حاضر میں غلطیاں ہیں اُدھر وہ بھی اِدھر ہم بھی

● ان دیر وحرم کے سجدوں سے انسان نے آخر تنگ آ کر
اکِ مے کا سہارا ڈھونڈ لیا جب رنج ومحن کی بات چلی

● بھکی ہوئی نظریں ہیں قدموں میں بھی لغزش ہیں
کیا آپ بھی پی کر ہی مے خانے سے نکلے ہیں

● جنابِ شیخ بھی آئے ہیں اے ساقی زیارت کو
عقیدت ہے انہیں بھی تیرے مے خانے سے تھوڑی سی

لمبی بحر والی غزل ہو یا چھوٹی بحر والی غزل دونوں میں علم عروض پر کامل دسترس کا ہونا اولین شرط مانی جاتی ہے۔ کشمیر میں اگر چہ بہت کم شعراء کو علم عروض پر دسترس حاصل ہے مگر عرشؔ کو اس فن پر مکمل عبور حاصل ہے جیسا کہ ان کی شاعری کے اوزان، ردیف، قافیہ، فصِ الفاظ، صنائع بدائع وغیرہ کی جملہ خصوصیات سے ظاہر ہوتا ہے۔ جب عرشؔ کی چھوٹی بحر والی غزلوں پر نظر ڈالتے ہیں تو میرؔ، دردؔ، مومنؔ اور داغؔ سے بھی چھوٹی بحر میں ان کے متعدد غزلیں نظر آتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں چند اشعار ؎

● میرے پہلو سے وہ اُٹھ کیا گئے	دل کی دنیا سخت ویراں ہوگئی
● جب بھی ہنگامِ شام ہوتا ہے	ذکرِ مینا وجام ہوتا ہے
● زندگی سے اس طرح بدظن نہ ہو	زندگی ہے قابلِ صد احترام
● پھول سے رخسار پھر یاد آگئے	پھر معطر ہوگیا اپنا دماغ
● کچھ نہیں کھلتا نظر کے سامنے	آپ ہیں یا آپ کی تصویر ہے

عرشؔ صہبائی جدید دور کے اہم غزل شاعر مانے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری چاہیے نظم، قطعہ، دوہا ہو یا غزل، ہر صنفِ سخن میں تمام شعری محاسن نظر آتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں فکر کی گہرائی، فنکارانہ چابکدستی، تشبیہات واستعارات اور تلمیحات کا بھر پور استعمال، سادہ الفاظ، دلکش برتاو، خوبصورت تراکیب، جدید وجاذبِ نظر محاورات، معنیٰ آفرینی، علامت نگاری، منظر نگاری، عصرِ حاضر کے مسائل، حب الوطنی غرض ہر قسم کی خوبی نظر آتی ہے۔ جوشؔ ملسیانی اور

طالب ایمن آبادی سے اصلاح لینے کا یہی طرہ امتیاز حد درجہ بہتر ہے کہ عرشؔ جدید دور کے شعراء میں ایک منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ جوش ملسیانی عرشؔ کی شاگردی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''عرشؔ صہبائی میرے ہی خوش فکر عزیزوں میں سے ہیں۔ چار پانچ سال سے وہ اپنا کلام مجھے دکھاتے اور زبان وفن کے مشورے حاصل کرتے ہیں۔ ان کی غزل میں اشعار کی تعداد تو چھ سات سے زیادہ نہیں ہوتی مگر شگفتہ زمینیں تلاش کرنے اور مشکل زمینوں میں بھی اچھے شعر نکالنے میں ان کی کوشش قابل ستائیش ہے۔ کلام میں عریانی بھی نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی پاکیزہ طبیعت اور پاکیزہ بیان کار جحان عریاں مضامین سے کوسوں دور رہتا ہے۔''

ایک شاگرد کی خوبیاں اور خامیاں اس کے استاد سے کون بہتر جان سکتا ہے۔ جوش ملسیانی کے بیان سے عرشؔ کے بارے میں تمام شک وشبہات دور ہو جاتے ہیں۔ استاد کی اس ایک بات سے عرشؔ کا عریانی سے دور رہنا اور مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کرنا غرض تمام سوالات کا بھر پور جواب ملتا ہے۔ جہاں عرشؔ نے مختلف قبیل کی تلمیحات اور علامت سے اپنی شاعری کو انمول بنایا ہے، وہاں اردو کے برگزیدہ شعراء کی طرح انہوں نے بھی درجنوں اشعار میں صنعت تعلیٰ کا استعمال کر کے اپنی شاعری کو ایک نئی راہ عطا کی ہے۔ عرشؔ نے اپنی شاعری خصوصاً غزلوں میں صنعت تعلیٰ کا بھر پور استعمال کیا ہے۔ مثلاً

- عرشؔ! اُن کی بزم میں پھر اپنی رسوائی ہوئی ۔۔۔ آج پھر ہم ضبط کا انعام لے کر آگئے
- سُنا تھا عرشؔ صہبائی بہت مغرور ہیں لیکن ۔۔۔ جو دیکھا تو یہ حضرت ہر کسی کی مان لیتے ہیں
- بہت طویل ہے افسانہ محبت عرشؔ ۔۔۔ تمام عمر سنا کر بھی ہو سکے نہ تمام
- ہم عرشؔ کو شاید کہیں پہلے بھی ملے ہیں ۔۔۔ اس شخص کی ہر بات زمانے سے جدا ہے

شاید یہی وجہ ہے کہ پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، ڈاکٹر جاوید وششٹ، ڈاکٹر پریمی رومانی، ڈاکٹر شکیل بدایونی، ڈاکٹر مشتاق عالم، جیسے محقق ان کی تعریفیں [illegible] بھی نہیں ہیں۔ ڈاکٹر جاوید وششٹ عرشؔ کے شعری مجموعہ ''ریزہ ریزہ وجود''

میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

شاعر کہنہ مشق و پختہ کار ہے۔ زبان و بیان پر قدرت رکھتا ہے۔ وہ نئے ادبی شعور سے باخبر ہے اور جدید شعری رجحان سے بھی واقف ہے۔ غزل کی کلاسیکی روایت سے لے کر اس کی لطافت و نزاکت، اس کے بدلتے روپ، اس کی اشاعت و ایمائیت کے ہر لطیف کنایہ کو نہ صرف شاعر سمجھتا ہے بلکہ اشعار میں ڈھالنے کا گُر بھی جانتا ہے۔ مختصر یہ کہ عرشؔ صہبائی اردو غزل میں اپنا انفرادی رنگ قائم کر چکے ہیں اور دورِ جدید میں وہ اردو کے منفرد صاحبِ طرز غزل گو ہیں۔''

عرشؔ کی غزلوں میں نرالی اور البیلی قسم کی تراکیب کا سنگم بھی ملتا ہے۔ انہوں نے کچھ روایتی تراکیب کو استعمال کیا ہے اور کچھ نئی دریافت کی ہیں۔ ان تراکیب میں علاقائیت، اخلاقیت، سحر کا اثر، الفاظ کی موزونیت اور روانی نظر آتی ہے۔ چند دلکش تراکیب کچھ اس طرح ہیں: '' نشترِ غم، پُرسشِ بیمارِ غم، شکستِ دل، رشکِ ارم، زحمتِ لُطف، شامِ الم، دلِ برباد، تاثیرِ محبت، معراجِ محبت، عالمِ وحشت، محفلِ زیست، جانِ بہاراں، خوگرِ آفات، سُپرِ دِ گردشِ آیام، شدتِ آلام، فارغِ الم، صاحبِ اخلاق، چشمِ ساقی، صورتِ شبنم، بارِ خاطر، ترکِ ملاقات، نشاطِ جاوداں، تسکینِ دل، ہنگامِ شام، وقتِ شام، وقتِ صبح'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اردو شاعری کی جدید تر تکنیک میں بھی مرکبات و علامات کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ کسی بھی دور کی غزل کا مطالعہ کیجیے تو زمانے میں رواج پانے والی متعدد تراکیب ضرور نظر آتی ہیں۔

ایک شاعر کے لئے اپنے آپ کو اپنی مٹی سے دور رکھنا کچھ ایسا ہی ہوتا ہے جیسے مچھلی کو پانی سے۔ اردو کے تمام شعراء نے اپنے وطن اور اپنے عصری مسائل کی ظاہر یا اشاراتی عکاسی ہے۔ اگرچہ عرشؔ کو میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، فیضؔ، چکبست، آتشؔ، احمد فراز وغیرہ کی صف میں نہیں رکھ سکتے۔ لیکن کشمیر کے قدرتی مناظر، شاندار اور پُرکشش تاریخ، ناسازگار حالات، عصری مسائل، تہذیبی بحران، رسم و رواج، کشمیریت، شرافت اور دیگر حسن و جمال کے کرشمہ ساز خوبیاں عرشؔ جیسے شاعر کو کیسے سکون سے بیٹھنے دیتی۔ کم ہی سہی لیکن عرشؔ کی شاعری میں اشاروں اور

کنایوں میں کشمیر کی ترجمانی خوب نظر آتی ہے۔ ان دونوں چیزوں کی عکاسی عرشؔ کے مکالماتی، اشاراتی، تشبیہاتی، استعاراتی، کنایاتی اور تلمیحاتی انداز میں نظر آتی ہے۔

- یاس وحسرت، آہ ونالہ، درد وشیون، رنج وغم — زندگی کی داستاں کے بس یہی کردار ہیں
- ہم ایک دوسرے کے حال میں شریک رہیں — تم اپنے ساتھ مجھے بھی اداس رہنے دو

عرشؔ کی شاعرانہ بصیرت اور فنکانہ ذوق پر متعدد مضامین اور مقالات لکھے گئے ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے کلام کو کلیات کی شکل دی جاتی اور کسی یونیورسٹی سے ان پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کا تحقیقی کام بھی شد ومد سے جاری ہونا چاہیے۔ تا کہ اردو ادب کے تئیں ان کی خدمات کا حق ادا ہو سکے۔ کچھ یہی کام جموں یونیورسٹی نے بھی کیا جہاں عرشؔ کی حیات اور خدمات پر تحقیقی کام مکمل ہو چکا ہے۔ کوشل کرن ٹھاکر نامی ایک خاتون نے عرشؔ پر تحقیقی کام کر کے اس مقالے کو کتابی شکل بھی دی ہے جس کیلئے وہ داد کی مستحق ہے۔ ڈاکٹر پریمی رومانی نے اپنے تحقیقی مضمون ''ریاست جموں کشمیر میں نئی اردو غزل کا منظر نامہ'' میں عرش صہبائی کی عظمت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

> ''عرش صہبائی اصولِ فن اور صحتِ زبان کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ وہ فرسودہ مضامین نظم کرنے کے بجائے نئے نئے خیالات کو عمدہ الفاظ کے دلکش لباس میں جلوہ گر کرتے ہیں۔ وہ غزل گوئی میں عصری میلانات کے ساتھ ساتھ کلاسیکی رنگِ غزل کے قائل ہیں۔''

ایک شاعر کا دماغ عام انسان کے مقابلے میں زیادہ حساس ہوتا ہے۔ وہ اپنے تخیل کو بروئے کار لا کر کچھ ایسی تصاویر پیش کرتے ہیں، جن کے اصل اور نقل کا ہمیں احساس تک نہیں ہوتا ہے۔ شاعر محاکات سے کوئی ایسی داستان پیش کرسکتا ہے کہ وہ ہمارے ممکنات میں شامل ہو جائے گی۔ عرشؔ صہبائی کا طرز تحریر اور دلکش انداز کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے۔ انہوں نے زندگی کی کچھ تلخ حقائق، قسمت اور تقدیر کا عجیب وغریب کھیل، انسان اور انسانیت کا ہمدردانہ رشتے، ندامت اور قدامت، خودداری اور وفاداری، علم وعمل غرض انسان کی زندگی کی کچھ اہم

صفات کو بھی سامنے لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں:

- آدمی کو کرنا پڑتا ہے سرِ تسلیم خم ‏ دب نہیں سکتا کبھی جو وقت کی آواز ہے
- پھر کبھی یہ لوگ ملنے کے نہیں ‏ ہم سے اربابِ وفا کی قدر کر
- یہی تو زندگی کے ارتقاء کی ہیں بنیاد ‏ حقیقتوں کو کبھی بے لباس رہنے دو
- لوگ جو ہیں شعور سے خالی ‏ جاگ کر بھی وہ سوتے رہتے ہیں

بیسویں اور اکیسویں صدی کے اس ہونہار شاعر کے بارے جتنا بھی لکھا جائے اتنا ہی کم ہے۔ درجنوں شعری مجموعوں کی اشاعت ہی ان کے تاریخ ماضی، روشن حال اور تابناک مستقبل کی دلالت کے لئے کافی ہے۔ ان کو اردو زبان وادب کی خدمات کے عوض جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگوئجز سرینگر کی طرف سے تین بار انعام سے نوازا گیا ہے۔ سچ کہیں تو عرشؔ کی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ ان کو اب تک ہندوستان کی مختلف اردو اکادمیوں ،ریاستی حکومت اور دیگر ادبی اداروں سے متعدد انعامات واکرامات سے سرفراز ہونا چاہیے تھا۔ ہم مستقبل میں عرش کو ان اہم انعامات سے نوازنے کی امید رکھتے ہیں۔ حالانکہ مشرق میں ایک روایت کہ بڑے لوگوں کی قدر ان کے مرنے کے بعد ہی کی جاتی ہے۔ مگر ہم اردو والے عرشؔ کی لمبی عمر کے لئے ہی دعا گو رہیں گے۔

عرشؔ صہبائی کے متعلق مشاہیر کی آراء

(۱) ابو الفصاحت جناب جوشؔ ملسیانی

''شگفتہ زمینیں تلاش کرنے اور مشکل زمینوں میں بھی اچھے اشعار نکالنے میں ان کی کوشش قابلِ ستائش ہے۔ کلام میں عُریانی بھی نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی پاکیزہ طبیعت کا رجحان عُریاں مضامین سے کوسوں دور رہتا ہے۔''

☆

(۲) پروفیسر ڈاکٹر منوہر سہائے انورؔ

''جناب عرشؔ صہبائی کے کلام میں افکار کی طرفگی کے ساتھ ساتھ بیان کی دل آویزی بھی پائی جاتی ہے جو دورِ حاضر کے جواں سال شعراء کے اشعار میں کبریتِ احمر کا حُکم رکھتی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ جناب عرشؔ صہبائی اصولِ فن اور صحتِ زبان کا بڑا خیال رکھتے ہیں اور فرسودہ مضامین نظم کرنے کے بجائے نئے نئے خیالات کو عمدہ الفاظ کے دلکش لباس میں جلوہ گر کرتے ہیں۔ دُنیائے اُردو کو اُن کی ذات سے بڑی توقعات رکھنی چاہیئے۔''

(۳) بشیشور پرشاد منورؔ لکھنوی

''شکستِ جام'' کلام میں نے دیکھا۔ اُس میں ہمت و حوصلہ کے ساتھ آگے بڑھنے کا

جذبہ بڑی شدت کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ بیشتر اشعار میں عملی زندگی کی تڑپ پائی جاتی ہے۔ عرشؔ صہبائی نے انہیں ذاتی تجربات اور حقائق کے سانچے میں ڈھالا ہے۔''

☆

(۴) شکیل بدایونی

''جناب عرشؔ صہبائی بہترین غزل گو اور بڑے ہونہار نوجوان ہیں۔ ان کا تغزل کافی نکھرا اور سلجھا ہوا ہے۔ شگفتگی اور رعنائی کے ساتھ گداختگی کی بھی کمی نہیں ہے۔ زندگی کی نقاشی اور کائنات کی عکاسی بھی جلوہ گر ہے۔ عرشؔ صاحب کا مستقبل درخشاں ہے اور حال کی تابناکی ان کو بہت اعلیٰ مقام پر پہنچائے گی۔''

☆

(۵) ڈاکٹر جاوید وشِشٹ، ''مغنیٔ حیات''، عرشؔ صہبائی

''عرشؔ صہبائی اُردو غزل میں اپنا انفرادی رنگ قائم کر چکے ہیں اور دورِ جدید میں وہ اُردو کے منفرد صاحبِ طرز غزل گو ہیں۔ عرشؔ صہبائی نے اپنی غزلوں میں زندگی کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ خود اپنا محور بن جاتی ہے۔ ان کی غزل میں آ کر زندگی خود غزل بن جاتی ہے۔ میں اسے ان کی انفرادیت قرار دیتا ہوں۔''

☆

(۶) علی جواد زیدی

''نوجوانی میں غزل گوئی بے حد صبر آزما ہوتی ہے۔ رندی و حُسن پرستی کے ساتھ غم کا گداز اور تجربے کی گہرائی ذرا بہ دیر آتی ہے پھر زبان و بیان کے مرحلے آتے ہیں جہاں قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ شاید یہی سبب ہو کہ موجودہ دور میں غزل گو شاعر مشکل سے ملتا ہے۔ عرشؔ صہبائی اس لحاظ سے مستحقِ ستائش ہیں کہ انہوں نے غزل کو شاعری کی جولاں گاہ بنایا ہے۔ ''ایک تبسم ایک نظر'' عرشؔ صہبائی کے احساسِ حُسن میں ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ ان کے صحت مند محبتِ عشق کے مرض کی سرحدوں کو نہیں چھوتی۔ ان کا عشق ایک جوان اور صحت مند

عشق ہے جو ایک مسکراہٹ پر دُنیا کو نثار کر سکتا ہے اور ایک نظر سے دُنیا کا سودا کر سکتا ہے، مگر جو کائنات کی حقیقتوں اور تلخیوں سے بے خبر نہیں ہوتا۔ ادھر کئی برس کے بعد ریاست جموں و کشمیر کے کسی شاعر کا اُردو مجموعۂ کلام شائع ہوا ہے۔ عرشؔ صہبائی ہماری مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ہی سب سے پہلے جمود کو توڑا ہے۔''

☆

(۷) ابر احسنی گنوری

''میں یہ کہنے پر مجبور ہوں عرشؔ صہبائی کے اشعار میں قدرتی صلاحیت کو زیادہ دخل ہے اور ان کی مشق و محنت کو کم بلکہ بہت کم۔ اس لئے کہ ایسی اُن کی عمر ہی کیا ہے اس عمر میں تو شعر کے ہجے بھی نہیں آتے۔ مشق تو وہ اب کریں گے اور خدا جانے مشاق ہونے کے بعد اس تلوار میں کتنی کاٹ پیدا ہو جائے گی۔''

☆

(۸) شِفاؔ گوالیاری

''شِکستِ جام'' قدیم و جدید شاعری کا حسین سنگم ہے۔ رجائیت کا عنصر زیادہ غالب ہے۔ حیات و کائنات کے نظام کی خرابی پر بھی ہلکی ہلکی نشتر زنی کی ہے جمالیات کے سانچے میں وقت کی گونج کو ڈھالا ہے۔ تغزل کا رنگ کافی نکھرا ہوا ہے۔ شگفتگی، روانی اور سلاست ہر جگہ نمایاں ہے۔ ''شکستِ جام'' گلرنگ و سدا بہار اور غمِ جاناں و غمِ دوراں کا بہترین امتزاجی شاہکار ہے۔

☆

(۹) اسلم سیتا پوری

قوّتِ تسخیر اے جموں تری مشروط ہے
تیری دارائی نہ ہوگی عرشؔ صہبائی کے بعد

☆

(۱۰) علامہ انوؔر صابری

حُسن سے ان کی رسم و راہ تو ہے
چوٹ کھائی ہوئی نگاہ تو ہے

☆

(۱۱) جسٹس آر پی سیٹھی، سابق جج سپریم کورٹ آف انڈیا

''عرؔش صہبائی محض ایک فرد نہیں بلکہ تحریکِ اُردو ادب کے چند سربراہوں میں سے ہیں جن پر نہ صرف ریاست جموں وکشمیر کے عوام فخر کرتے ہیں بلکہ پورا برصغیر ہندوپاک اُن کی شاعری سے معطر ہے۔ وہ محض ایک عام شاعر نہیں بلکہ وہ آج کی اُردو شاعری کی جان ہیں۔ وہ ایک پُرخلوص اور مرنجان مرنج ہستی ہونے کے علاوہ آج کے دَور کی شاعری کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ اس کے میرِ کارواں ہیں۔ عرؔش بلا شبہ اُن چند شاعروں میں شمار کئے جاسکتے ہیں جو آج کے نامساعد حالات اور اُردو زبان کی کسم پرسی کے دَور میں بھی اُردو شاعری کی عظمت کو برقرار رکھتے ہوئے بادِمخالف کی پرواہ کئے بغیر شمعِ ادب اور ثقافت کے پرچم کو بُلندیوں کی طرف لے جانے میں گامزن ہیں۔''

☆

(۱۱) ناؔز نظامی

''دَورِ حاضر میں جہاں اُردو زبان وادب پر بازاری پن کی گرفت کو مضبوط کرنے کی شعوری کوششیں کی جارہی ہیں، وہاں اخلاقی اقدار کے مسخ ہونے کے کرب ناک مناظر بھی صاف دِکھائی دیتے ہیں۔ ایسے ماحول میں کھرے کو کھرا اور کھوٹے کو کھوٹا کہنے والے صداقت پسند اور باکردار لوگ نایاب ہوتے جارہے ہیں۔ جناب عرؔش صہبائی کی شخصیت اور شاعری کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ اِخلاقی اقدار کے اس زوال پذیر دَور میں بھی دِن کو دِن اور رات کو رات کہنے کی جُرأت رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے لوگوں کی پذیرائی اِس دَور میں کم ہی ہوتی ہے۔ عرؔش صاحب کہتے ہیں۔

اِس دَور میں جو شخص حقیقت پسند ہے
آوازِ گُمشدہ کے سوا اور کچھ نہیں

عرؔش صاحب کی حقیقت پسند اور بے باک آواز اُنہیں ایک منفرد مقام بخشتی ہے۔''

☆

(۱۲) محمد امین بانہالی

''عرشؔ صہبائی ایک اچھے اور معروف شاعر ہی نہیں بلکہ ایک اچھے انسان بھی ہیں۔ وہ ہر کسی سے بڑے خلوص اور پیار سے ملتے ہیں۔ بڑے تحمل اور شوق سے سُنتے ہیں اور اپنی گراں قدر آرا کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ اُن کے مداح اور اُن کے چاہنے والے ہر جگہ اُن کی شاعری کے دِلدادہ ہیں اور اپنے خیالات کا برملا اظہار خطوط کے ذریعے یا رسائل میں کرتے ہیں جن سے اُن کی شہرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔''

☆

(۱۳) راحت حسین راحتؔ

''عرشؔ صہبائی کے قدردانوں کی کافی تعداد ہے اور اُن کے شاگردوں کا حلقہ بھی بہت وسیع ہے۔ اُن کا شمار برصغیر کے معروف شاعروں میں ہوتا ہے بلکہ ناقابلِ تردید حقیقت یہ ہے کہ اردو کے حوالے سے اُن کی پہچان عالمی سطح پر بھی ہے۔ یہاں اُس واقعہ کا ذکر برمحل ہوگا کہ جب ۱۹۷۱ء کی ہندو پاک جنگ کے بعد اِس غرض سے کہ دونوں ملکوں کے تعلقات بہتر ہوں پاکستان سے ممبرانِ پارلیمنٹ پر مُشتمل ایک وفد ہندوستان آیا تھا تو انہوں نے جو بینر اٹھائے ہوئے تھے۔ اُن میں سے ایک ایسا بھی تھا جس پر عرشؔ صہبائی کا یہ مقبولِ عام شعر لکھا ہوا تھا:

دِل تو کیا چیز ہے ہم روح میں اُترے ہوتے
تُم نے چاہا ہی نہیں چاہنے والوں کی طرح''

☆

(۱۴) منیر قریشی گنگوی

''عرشؔ صہبائی شاعری میں فکر و فن کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اُن کی نظر میں شعر میں الفاظ کی نشست و برخاست میں بڑی اہمیت کا حامل معاملہ ہوتا ہے۔ اس سے شعریت پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ اس دور میں مجموعی طور پر شاعری میں فنی لوازمات کا بحران ہے اس لئے شاعری

صرف خیال تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔''

☆

(۱۵) رشید کانسپوری

عرشؔ صہبائی فی الوقت بقیدِ حیات ہیں۔ اُن کے بارے میں کچھ کہنا خوشامد ہو جاتا ہے۔ لیکن۔ اُن کا ہر دوست اور ''دشمن'' ان کے فن کا دیوانہ ہے اور ان کی شاعری کا مداح اور پروانہ ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ وہ ایک غیور اور خوددار شخص ہیں۔

عرشؔ بے باکی و حق گوئی ہے مذہب اپنا ہم نہ بدلیں گے کبھی وقت کی چالوں کی طرح

☆☆☆

انتخابِ کلامِ عرشؔ

- غزلیں
- نظمیں
- دوہے
- سانیٹ
- قطعات

غزلیں

●

کیا خبر تھی زندگی اک امتحان بن جائے گی
بات جو نکلے گی منہ سے، داستاں بن جائے گی

غم کے ہاتھوں اک بلائے ناگہاں بن جائے گی
رفتہ رفتہ زندگی بارِ گراں بن جائے گی

اے محبت! شدتِ غم میں کسے معلوم تھا
چشمِ پُرنم رازِ دل کی ترجماں بن جائے گی

آج کے دورِ سیاست سے یہی امید تھی
برقِ سوزاں ہی چمن کی پاسباں بن جائے گی

آج ہم زندہ ہیں کل مرحوم ہو جائیں گے عرشؔ
اک حقیقت رفتہ رفتہ داستاں بن جائے گی

☆

●

دل میں افسردگی سی رہتی ہے
اب طبیعت بجھی سی رہتی ہے

میں بھی اپنی وفا پہ نادم ہوں
وہ نظر بھی جھکی سی رہتی ہے

اس کو اک بار دیکھنے کے بعد
عمر بھر تشنگی سی رہتی ہے

یاد آتا نہیں ہے نام اس کا
دل میں صورت بھلی سی رہتی ہے

جب بھی اس سے ہو گفتگو اے عرشؔ
ذہن میں تازگی سی رہتی ہے

☆

●

خوب صورت سے گھر میں رہتا ہے
وہ مری چشمِ تر میں رہتا ہے

دُور تک دائرے ہیں سوچوں کے
ذہن اکثر سفر میں رہتا ہے

شوق ہے اس کا گرچہ سنگ زنی
خود وہ شیشے کے گھر میں رہتا ہے

آشنا ہے رموزِ منزل سے
جو تری رہ گزر میں رہتا ہے

وہ تلاطم کا ہم مزاج ہے عرشؔ
جو سفینہ بھنور میں رہتا ہے

☆

●

مسرت کہاں کن دکانوں میں ہے
یہ ہیرا فقط غم کی کانوں میں ہے

جو منسوب تھا دشمنوں سے کبھی
وہ انداز اب مہربانوں میں ہے

مجھے کعبہ و دیر سے لے چلو
بڑا شور ان کارخانوں میں ہے

مری ذات سے جن کو نسبت رہی
تیرا ذکر بھی ان فسانوں میں ہے

کبھی تُو مرے ساتھ رہ کر تو دیکھ
بڑا لُطف کچے مکانوں میں ہے

☆

●

جانتے ہیں ہم کہ ان پاؤں میں زنجیریں بھی ہیں
ہم وہ رہ رو ہیں کہ جن کے ساتھ تدبیریں بھی ہیں

کِس حسیں سنگم پہ آ کر رُک گئی ہے زندگی
ظُلمتِ ماضی بھی ہے، فردا کی تنویریں بھی ہیں

بے سبب بڑھتی نہیں ہیں وہ دلوں کی دُوریاں
کُچھ خطائیں آپ کی، کچھ میری تقصیریں بھی ہیں

مُدتوں جن کی وضاحت سے رہے محروم ہم
اُن کی خاموشی میں ان باتوں کی تفسیریں بھی ہیں

کون سا یہ آستاں ہے، کون سا ہنگام عرشؔ
سرنگوں سجدے میں تقدیریں بھی، تدبیریں بھی ہیں

☆

●

وہ اِک تابنا کی جو ہیروں میں ہے
کسی کے لبوں کی لکیروں میں ہے

جو مہر و وفا سے نہیں آشنا
وہ مہر و وفا کے سفیروں میں ہے

یہاں گردشِ وقت ہے سرنگوں
کوئی بات تو ہم فقیروں میں ہے

میسر ہیں اس کو سبھی نعمتیں
ہُوا کیا جو وہ بے ضمیروں میں ہے

یہ کیا دور ہے جس میں ہر شخص عرشؔ
غمِ زندگی کے اسیروں میں ہے

☆

●

تشنگی میں ہے سلوکِ اہلِ مے خانہ الگ
ہم پہ طنزاً مسکرا دیتا ہے پیمانہ الگ

ایک سازش تھی کہ میخواروں میں صہبا بٹ گئی
میں یہ سمجھا بزم میں ہے میرا پیمانہ الگ

جاں نثارانِ وفا کا کیا یہی انجام ہے
ایک گوشے میں پڑی ہے خاکِ پروانہ الگ

جب بھی دہرائے گی دنیا داستاں اس دور کی
سب کے افسانوں سے ہوگا اپنا افسانہ الگ

ابتدا سے ایک افسانہ محبت کا ہے عرشؔ
ہاں مگر ہر بار ہے عنوانِ افسانہ الگ

☆

●

مُدّت سے نہ یادوں کی کوئی شمع جلی ہے
دل ہے کہ کسی شہر کی ویران گلی ہے

دل میں ہے ضیا تیرا داغِ تمنا
صد شکر کہ محفل میں کوئی شمع جلی ہے

کیا جانیئے کیا گزری ہے پھر دشتِ طلب میں
کچھ دور مرے ساتھ تری یاد چلی ہے

آنکھیں ہیں کہ مستی کے چھلکتے ہوئے ساغر
نازک سے وہ لب ہیں کہ شگفتہ سی کلی ہے

خاموشی سے اب دیکھئے انجام ہو جو عرشؔ
طُوفاں کا جدھر رُخ ہے اُدھر ناؤ چلی ہے

☆

●

محبت میں حیاتِ نو کی یوں تشکیل ہوتی ہے
اُدھر ارشاد ہوتا ہے، اِدھر تکمیل ہوتی ہے

نہ دو لب ہائے نازک کو عبث تکلیف جنبش کی
نگاہوں سے بھی اکثر بات با تفصیل ہوتی ہے

وجودِ حق میں مل جاتی ہے ایسے ہستیٔ باطل
سحر میں جس طرح تاریک شب تحلیل ہوتی ہے

ہزاروں رنگ بھرتے ہیں جہاں والے مگر پھر بھی
محبت کی حکایت تشنۂ تکمیل ہوتی ہے

یہی جی چاہتا ہے عرشؔ ان میں غرق ہو جائیں
وہ آنکھیں ہیں کہ جیسے نیلگوں سی جھیل ہوتی ہے

☆

●

ہر ایک رنگ میں کاٹیں گے ہم سزا ہی سہی
یہ زندگی کسی مفلس کی بد دعا ہی سہی

نہ اس کو بھول کہ میں نے تجھے کیا تخلیق
یہ اور بات ہے تو وقت کا خدا ہی سہی

یہی بہت ہے کہ مجھ پر تری توجّہ ہے
تری نگاہ کا انداز دوسرا ہی سہی

کوئی تو شکل ہو جس سے یہ زندگی گزرے
نہیں کچھ اور تو اک دردِ لا دوا ہی سہی

وہ میری روح میں تحلیل ہو چُکا ہے عرشؔ
اگر وہ مجھ سے جُدا ہے، چلو جدا ہی سہی

☆

●

پھر سے دل کھِل جائے، ایسی کوئی بھی صورت نہیں
وہ کہیں مِل جائے، ایسی کوئی بھی صورت نہیں

آرزوؤں کی جو بستی چھوڑ کر آیا ہوں میں
اَب اُدھر دِل جائے، ایسی کوئی بھی صورت نہیں

اس قدر بے رہ رَوی میں مست ہے ہر راہ رَو
سوئے منزل جائے، ایسی کوئی بھی صورت نہیں

دل کہ اَب شام وسحر رہتا ہے اکثر بے قرار
کچھ سکوں مِل جائے، ایسی کوئی بھی صورت نہیں

ہونٹ سِل سکتے ہیں یہ تسلیم ہے مجھ کو مگر
چاکِ دل سِل جائے، ایسی کوئی بھی صورت نہیں

بڑھ چکی ہیں اِس قدر کچھ دو دلوں کی دوریاں
دل سے دل مِل جائے، ایسی کوئی بھی صورت نہیں

عرشؔ جو بادِ صبا کے فیض سے مُرجھا گئی
وہ کلی کھِل جائے، ایسی کوئی بھی صورت نہیں

☆

●

عہدِ رواں کا کرب ہوں، فردا کی آس ہوں
میں زندگی میں صورتِ امید و یاس ہوں

اخلاق کے بدن سے نہ مجھ کو اُتاریئے
تہذیبِ زندگی کا پرانا لباس ہوں

ساحل کی شکل میں ہوں سمندر سے ہم کنار
لیکن نہ بجھ سکی جو کبھی ایسی پیاس ہوں

ماضی نے کر دیا ہے مجھے حال کے سپرد
فردا ہی جانتا ہے میں کس کی اساس ہوں

اے عرشؔ بن سکا نہ کبھی میں زمانہ ساز
اتنا ضرور ہے کہ زمانہ شناس ہوں

☆

●

ہر ستم پر ہے پشیماں سا ستم گر میرا
وہ سمجھتا تھا بکھر جائے گا پیکر میرا

ایک ندی ہوں، نہیں کم یہ مقدر میرا
راستہ دیکھتا رہتا ہے سمندر میرا

یوں تو کہنے کو چمن پر مرا حق ہے لیکن
خار و خس ہی نہ چمن کے نہ گلِ تر میرا

زندگی جب سے تری چشمِ کرم ہے مجھ پر
غم و آلام سے محروم نہیں گھر میرا

باوجود اس کے تردد میں یقیں رکھتا ہوں
مجھ کو معلوم ہے جو بھی ہے مقدر میرا

اک نئے دور کو آواز لگائی جب بھی
خیر مقدم کیا حالات نے اکثر میرا

●

نکتہ چین سب تھے مری ذات پہ حسبِ توفیق
ذکر ہوتا رہا محفل میں برابر میرا

میری پہچان الگ ہو یہ کہاں ممکن ہے
جذب جب آپ کے پیکر میں ہے پیکر میرا

اتنا پوچھا تھا فقط کس نے جلائی بستی
جرم ثابت ہوا اس پر یہ سراسر میرا

رقصِ بادہ بھی ہے اور جوش پہ ہے محفل بھی
پھر بھی خالی ہے بڑی دیر سے ساغر میرا

کتنی مدت سے پڑا راہ میں اک پتھر ہوں
جی میں ہے کوئی تراشے کبھی پیکر میرا

لغزشیں اور بھی سرزد ہوئیں مجھ سے اے عرشؔ
یہ خطا بھی ہے کبھی جھک نہ سکا سر میرا

☆

●

ہر کوئی شہر میں بے نام و نشاں رہتا ہے
کس کو معلوم ہے یہ، کون کہاں رہتا ہے
مجھ کو تو یاد نہیں اُس کو کبھی دیکھا ہو
کس کا یہ نام ہے جو وردِ زباں رہتا ہے
ہر عروج اس کا گزرتا ہوا موسم ٹھہرا
دلِ انساں میں یہ احساس کہاں رہتا ہے
دیر و کعبہ میں تلاش اُس کی سراسر بے سود
وہ تو ہر لمحہ قریبِ رگِ جاں رہتا ہے
اِس حقیقت سے ہم انکار نہیں کر سکتے
وہ نہاں ہو کے بھی دُنیا میں عیاں رہتا ہے
دل میں اک ترکِ تعلق پہ بھی ہے یاد اُس کی
زخم مِٹ جائے مگر اُس کا نشاں رہتا ہے
حال کس درجہ بھی خوش رنگ ہو لیکن اے عرشؔ
اِس میں شاملِ غمِ ماضی کا دھواں رہتا ہے

☆

●

کتنی آوازوں کا اک شور بپا ہے مجھ میں
ایسا لگتا ہے کوئی شہر بسا ہے مجھ میں

جو ستم بھی ہے وہ مخصوص ہے میری خاطر
زندگی! تو ہی بتا ایسا بھی کیا ہے مجھ میں

اس لئے کھائی نہیں گردشِ دوراں سے شکست
یہ بھی کیا کم ہے کہ جینے کی ادا ہے مجھ میں

بھول سکتا نہیں میں اس کو کسی صورت عرشؔ
کوئی نشتر کی طرح ٹوٹ گیا ہے مجھ میں

☆

●

آج کے دور کی ہر بات جُدا ہوتی ہے
حق کی آواز بھی صحرا کی صدا ہوتی ہے
ہم سفر میرے اسی تاک میں رہتے ہیں مُدام
دیکھتے ہیں کہ کہاں لغزشِ پا ہوتی ہے
زندگی دیکھنے میں گو بڑی معصوم سہی
ہر ادا اِس کی قیامت کی ادا ہوتی ہے
اِس میں ہر ایک قدم سوچ سمجھ کر رکھنا
زہر آلودہ زمانے کی فضا ہوتی ہے
صُبح دَم جب میں گزرتا ہوں گلستاں سے کبھی
خیر مقدم کے لئے بادِ صبا ہوتی ہے
دِل کی ہر آرزو تبدیل ہے اَب حسرت میں
آخری رسم محبت کی ادا ہوتی ہے
میرے اشعار میں سَو خامیاں ہوں گی اے عرشؔ
میں بھی انسان ہوں، اِنساں سے خطا ہوتی ہے

☆

●

دلِ بے تاب کو تسکین بہم ہو تو سہی
ہَم پہ مائل کبھی وہ چشمِ کرم ہو تو سہی
ہم پہ گُزری ہے جو ہم اُس کو بیاں بھی کردیں
دل پہ جو خوف ساطاری ہے وہ کم ہو تو سہی
ہم سے بچھڑے ہیں جو اِک بار کریں اُن کی تلاش
رہِ ہستی پہ کوئی نقشِ قدم ہو تو سہی
ہم نہیں منفی خیالات کے قائل لیکن
ہم ستم خوردہ ہیں، احساس یہ کم ہو تو سہی
اُس کو معلوم ہو کیا غم کی خلش ہوتی ہے
وہ کبھی زندگی میں کُشتۂ غم ہو تو سہی
ہم خیال اپنا بنا لوں گا یقیناً میں اُسے
ہِم سفر وہ مِرا دو چار قدم ہو تو سہی
عرشؔ ناسازیٔ حالات کا ماتم کرلوں
حاصل اتنی بھی مجھے فرصتِ غم ہو تو سہی

☆

●

دلِ حزیں کو کبھی حوصلہ دِیا بھی نہیں
کِیا جو آپ نے وعدہ، وفا کِیا بھی نہیں

مجھے ہو تجربہ کیونکر فریب کاری کا
کہ ایسی راہوں پہ میں نے سفر کِیا بھی نہیں

یہ معجزہ ہے تجھے ہم نے رُوبہ رُو پایا
ابھی زُباں سے ترا نام تک لِیا بھی نہیں

جہان والوں کو جس کی بڑی ضرورت تھی
عجیب بات ہے وہ دیر تک جیا بھی نہیں

ابھی سے ہو گئیں آنکھیں وہ اشک آلودہ
جو دل کا حال ہے میں نے بیاں کِیا بھی نہیں

تُم اپنے ساتھ کئی زخم تازہ لائے ہو
پُرانے زخموں کو میں نے اَبھی سِیا بھی نہیں

میں تجھ سے مانگتا تجھ کو نہ ہو سکی جُرأت
یہ جُرم وہ ہے جو میں نے کبھی کِیا بھی نہیں

گِلہ کروں بھی تو کِس بات کا کروں اے عرشؔ
حِساب اُس کی جفا کا کبھی کِیا بھی نہیں

☆

●

اِس کا جو نقشِ قدم ہے، مُعتبر کب تک رہے
دیکھئے یہ زندگی گرمِ سفر کب تک رہے

ایک سا موسم رہے قائم ضروری تو نہیں
مائلِ لطُف وکرم اُس کی نظر کب تک رہے

کوئی بھی صورت ہو لیکن اس کی کوئی حد بھی ہے
مُشکلوں میں زندگی سینہ سپر کب تک رہے

دیکھتے ہیں ہم کہ کب تک زندگی آتی ہے راس
ناموافق گردشِ شام وسحر کب تک رہے

دُور تک پھیلی ہیں کِس کے حُسن کی رعنائیاں
یہ حسیں منظر مگر پیشِ نظر کب تک رہے

بند کر لُوں دل کے دروازے کو دستک دے جو غم
پھر خیال آتا ہے کوئی در بہ در کب تک رہے

اِس سے بہتر ہے کہ میں ہی مان لوں اپنی شکست
مضمحل سی گردشِ شام وسحر کب تک رہے

دل غموں کی سنگ باری کے نشانے پر ہے عرشؔ
دیکھئے محفوظ یہ شیشے کا گھر کب تک رہے

☆

اہلِ دل سب ہیں مگر حوصلے والے کم ہیں
جو رہِ حق میں مِٹیں ایسے جیالے کم ہیں
مسجدیں کم ہیں نہ دُنیا میں شوالے کم ہیں
اس کے بندوں کو مگر چاہنے والے کم ہیں
آج کے دور میں انساں کو ہیں جو گھیرے ہوئے
اُن اندھیروں کے تناسب سے اُجالے کم ہیں
ہم نے جی بھر کے ابھی آپ کو دیکھا ہی نہیں
دل کے ارمان ابھی ہم نے نِکالے کم ہیں
زندگی جن سے نکھرتی ہے گُلِ تر کی طرح
ایسی قدروں کے یہاں چاہنے والے کم ہیں
ہم بہَر طور سمجھتے ہیں مصائب کا مزاج
ہم مصائب سے مگر ٹوٹنے والے کم ہیں
لوگ پہلے بھی وفا کے لئے مِٹ جاتے تھے
داستانوں میں مگر ایسے حوالے کم ہیں
دل میں کیوں بادہ و ساغر کی تمنا اے عرشؔ
اُس کی آنکھوں کے چھلکتے ہوئے پیالے کم ہیں؟

☆

ناحق اِس پر ہنسنا، ناحق رونا ہے
وہ ہو کر رہتا ہے جو بھی ہونا ہے
رونے والو مُستقبل کی فکر کرو
گزرے لمحوں کو کب تک یوں رونا ہے
ذہن ونظر دن رات پریشاں رہتے ہیں
ایسے میں کیا جاگنا ہے، کیا سونا ہے
صورتِ حال ہو بہتر یہ امکان نہیں
اِس کے لئے بے سود پریشاں ہونا ہے
قربُت کا وہ لمحہ جس میں ہم بچھڑے
اُس لمحے کی خاطر برسوں رونا ہے
اِک دِن اُجڑ کے رہ جائے گی یہ محفل
اک دِن سب کو گھر سے بے گھر ہونا ہے
فنکاروں کو سود وزیاں سے کیا مطلب
فنکاروں نے کیا پانا، کیا کھونا ہے
اب تو رورو کر بھی آنکھیں خُشک ہوئیں
دُنیا کے حالات پہ کتنا رونا ہے

☆

●

مِل سکوں خود سے یہ ارادہ ہے
وقت کم ہے، سفر زیادہ ہے
مجھ کو لاتا نہیں یہ خاطر میں
دل بھی کوئی رئیس زادہ ہے
کِس قدر خوش لباس ہے دُنیا
ایسا لگتا ہے بے لبادہ ہے
وہ ہے تحلیل میری رگ رگ میں
پھر بھی اُس کی کمی زیادہ ہے
بھُول جاتا ہے ہر وفا میری
وہ طبیعت کا کتنا سادہ ہے
اُس کی ہلکی سی مُسکراہٹ میں
لُطف کم ہے، ستم زیادہ ہے
ہونٹ اُس کے بہار کا موسم
اُس کی آنکھیں کہ رقصِ بادہ ہے
ہر ستم سے نوازتا ہے مجھے
دل کا وَہ کس قدر کشادہ ہے
دل میں اُس کے لئے کشش ہے عرشؔ
یہ مِرا جُرمِ بے ارادہ ہے

☆

●

وہ قطرہ ہو کے سمندر دکھائی دیتا ہے
بڑا عجیب سا منظر دکھائی دیتا ہے
دھڑوں کی بھیڑ ہے اِنسان کے لبادے میں
نہ اِن دھڑوں پہ کوئی سر دکھائی دیتا ہے
یہیں لُٹا تھا مِرا کارواں ہے یاد مجھے
جہاں وہ میل کا پتّھر دکھائی دیتا ہے
یہی کہیں گے کہ قُدرت کا فیض ہے اُس پر
وہ خار ہو کے گُلِ تر دکھائی دیتا ہے
بکھر رہا ہے جو گہرا دھواں فضاؤں میں
کِسی کا جلتا ہوا گھر دکھائی دیتا ہے
بے اعتنائی کا عنصر کبھی ہے نظروں میں
کبھی وفا کا وہ پیکر دکھائی دیتا ہے
نہ کوئی ربط ہے اُس سے نہ کوئی رشتہ عرشؔ
مگر وہ خواب میں اکثر دکھائی دیتا ہے

☆

●

اُبھر آئیں کسی کے حُسن کی پرچھائیاں کتنی
نگاہِ پُر فسُوں میں جذب ہیں رعنائیاں کتنی
کلامِ مُعتبر سے کم نہیں نظروں کی اک جنبش
کسی کی خامشی میں ہیں سخن آرائیاں کتنی
یہی لمحے ہیں وہ جن میں اَدب تخلیق ہوتا ہے
کبھی تسکین کا باعث ہیں یہ تنہائیاں کتنی
مقام ایسا کبھی اہلِ خرد کو مل نہیں سکتا
مگر اہلِ جنوں کے ساتھ ہیں رُسوائیاں کتنی
کبھی ہے انجمن آرائیوں میں رنگِ تنہائی
کبھی تنہائی میں ہیں انجمن آرائیاں کتنی
ستارے، پھول، کلیاں، اَبر، رنگ وبُو، دھنک، شبنم
نہیں کوئی وجود اُس کا مگر پرچھائیاں کتنی
جسے کہتے ہیں فن اے عرشؔ اک ایسا سمندر ہے
کبھی ظاہر نہیں یہ اس کی ہیں گہرائیاں کتنی

☆

●

غموں کی یُورشوں میں مُسکرانے والا ہے
دلِ حزیں یہ کرشمہ دکھانے والا ہے
یہی خیال ہے سب کا، ہے کس قدر نازک
مگر یہ دل کئی صدمے اُٹھانے والا ہے
سُنے گا جو بھی وہی اِس کو اپنا سمجھے گا
وہ اس ادا سے فسانہ سُنانے والا ہے
ذرا سی دیر میں آنسو چھلکنے والے ہیں
ذرا سی دیر میں طوفان آنے والا ہے
بشر کو اپنی بھی پہچان تک نہیں ہوگی
یقین کیجئے وہ دَور آنے والا ہے
وہی سفینہ کِنارے پہ جا لگا آخر
جِسے سمجھتے تھے سب ڈُوب جانے والا ہے
حسین ربط ہے سانسوں کا جسم سے اے عرشؔ
مگر یہ ربط کبھی ٹوٹ جانے والا ہے

☆

زندگی کے ناز برداروں میں ہوں
دل سے میں اِس کے پرستاروں میں ہوں
اس طرح ہم لازم و ملزوم ہیں
آپ پھُولوں میں ہیں، میں خاروں میں ہوں
ایک بوسیدہ عمارت ہے سماج
میں بھی اس کی خستہ دیواروں میں ہوں
حق پرستوں میں ہے میرا بھی شُمار
اِس طرح میں بھی گنہگاروں میں ہوں
مجھ پہ بھی ظاہر ہو یہ میرا حالِ دِل
میں بھی شامل اپنے غم خواروں میں ہوں
راحتیں اِس دل پہ یوں دستک نہ دیں
میں فقط غم کے خریداروں میں ہوں
دل کا ہر اک زخم دیتا ہے صدا
مجھ کو دیکھو میں بھی شہکاروں میں ہوں
عرشؔ اس کا کوئی خالق ہے ضرور
جس فسانے کے میں کرداروں میں ہوں

☆

مصائبؔ خیر مقدم کو کھڑے ہیں
ہمارے چاہنے والے بڑے ہیں
یہ حق کے مرحلے بے حد کڑے ہیں
کہ اِن راہوں میں پیچ وخم بڑے ہیں
جنوں اِک مستقل نقشِ قدم ہے
خردِ کے دائرے چھوٹے بڑے ہیں
یہ عالم ہے کہ اپنے حالِ دل پر
بَسا اوقات ہم خود رو پڑے ہیں
جنہیں اُن پاؤں کا ہے لمس حاصل
وہ ذرّے چاندسورج سے بڑے ہیں
کبھی کوئی شریکِ غم نہیں ہے
تماشہ دیکھنے والے بڑے ہیں
نہ تیری بے رُخی سے ٹوٹ جائیں
دلوں کے آئینے نازک بڑے ہیں
نہ سوچو عرشؔ منزل کب ملے گی
غنیمت ہے یہی ہم چل پڑے ہیں

☆

●

ہر عمل، ہر بات کتنی مختلف
صورتِ حالات کتنی مختلف
رات بھی پیدا ہے دِن کی کوکھ سے
پھر بھی دِن سے رات کتنی مختلف
قُرب کا موسم ہے ہم رنگِ بہار
ہجر کی برسات کتنی مختلف
مُجھ کو اُس سے یہ توقع تک نہ تھی
اُس نے کی ہر بات کتنی مختلف
آپ کی اک مُسکراہٹ کے سبب
ہوگئی ہر بات کتنی مختلف
تُم نہیں تو دل سُلگتا ہے دوام
اَب کے ہے برسات کتنی مختلف
چھین لے سب کچھ مگر ظاہر نہ ہو
اُس نظر کی گھات کتنی مختلف
راحتیں بھی وجہِ تسکیں ہیں مگر
غم کی یہ سوغات کتنی مختلف
عرشؔ دل کے ہر ارادے سے کہیں
شدّتِ جذبات کتنی مختلف

☆

●

اور سب کچھ ہے مگر ایسا گُہر کوئی نہیں
اِس جہاں میں زندگی سے معتبر کوئی نہیں
اِس طرح اُلجھا ہوا ہوں گردشِ ایام سے
اَب یہ عالم ہے مجھے اپنی خبر کوئی نہیں
دُور تک آواز دیتی ہیں مِری تنہائیاں
یہ غلط فہمی ہے میری ہم سفر کوئی نہیں
زندگی ہے اصل میں وہ خوبصورت سا مکاں
جِس کی چھت کوئی نہیں، دیوار و دَر کوئی نہیں
مدّتوں سے ہے جنوں کے ساتھ اس کی ساز باز
میں سمجھتا تھا کہ دل سا معتبر کوئی نہیں
مہرو اخلاص و وَفا انسان کی پہچان ہیں
آج ان قدروں سے لیکن بہرہ وَر کوئی نہیں
ذہن و دل ہر حال میں رہتے ہیں اس سے منتشر
وہم ایسی رات ہے جس کی سحر کوئی نہیں
زندگی کی اعلیٰ قدروں کا ہو جو عکاس عرشؔ
ایسا منظر دیر سے پیشِ نظر کوئی نہیں

☆

●

یہ زندگی کسی صورت نہ آئی راس مجھے
فریب دیتی رہی ہے ہر ایک آس مجھے
حیات کیا ہے بہت کم تھی آگہی مجھ کو
مری اَنا نے کیا اور بے لباس مجھے
مزاج پوچھتی رہتی ہے گردشِ دوراں
یہی بہت ہے مِلا کوئی غم شناس مجھے
سوائے تشنگی کوئی نہیں مرا واقف
یہ کون چھوڑ گیا مے کدے کے پاس مجھے
مرے ارداوں کو حاصل ہے تقویت اِتنی
کیا ہے حادثوں نے جتنا بدحواس مجھے
مرے حوالے سے کرتا ہے ذکرِ مہر و وفا
سمجھتا ہے وہ محبت کا اقتباس مجھے
نہیں تھا دل میں مرے اِس کا شائبہ تک عرشؔ
نہ آسکے گا زمانہ کبھی بھی راس مجھے

☆

●

ہر ایک بات میں گو اُس نے اختصار کِیا
نگاہِ شوق نے ہر راز آشکار کِیا
نہ بند کر سکا احساس کے دریچوں کو
نہ پوچھ مجھ سے ترا کتنا انتظار کِیا
ستم کہ ہم سے زیادہ تھا خستہ حال اُن کا
وہ جن سے رشتۂ اُمید اُستوار کِیا
یہ مانتا ہوں کہ حق گوئی ہے مِرا شیوہ
بس اتنی بات پر دُنیا نے سنگسار کِیا
تمام زندگی اِس نے مجھے فریب دیئے
تمام زندگی اِس دل کا اعتبار کِیا
خود اعتمادی کا احساس اِس میں پیدا ہوا
سفینہ ہم نے تلاطم سے ہم کنار کِیا
وفا کے نام سے واقف نہیں ہیں وہ اے عرشؔ
وفا کے نام پر کیوں اُن کو شرمسار کِیا

☆

●

برق و باراں نے بھی کیا دُھوم مچا رکھی ہے
ہم نے جس دن سے نشیمن کی بِنا رکھی ہے
اِس لئے دوسروں کے غم میں تڑپتے ہیں ہم
دل میں احساس کی اک شمع جلا رکھی ہے
جس کو بھی دیکھئے وہ شخص ہے سہما سہما
تُم نے کیا صورتِ حالات بنا رکھی ہے
کیا کہیں آپ سے، ہم گزرے ہیں کس عالم سے
ہم نے تو خود سے بھی یہ بات چھپا رکھی ہے
مُدّعا یہ کہ اُلجھتی رہے دُنیا اس سے
اُس نے دانستہ قیامت سی اُٹھا رکھی ہے
دُور تک پھیلتی ہے جس سے محبت کی ضیا
آج انسان نے وہ شمع بُجھا رکھی ہے
جانتا ہے مری فطرت کو وہ پھر بھی اُس نے
اختلافات کی دیوار اُٹھا رکھی ہے
خدوخال اُس کے ہیں کچھ آپ سے ملتے جلتے
ذہن میں ہم نے جو تصویر بنا رکھی ہے
اس کے مفہوم سے کوئی نہیں واقف اے عرشؔ
ہم نے کس دَور میں بُنیادِ وفا رکھی ہے

☆

●

جانتے ہیں سَر بہ سَر ہیں اک شکستہ ساز ہم
پھر بھی اس دُنیا میں ٹھہرے معتبر آواز ہم
اَفشا ہونے پر بکھر جائے گی ساری کائنات
وقت کے سینے میں پوشیدہ ہیں ایسا راز ہم
صورتِ حالات کچھ بھی ہو نہیں اس سے غرض
لازماً اُبھریں گے بَن کر وقت کی آواز ہم
اپنی ہر مُشکل میں ہوتا ہے یہی پُرسانِ حال
دل کی باتوں کو کریں کیسے نظر انداز ہم
اِس زمانے میں نہیں کوئی بھی اپنا ہم خیال
اِس زمانے میں فقط ہیں اپنے ہم آواز ہم
اپنی ہر بات ٹھہری اِس زمانے سے الگ
آپ ہی کہیئے کہاں تک ہیں زمانہ ساز ہم
عرشؔ قائم ہے جہاں میں اس طرح اپنا وجود
دُور تک بکھرے ہوئے ہیں صورتِ آواز ہم

☆

●

جو نظر خود پسند ہوتی ہے
دائروں میں وہ بند ہوتی ہے
اُس کی ہر بات کا ہے اک معیار
سوچ جس کی بُلند ہوتی ہے
دوسری کے نشاں اُبھرتے ہیں
جب بھی اک راہ بند ہوتی ہے
خود بھی رہتی ہے منتشر اکثر
جو نظر شرپسند ہوتی ہے
ایسی آواز دَب نہیں سکتی
جو بھی دل سے بُلند ہوتی ہے
اپنا اپنا مذاق ہے سب کا
اپنی اپنی پسند ہوتی ہے
دل کے جذبات کی حسین دُنیا
اکثر آنکھوں میں بند ہوتی ہے
دل ہے بگڑا ہوا سا شہزادہ
اِس کی اپنی پسند ہوتی ہے
زندگی کامیاب ہو جو عرشؔ
غم کی احسان مند ہوتی ہے

☆

●

بے گناہی کی کبھی یوں بھی سزا دیتا ہے
دل کو کس درجہ وہ حساس بنا دیتا ہے

بے وفائی کا گلہ کرتا ہوں جب بھی اُس سے
مُسکراتا ہے، نگاہوں کو جھکا دیتا ہے

وہ کہاں رکھتا ہے محروم کِسی غم سے مجھے
اک یہی چیز ہے جو حد سے سوا دیتا ہے

زندگی جس کی گزر جاتی ہے اِس کی خاطر
یہ سماج ایسے اِک فنکار کو کیا دیتا ہے

اُس میں یہ وصف بھی ہے، اُس میں ہے یہ خوبی بھی
کوئی بھی بات ہو وہ اس کو ہوا دیتا ہے

عرشؔ گُزرے ہوئے لمحات کی یادیں ہوں گی
دل کے دروازے پر یہ کون صدا دیتا ہے

☆

ایک سوال

گلی کے موڑ پر اِک ریشمی چادر کے ٹکڑے میں
پڑا ہے ایک نوزائیدہ بچّہ ساکن و ساکت
عجب انداز سے کتنے ہی رَہ رَو دیکھ کر اس کو
گزر جاتے ہیں جیسے ان کو فرصت نہیں کوئی
کہ یہ دم بھر کو ٹھہریں اور پوچھیں ماجرا کیا ہے!
گماں ہوتا ہے جیسے یہ بھی اس سازش میں شامل ہیں
کہیں تو کیا کہیں آخر، یہ کس کے پاپ کا پھل ہے
نہ جانے کون سی مَریم کسی شیطان کے ہاتھوں
کٹی کچھ اس طرح جیسے کوئی طوفان گھر آئے
بہا لے جائے اپنے ساتھ کتنی بستیاں لیکن
کسی کو یہ خبر تک بھی نہ ہو کچھ حادثہ گزرا
ادھر کچھ لوگ شغلاً رُک گئے ہیں میرے پاس آکر
کسی کے لب پہ یہ فقرہ ''محبت کی نشانی ہے''
کوئی یہ طنز کرتا ہے ''نئی تہذیب ہے صاحب''

کوئی کہتا ہے اک دوشیزہ نے غربت سے تنگ آکر
فقط دو روٹیوں کے واسطے عصمت کو بیچا ہے
یہ سب کچھ ٹھیک ہے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
محبت شدتِ جذبات میں بہہ کر بھٹک جائے
فسانہ مختصر یہ جتنے منہ اتنی ہی باتیں ہیں
مگر اک بات میرے ذہن پر اب تک مسلط ہے
مرے دل میں اُبھرتا ہے یہ رہ رہ کر سوال آخر
کہ ہم میں کون ہے ایسا جو اس بچے کو اپنائے؟

☆ شیرازہ اردو اور ہمارا ادب میں اشاعت کے لئے اپنی نِگارشات صاف صاف اور کاغذ کے ایک ہی طرف لکھ کر ارسال کریں۔تبدیلی پتہ یا فون نمبر بدلنے کی صورت میں ہمیں مطلع کرنا نہ بھولیں۔ (ادارہ)

وراثت

وہ منزل اور منزل کی حسیں پگڈنڈیاں جن پر
بکھرتے تھے ہزاروں قہقہے نظموں کی صورت میں
فضائیں رقص کرتی تھیں، ہوائیں گنگناتی تھیں
تمنائیں دلوں میں رنگ بھرتی تھیں محبت کا
ہوا کے نرم جھونکے آرزو کو گنگناتے تھے
یقیں ہوتا تھا اکثر دل کوہم جنت کے باسی ہیں
حسیں پگڈنڈیاں جن پر ہزاروں راہ رَو اکثر
بڑے اُونچے سُروں میں گیت گاتے تھے محبت کے
کبھی پُرکیف سے نغمے، کبھی دل سوز سی نظمیں
وفاؤں میں عجب انداز سے جادو جگاتی تھیں
حقیقت میں دلوں کو کس قدر تسکین ملتی تھی
عروسِ زندگی سَو رنگ سے اکثر سنورتی تھی
حیات افروز تھا ماحول وہ یہ بات کل کی ہے
وہ کل جو اپنے دامن کو بچا کر کٹ گیا ہم سے
وہی پگڈنڈیاں ویران ہیں، سنسان ہیں ایسے
کہ آثارِ قدیمہ میں ہیں شامل رونقیں ان کی
کہاں زخموں کی وہ بارش، کہاں جذبات کی ندیاں
جمودِ مستقل چھایا ہوا ہے آج ہر جانب

نہیں حرکت کسی بھی چیز میں یہ کیا عالم ہے
مگر یہ کیا ہوا، کیوں کر ہوا، کس سے کوئی پوچھے
سوال ایسا ہے کوئی بھی نہیں دیتا جواب اس کا
شکاروں کی قطاریں کیا ہوئیں یہ کون بتلائے
کہاں ہے رقص ان کا اب، کہاں ہیں ان کے ہنگامے
کوئی ہلچل نہیں ہے جھیل ڈل کے نرم سینے پر
فضا خاموش ہے، کیسا سکوتِ بیکراں ٹھہرا
کناروں تک نہیں آتیں کبھی اب جھیل کی لہریں
خود اپنے آپ میں گم سُم سی ہیں کچھ کھوئی کھوئی سی
کوئی چھیڑے اگر ان کو کئی نغمے بکھر جائیں
مگر اب کون چھیڑے، کون ان کو دیکھنے آئے
کہاں ہیں لوگ اب جو قدرداں تھے ان کے موسم کے
کسے الزام دیں ہم کس کو ذمہ دار ٹھہرائیں
یہ کس نے چھین لی ہے زندگی کی ہر خوشی ہم سے
اُجڑ کر رہ گیا ہے کس کی نادانی سے نگر اپنا
عجب بے رہ روی ہے، ہر طرف یلغار جیسی ہے
نہیں ہے ہوش اتنا بھی کہ ٹھنڈے دل سے ہم سوچیں
گھروں کے آنگنوں میں ہم نے کیا پودے لگائے ہیں
نہیں ہیں پھول جن میں تیز تر کانٹے ہیں نفرت کے
بدن کو چھیلتے ہیں، آگ بھر دیتے ہیں زخموں میں
نہیں ہے چین حاصل، دل میں یکسر بے قراری ہے
نہیں معلوم ہم کو کیا ہے اچھا کیا بُرا آخر

بہیں گے اور ہم اس میں رَو میں کہاں تک فیصلہ کرلیں
گلستاں بھی ہے اپنا اس کا ہر اک پھول ہے اپنا
کوئی بھی رنگ ہو اس کا، کوئی بھی اس کی خوشبو ہو
گلستاں جب سلامت ہے، سلامت پھول بھی اس کے
سلامت رنگ بھی ان کا، سلامت ان کی خوشبو بھی
نہیں ممکن اُجڑ جائے کسی صورت گلستاں یہ
ہماری آرزوؤں اور اُمیدوں کا مسکن ہے
کہ ہم نے خونِ دل سے گلستاں کی آبیاری کی
کہ اس کا رنگ اپنے خون سے قائم ہے خوشبو بھی
اگر مٹ جائیں ہم اس کو کبھی مٹنے نہیں دیں گے
یہی ہے فیصلہ اپنا، رہیں گے اس پہ ہم قائم
ہوا جو کچھ بھی ماضی میں بھُلا دیں تلخیاں اُس کی
سبھی اہلِ وطن ہیں، ہم لگالیں سب کو سینے سے
سبھی اپنے ہیں، سب سے زندگی بھر کا ہے اک رشتہ
جُدا ہوتا نہیں ہے ماس چاہو لاکھ ناخن سے
مذاہب جس قدر بھی ہوں، ہے لازم احترام اُن کا
سبھی انسان ہیں، انسانیت کا ہے مقام اُونچا
ہزاروں آندھیاں آئیں، کئی طوفان بھی اُٹھیں
یہ شمع بجھ نہیں سکتی، یہ عظمت لٹ نہیں سکتی
یہی عظمت بزرگوں سے ملی ہم کو وراثت میں
وراثت اک امانت ہے، امانت ہی رہے گی یہ
امانت میں کسی صورت خیانت ہو نہیں سکتی

احساس

تُو نے پوچھا ہے مرے خاموش رہنے کا سبب
تو ابھی شاید مرے حالات سے واقف نہیں
مجھ کو جس ماحول سے ہے واسطہ شام وسحر
تو ابھی اُس کی کسی بھی بات سے واقف نہیں

بے بسی، افسردگی، بے چارگی، اُفتادگی
ظلمتوں کے درمیاں رہ کر بھی تابندہ ہوں میں
ہیں مرے پیشِ نظر نظارہ ہائے دِل شکن
میری ہمت ہے کہ اِن حالات میں زندہ ہوں میں

تُو مری مجبوریاں ہرگز سمجھ سکتی نہیں
ناروا کو بھی روا کہنا پڑے تو کیا کروں
کاش! سمجھا دے مجھے کوئی فقط اتنی سی بات
آدمی کو جب خُدا کہنا پڑے تو کیا کروں

بس غم و فکر ہی میں غرق رہنا صُبح و شام
یہ اگر ہے زندگی تو زندگی اِک جُرم ہے
سوچتا ہوں کیوں نہ کرلوں ارتکابِ خودکشی
پھر خیال آتا ہے دِل میں خودکشی اِک جرم ہے

اَب اسی احساس سے قائم ہے میرا حوصلہ
مضمحل رہنا غمِ دل کا مداوا تو نہیں
دَرد میں آرام کی صورت بھی پنہاں ہے ضرور
زیست کا حاصل فقط خونِ تمنا تو نہیں

☆

سُقراط

میں ہوں اِس دور کا سُقراط مجھے قتل کرو
زہر کا کوئی اثر مجھ پہ نہیں ہوسکتا
رنج اُٹھاتا ہوں میں اظہارِ حقیقت کے لئے
میرے سینے میں ہیں رِستے ہوئے زخموں کے نشاں
زخم بھی ہو کہ جنہیں دیکھ کے صرف ایک نظر
دِل کا مذکور ہی کیا، روح لرز جاتی ہے
میرے احساس پہ ہیں غم کی خراشیں کتنی
میری گُفتار پہ ہیں ضبط کے پہرے کتنے
میرے ماحول کی ہیں دین، یہ نادر تحفے
مہرباں مجھ پہ عجب رنگ سے ہے میرا سماج
لیکن اس پر بھی جو کہتا ہے مجھے میرا ضمیر
بے دھڑک ہو کے سَرِ بزم وہ کہہ دیتا ہوں
جانتا ہوں کہ سزا اس کی کڑی ہوتی ہے
کم سے کم اس میں دل و جاں کا زیاں ہوتا ہے

اپنی فطرت سے مگر بے بس و مجبور ہوں میں
غیر ممکن ہے کہ حق گوئی سے ہو مجھ کو گُریز
ہم نوا جب کوئی ملتا نہیں دُنیا میں مجھے
بے طرح ایسے میں ڈستا ہے مجھے میرا شعور
مصلحت چیز ہے کیا اور خوشامد کیا ہے
ایسے الفاظ کا مفہوم نہیں مجھ پر عیاں
ایسے رستوں سے کبھی ہوتا نہیں میرا گزر
منزلِ دار و رسن ہے مجھے مرغوب بہت
ہم سفر اور کوئی اس میں کہاں ملتا ہے
لطف دے جاتی ہے کچھ تنہا خرامی مجھ کو
میری آنکھوں میں عجب نشہ، عجب عالم ہے
میری رگ رگ میں ہے زہرابِ الم کی مستی
میں ترس جاتا ہوں اے کاش کوئی مجھ کو ملے
دبے الفاظ میں اِس بات کی تصدیق کرے
آج کے دور میں نایاب نہیں حق گوئی!
آج کے دور کا سُقراط ابھی زندہ ہے

☆

کھو کھلے جسم، بے تاب رُوحیں

موت کی راہ کے راہی ہیں یہ کینسر کے مریض
اپنے تابوت لئے کب سے ہیں بستر پہ دراز
اِن کے دل میں کسی فردا کا تصوّر ہی نہیں
اِن کے چہروں سے عیاں صبحِ خزاں کی زردی
اِن کی آنکھوں سے نمایاں ہے اُداسی کا سماں
ان کے جذبات ہیں یا برف ہے کُہساروں پر
لاکھ سورج کی تپش ہو جو پگھلتی ہی نہیں

اپنے ماضی میں ہیں یہ کھوئے ہوئے شام و سحر
ہائے وہ وقت کہ دل میں تھا اُمنگوں کا ہجوم
ایک دُنیا تھی کہ جس کا نہ تھا کوئی ثانی
ایک محفل تھی کہ ہر وقت سجی رہتی تھی
کتنی خوش رنگ بہاریں تھیں چمن کی زینت
کتنے گُل پوش نظارے تھے نظر کا مرکز
دل محبت سے تھا سرشار ابھی کل کی ہے بات

دیکھتے دیکھتے مسمار ہوئے رنگ محل
وقت بھی کتنا ستم گر ہے گزر جاتا ہے
قافلہ وقت کا رُکتا نہیں روکے سے کبھی
سلسلہ روزِ ازل سے یہ چلا آتا ہے
اب یہ ماحول ہے جس میں نہیں حرکت کوئی
ہر طرف عالمِ وحشت ہے جدھر بھی دیکھو
منتظر موت کا ہر کوئی نظر آتا ہے
کھوکھلے جسم ہیں جو کرب میں ہیں ڈوبے ہوئے
اور بے تاب ہیں روحیں کہ مِلے ان کو نجات
کاٹے کٹتے ہی نہیں قید کے لمحاتِ حزیں
تلخ ہے زہر مگر پھر بھی پیئے جاتے ہیں
نا اُمیدی میں بھی یہ لوگ جیئے جاتے ہیں

☆

تجدیدِ محبت

باعثِ تسکیں ہے تجدیدِ محبت کا پیام
کیا کروں اس پیشکش کو میں بہت معذور ہوں
تو اُدھر اپنے دلِ مضطر کے ہاتھوں بے قرار
میں اِدھر بے مہریٔ ایام سے مجبور ہوں

تیرے دل کا جو بھی عالم ہے وہ مجھ پر ہے عیاں
تو کسی غم کو چھپا کر بھی چھپا سکتی نہیں
جانتا ہوں میں کہ تُو اس دل شکن ماحول میں
خون رو سکتی ہے لیکن مُسکرا سکتی نہیں

تیرے چہرے سے نمایاں ہے ترے دل کی کسک
تیری آنکھوں میں ہیں رنج و درد کی پرچھائیاں
زندگی اک چوٹ بھی ہے، زخم بھی ہے، گھاؤ بھی
کون سمجھے گا مگر دُنیا میں یہ گہرائیاں

میرا فن، میری محبت اور میری شاعری

گردشِ رنج و مصائب دور کر سکتے نہیں

ایسی تجدیدِ محبت سے ہے پھر کیا فائدہ

جب مرے اشعار تیرا پیٹ بھر سکتے نہیں

زندگی کی کشمکش میں، یاس کے طوفان میں!

تیری کشتی جس کی طالب ہے میں وہ ساحل نہیں

آج تجھ پر کر رہا ہوں یہ حقیقت آشکار

میں فقط اک جادۂ پُر خار ہوں، منزل نہیں

☆

☆ اپنی نِگارشات صاف صاف اور کاغذ کے ایک ہی طرف لکھیں۔ تبدیلی پتہ یا فون نمبر بدلنے کی صورت میں ہمیں مطلع کرنا نہ بھولیں۔ (ادارہ)

☆☆☆

اے میرے وطن! میرے حسیں خواب کی تعبیر

مر مٹنے کی رنگین ادا لے کے اُٹھے ہیں
دیوانے ترے عزم نیا لے کے اٹھے ہیں
اِک ہاتھ میں پرچم ہے تو اِک ہاتھ میں شمشیر
اے میرے وطن! میرے حسیں خواب کی تعبیر

آزاد ہے تُو اور اب آزاد رہے گا
ہر حال میں، ہر رنگ میں دِل شاد رہے گا
پڑسکتی نہیں پاؤں میں تیرے کوئی زنجیر
اے میرے وطن! میرے حسیں خواب کی تعبیر

شمشیر بکف بر سرِ پیکار کھڑا ہے
ہر شخص کفن باندھ کے تیار کھڑا ہے
ہے رشک کے قابل تری یہ خوبیٔ تقدیر
اے میرے وطن! میرے حسیں خواب کی تعبیر

تُو میرا چمن ہے، یہ مجھے ناز ہے تجھ پر
تُو میرا وطن ہے، یہ مجھے ناز ہے تجھ پر
معلوم ہے مجھ کو تری مٹی بھی ہے اکسیر
اے میرے وطن! میرے حسیں خواب کی تعبیر

ہر خانۂ بے رنگ میں سو رنگ بھروں گا
میں تیرے لئے جان بھی قربان کروں گا
ہر لحظہ نکھرتی ہی رہے گی تری تصویر
اے میرے وطن! میرے حسیں خواب کی تعبیر

یہ کس نے کہا لڑنے کی طاقت نہیں مجھ میں
تیرے لئے کٹ مرنے کی جرأت نہیں مجھ میں
دیکھی ہے عدُو نے میری چلتی ہوئی شمشیر
اے میرے وطن! میرے حسیں خواب کی تعبیر

جو آنکھ تری سمت اُٹھے پھوڑ کے رکھ دوں
مغرور سَر ہو میں اُسے توڑ کے رکھ دوں
قربان تری آن پر اک شاعرِ کشمیر
اے میرے وطن! میرے حسیں خواب کی تعبیر

☆

یہ جھونپڑے یہ لوگ

یہ جھونپڑے بھی عجب ہیں کہ جن میں شام وسحر
خوشی کا ذکر نہیں، راحتوں کا نام نہیں
بڑا کثیف اندھیرا ہے ان کی قسمت میں
کوئی بھی دن نہیں ایسا جو مثلِ شام نہیں

یہ بے بسی، یہ نحوست، یہ یاسیت کہ یہاں
عروسِ سَر خوشی آتے ہوئے جھجکتی ہے
عجب گھٹن ہے، عجب زہر ہے فضاؤں میں
حیات اپنے مُقدّر پہ ہاتھ ملتی ہے

قریب و دُور ہے پھیلا ہوا اجل کا سکوت
نگاہ جس طرف اُٹھتی ہے غم کے سائے ہیں
یہ حادثہ بھی ہوا ہے یہاں بسا اوقات
کہ گفتگو کے لئے ہونٹ کپکپائے ہیں

یہ رینگتے ہوئے تاریک جھونپڑوں کے مکیں
یہاں کے لوگ ہیں یا چلتی پھرتی لاشیں ہیں
ہر ایک دل پہ کئی زخم ہیں تمنّا کے
ہر ایک رُوح پہ غم کی کئی خراشیں ہیں

ہیں دل شکستہ بہت وقت کے مظالم سے
مگر یہ صابر و شاکر ہیں فاقہ مستی میں
کہاں سے لائے کوئی ان کے حوصلے کا جواب
گلہ زباں پہ نہیں کوئی تنگ دستی میں

مگر کبھی کبھی اِک برق کوند جاتی ہے
فضا میں چار سُو ہوتی ہے کوئی سرگوشی
پگھلنے لگتا ہے ماحول اک حرارت سے
لرزنے لگتی ہے روزِ ازل کی خاموشی

کہیں کہیں کوئی آوازِ حق اُبھرتی ہے
کہیں کہیں کوئی مَدھم چراغ جلتا ہے
مری نگاہ میں یہ جھونپڑے عظیم ہیں عرشؔ
یہ وہ جگہ ہے جہاں انقلاب پلتا ہے

☆

دوہے

اِک پَل میں مٹ جائے گا، ریت کی ہے وہ لکیر
دُنیا میں جس شخص کا، کوئی نہیں ضمیر

ایسا ہے ہر سانس کی، بدل گئی تاثیر
مُدّت میں ہم پر کھُلا، غم بھی ہے اکسیر

کتنی قومیں ہیں یہاں، فرقے اُس پہ انیک
حیرت ہے اس بات پر، لہو کا رنگ ہے ایک

اِک جیسے رہتے نہیں، دُنیا کے حالات
قدرت کا یہ اصول ہے، دن کے بعد ہے رات

مان لیا ہم کو مِلا، اُجڑا ہوا نصیب
ہم فنکار مگر پھر بھی، دِل کے نہیں غریب

اندر سے ہیں بھیڑیئے، باہر سے ہیں مور
اعلیٰ عہدوں پر یہاں، فائز رشوت خور

یہ کیسا انداز ہے، یہ کیسا دستور
جِس کو چاہا ٹوٹ کر، ہوا اور بھی دور

یاد آئے ہر بات وہ، گیا ہوں جو میں بھول
جب بھی کسی کتاب میں، دیکھوں سوکھے پھول

وصل کی ٹھنڈی چاندنی، ہجر کی جلتی آگ
جیون کے اِس ساز میں، شامل کیا کیا راگ

پھیلیں ہر اِک گام پر، جب غربت کے سائے
روٹی کی خاطر یہاں، عصمت بھی بِک جائے

اِس پر بھی خاموش ہوں، جانتا ہوں یہ بھید
ہر دِل میں اِک زخم ہے، ہر دِل میں اِک چھید

سوچ رہا ہے کاش کٹے، سانسوں کی زنجیر
اِس مفلس کے خواب کیا، کیا اُن کی تعبیر

●

دِل میں کتنی ظلمتیں، چہرے پر ہے نور
ایسے میں راس آئے گا، کیا دورِ جمہور

●

آخر تجھے مٹائے گی، اِک دن تری اَنا
ساتھ بہا لے جائے گا، آگ کا یہ دریا

●

دِل میں کوئی آرزو، اور نہ کوئی آس
نظروں میں ہیں دور تک، اِک صحرائے یاس

●

آج کی یہ تہذیب ہے، اِک بھدّا سا داغ
جیسے مرگھٹ پر کوئی، بُجھتا ہوا چراغ

●

اِنساں کی یہ زِندگی، ایک شِکستہ ناؤ
دیکھیں لے جائے کہاں، وقت کا تیز بہاؤ

●

کیوں اتنی سی بات پر، دِل کو کریں اُداس
ہم منزل سے دور ہیں، وہ منزل کے پاس

●

کون ہے دُنیا میں بڑا، کس کی چھوٹی ذات
سب کی اپنی اہمیت، کیا کانٹے، کیا پات

●

کاش کبھی وہ بھیجتے، رسماً کوئی سلام
ہم اتنی سی بات پر، بِک جاتے بے دام

●

سچ تو یہ ہے آپ کی، ملتی نہیں نظیر
جتنا اونچا نام ہے، اتنے کام حقیر

●

بارش سے محروم ہو، جیسے سوکھا کھیت
وہ دریا کی موج ہے، میں صحرا کی ریت

●

ہونٹوں پر افسردگی، ہر چہرہ بے نور
جس کو کہیئے زندگی، وہ ہے کوسوں دور

●

کس درجہ اُلجھا گئے، دُنیا کے حالات
اتنی فرصت ہی کہاں، خود سے بھی ہو بات

●

ٹیڑھے جو بھی کام ہوں، اُن سے رہیئے دور
کہیں نہ یہ کہنا پڑے، کھٹے ہیں انگور

●

یہاں تو اِنساں کا کوئی، چلتا نہیں ہے زور
کب ٹوٹے کچھ پتہ نہیں، سانسوں کی یہ ڈور

●

بویا جو بھی بیج ہو، پھوٹے گا وہ ضرور
گھڑا ابھرا جب پاپ کا، ٹوٹے گا وہ ضرور

●

مکاری، دھوکہ دہی، اس کا کاروبار
دُنیا گرگٹ کی طرح، بدلے رنگِ ہزار

●

اِن پر جو بھی ظلم ہو، یہ سمجھیں سنجوگ
کہاں ملیں گے گاؤں کے، سیدھے سادھے لوگ

●

جھوٹے ہیں پیمان سب، جھوٹے سب کے قول
راس نہ ہم کو آسکا، اِسی لئے ماحول

●

سمجھ میں آئیں گے کہاں، دُنیا کے یہ طور
اندر سے کچھ اور ہیں، باہر سے کچھ اور

●

دِل کی قیمت کیا کہیں، یہ ہیرا انمول
اس کے لئے درکار ہیں، پیار کے بس دو بول

●

قدم قدم پر آدمی، بدلے کیا کیا بھیس
جب پہچانا جائے یہ، دِل کو پہنچے ٹھیس

●

ساحل سے سر پھوڑتا، لاتا نہیں جو تاب
طوفاں کس کو ڈھونڈتا، آخر زیرِ آب

●

نردھن کنیا رو پڑی، یہ کیسا وردان
جن سے ہیں بیاہی گئی، وہ ہیں پتا سمان

●

دِل صحرائے بے کراں، کوئی نہیں اُمنگ
اِس میں کتنے رنگ ہوں، پھر بھی ہے بے رنگ

●

سات سمندر پار سے، جب وہ دے آواز
کیا کیا نغمے چھیڑ دے، ٹوٹے دل کا ساز

●

ایک ذرّا سی ٹھیس سے، ہو جائے مسمار
کہنے کو مضبوط ہے، رشتوں کی دیوار

●

کیا ابھرے گرداب سے، کیا پہنچے وہ پار
قسمت سے جس ناؤ کی، ٹوٹی ہو پتوار

●

کرتی ہے ہر حال میں، موت سے دو دو ہات
آخر میں یہ زندگی، کھا جاتی ہے مات

●

جہاں میں دانا کون ہے، کون یہاں نادان
سب پہچانے جائیں گے، تُو خود کو پہچان

●

اِس میں تیرتھ ہیں سبھی، اِس میں چاروں دھام
ہر نردھن بے آس کی، سیوا کر نِشکام

●

ریزہ ریزہ کر گئے، اُن نینوں کے بان
پھر بھی کوئی زخم ہے، اور نہ کوئی نِشان

●

دِل میں جتنے زخم ہیں، بہتر ہے نہ کُرید
اِن زخموں میں بند ہیں، آپس کے سو بھید

●

سُکھ کے دِن دیکھے اگر، اَب دُکھ کو بھی جھیل
دونوں پر ہے منحصر، اِس جیون کا کھیل

●

ہم راحت کے لمحوں کو کرتے کہاں تلاش
اِس دل پر چھایا رہا اکثر غمِ معاش

●

عجب گھٹن ماحول میں، ذہن و نظر علیل
سوچ رہا ہوں جینے کی نکلے کوئی سبیل

●

اِس میں کیا مِل جائے گا، سوجھ بوجھ کا باب
اِک اَن پڑھ کی زندگی، جیسے بند کتاب

●

آنکھیں ہیں گو کھلی ہوئی، گہری نیندیں سوئے
پھولوں کی ہے آرزو، گو کانٹے ہیں بوئے

●

کِس درجہ دشوار تھی، جینے کی ہر راہ
پھر بھی تجھ سے زندگی، ہم نے کیا نِباہ

●

کل تھے رونق بزم کی، آج ہے اُن کا سوگ
عرشؔ یہ کس سے پوچھئے، کہاں گئے وہ لوگ

●

گِلہ نہیں وہ اگر کرے آنے میں تاخیر
جو دل کو پہنا گیا وعدوں کی زنجیر

●

دل حیراں ہے دیکھ کے دُنیا کے یہ رنگ
ہوا میں ڈانواڈول ہے جیسے کوئی پتنگ

●

دل میں کتنی خواہشیں سب کا اپنا رنگ
دیکھئے کب تک ختم ہو اندر کی یہ جنگ

●

بات بڑی دلچسپ ہے، بے شک ہے یہ عجیب
غربت ہے قائم وہی، مٹے ہیں صرف غریب

●

اپنی یہ پہچان ہے اِتنی سی ہے دلیل
میں اُس میں تحلیل ہوں، وہ مجھ میں تحلیل

●

کہیں پہ کانٹے پھول ہیں، کہیں پہ چھاؤں دھوپ
کہنے کو وہ ایک ہے لیکن کتنے روپ

●

آس لگائے بیٹھے ہیں مجھ سے کئی فقیر
کِس کِس میں تقسیم ہو غم کی یہ جاگیر

☆☆☆

یاد

زندگی آج یہ کس موڑ پہ لے آئی ہے
دِل میں اَب تیری محبت کا تلاطم بھی نہیں
لَبِ اَفسردہ پہ اِک موجِ تبسّم بھی نہیں
اِک مری ذات ہے یا عالم تنہائی ہے

چاند نِکلا ہے مگر چاندنی مغموم سی ہے
کتنے رنگیں نظارے ہیں مگر کچھ بھی نہیں
مست موسم کے اشارے ہیں مگر کچھ بھی نہیں
دل پریشان سا ہے زندگی مغموم سی ہے

تیری محفل سے بہت دور نِکل آیا ہوں
اب پلٹ جاؤں یہاں سے، کوئی امکان نہیں
دل کو آرام میسّر ہو یہ آسان نہیں
ایک طوفان حوادث کا اُٹھا لایا ہوں

کوئی عالم ہو مگر یاد تری آئے گی
دل کو ہر حال میں ہر رنگ میں تڑپائے گی

☆

دِل

دل ہے یا شہرِ خموشاں کا شکستہ سا مزار
دفن جس میں ہیں محبت بھرے ارمان کئی
جس سے لپٹے ہوئے ہیں حشر کے سامان کئی
اب تو اِس بستی کی ہر چیز ہے اُڑتا سا غُبار

کتنے ہنگاموں کا مرکز یہ ہوا کرتا تھا
کتنے ارمان پلا کرتے تھے اس محفل میں
کتنے طوفان پلا کرتے تھے اس محفل میں
اِک ستم گر کی محبت کا یہ دَم بھرتا تھا

اُلفت و شوق کے رنگین فسانے نہ رہے
اب تو ہر چیز پر اک مُردہ دلی چھائی ہے
محفلِ زیست میں ویرانی و تنہائی ہے
وہ محبت نہ رہی، اب وہ زمانے نہ رہے

پھر بھی دل ہے کہ غم و درد سے بھر آتا ہے
جب بھی لبریز ہو پیمانہ چھلک جاتا ہے

☆

قطعات

●

بے نواؤں کو، بے سہاروں کو
چاک زخمِ جگر کے سینے دو
یہ تقاضا ہے آدمیت کا
خود جیو، دوسروں کو جینے دو

●

کُہنہ رسم و رواج کے پہرے
ہر قدم ساتھ ساتھ رہتے ہیں
قتل گاہِ حیات ہے اے عرشؔ
لوگ جس کو سماج کہتے ہیں

●

اتفاقاً اگر کوئی کم ظرف
بر سَرِ اقتدار آتا ہے
اختیارات کے نشے میں وہ
اپنی اوقات بھول جاتا ہے

●

صحبتِ گُل میں رہ کے بھی ہَر دم
فطرتِ خار و خس نہیں جاتی
دولتِ بے شمار پاکر بھی
آدمی کی ہوس نہیں جاتی

●

زندگی میں مجھے فقط اک بار
زندگی کا سُراغ پانے دے
اے سراپا بہار و رعنائی
اپنی آنکھوں میں ڈوب جانے دے

☆

●

جادۂ زندگی حسیں تھا بہت
پُر کشش تھا نظارۂ دُنیا!

ہم مگر بدگُماں سے گزرے ہیں
پھر بھی دامن کشاں سے گزرے ہیں

●

ہم کلامی تو دور کی ہے بات
آپ آئے نہ حسبِ وعدہ جب

دید کو بھی ترس گئیں آنکھیں
ابر بن کر برس گئیں آنکھیں

●

آپ اس کی نہ اتنی فِکر کریں
ہم تو مستِ رضا ہیں بندہ نواز

خوب ہے اپنا حال، جیسا ہے
آپ کہیئے مزاج کیسا ہے؟

●

زندگی کا کمال تو دیکھو
اِس سے بڑھ کر ہو کیا فراخ دِلی

غم میں بھی یہ خوشی سی پاتی ہے
موت کو بھی گلے لگاتی ہے

●

کچھ نہ کچھ مشغلہ ضروری ہے
لُطف کرنا اگر نہیں منظور

جس سے ہم اپنے دل کو بہلائیں
آپ مشقِ ستم ہی فرمائیں

●

مجھ سے اُمید سجدہ ریزی کی؟
میں کبھی مصلحت پرست نہ تھا

اے زمانے میں اتنا بست نہیں
میں کبھی مصلحت پرست نہیں

●

اُن کی برہم نگاہ کیا کہیئے
ہائے وہ عالمِ قیامت خیز

بات بنتی ہوئی بگڑتی ہے
جب اُمیدوں پہ اوس پڑتی ہے

☆

●

جس کو سمجھا ہے تو سبیلِ نجات
خود کُشی سے گریز کر ناداں

یہ تو بربادیوں کا جادہ ہے
خود کُشی جُرمِ با ارادہ ہے

●

کیا ہو تعریفِ حضرتِ واعظ
آپ جس انجمن میں جا بیٹھے

نفرت و انتشار چھوڑ گئے
کچھ نہ کچھ یادگار چھوڑ گئے

●

جام کے پاش پاش ہونے سے
موت کی اِک ذرا سی ٹھوکر سے

ربطِ کیف و سُرور ٹوٹ گیا
زندگی کا غرور ٹوٹ گیا

●

اِس طرح ہو چکے ہیں اب تحلیل
جس طرح اک چتا کے بجھنے پر

آرزوؤں میں یاس کے سائے
راکھ اُڑ کر ہوا میں مِل جائے

●

دیکھئے جو ہماری تخلیقات
حق کی جو پوچھیئے تو ہم فنکار

مثلِ نقشِ بہار ہیں گویا
چلتے پھرتے مزار ہیں گویا

●

ہو گئی یہ فضاؤں میں تحلیل
ہم نے پوچھا جو حالِ دل اُن سے
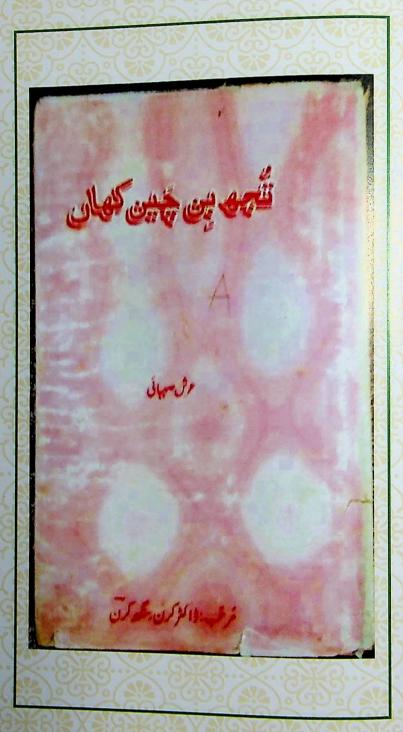
بات کو اِس طرح اُچھال گئے
مُسکرائے وہ اور ٹال گئے

●

جو ہیں ظُلمت پرست دُنیا میں
اک طوائف تمام دن جیسے

زندگی اُن کی یوں گزرتی ہے
رات کا انتظار کرتی ہے

☆☆☆

تُھہ پِن چھین کہان
عرش صہبائی
مرتب: ڈاکٹر کرن محمد کرن

عرش صہبائی
مُرتب : مالک سنگھ وفا

جواز
عرش صہبائی

شبنم تیری یادوں کی
عرش صہبائی

عرشؔ صہبائی

آگہی
شعری مجموعہ
عرش صہبائی

نایاب
عرش صہبائی

عرشؔ صہبائی - ایک یادگار تصویر

عرشؔ صہبائی - اپنی شریکِ حیات کے ساتھ

عرشؔ صہبائی - ایک انداز

عرشؔ صہبائی - نعتیہ مشاعرے میں اپنا کلام پیش کرتے ہوئے

عرشؔ صہبائی - حُسینی مشاعرے کی صدارت کرتے ہوئے

امین بانہالی، بشیر بھدرواہی، عرشؔ صہبائی، پروفیسر ظہور الدین اور دیگر مہمانان
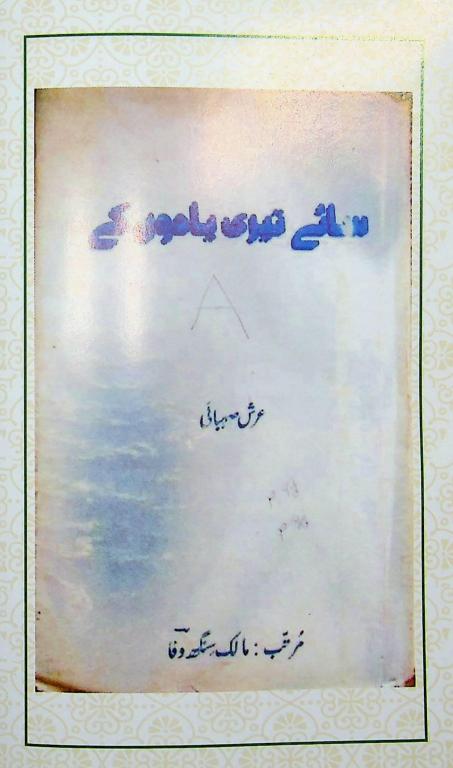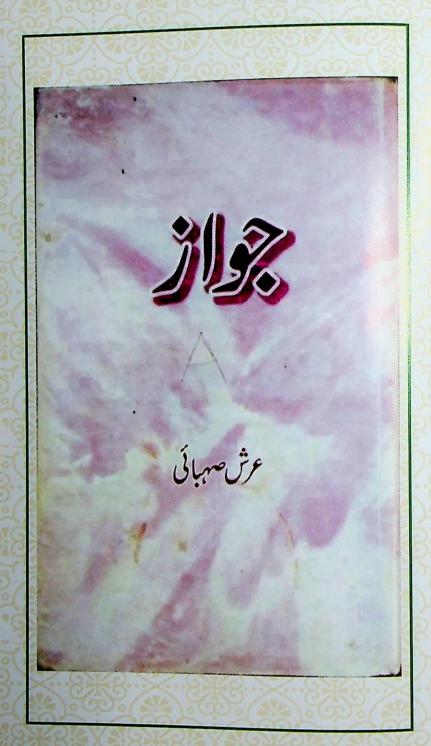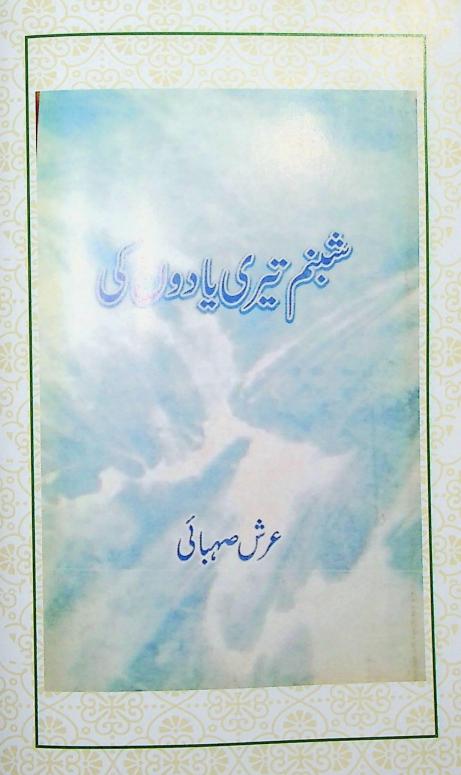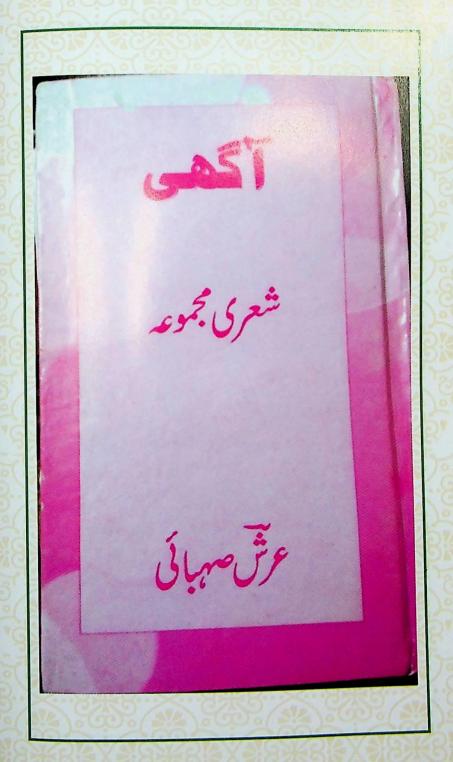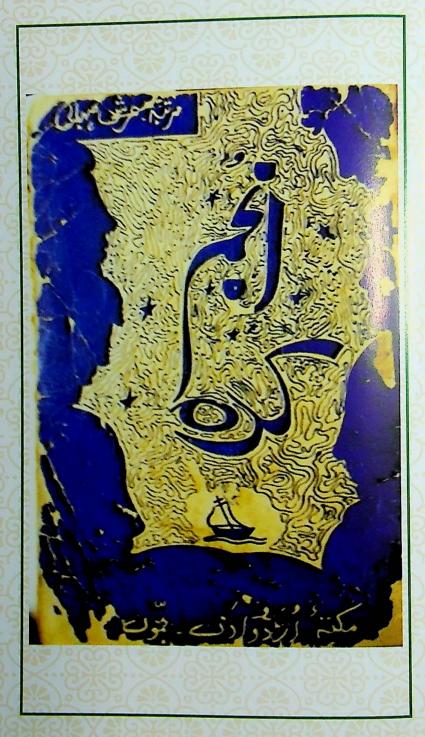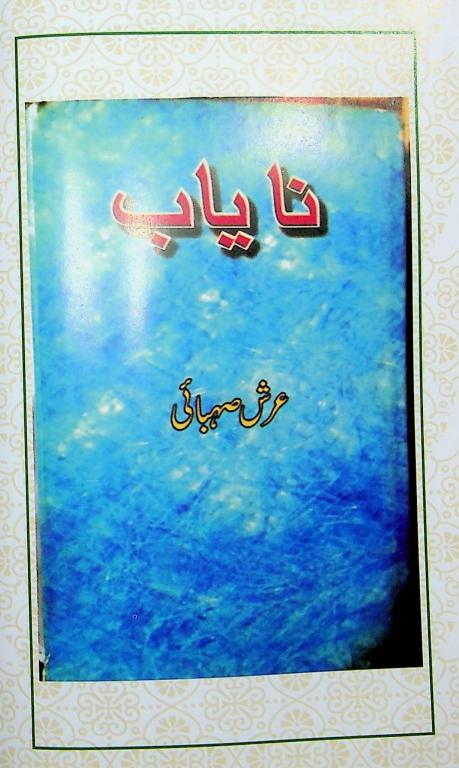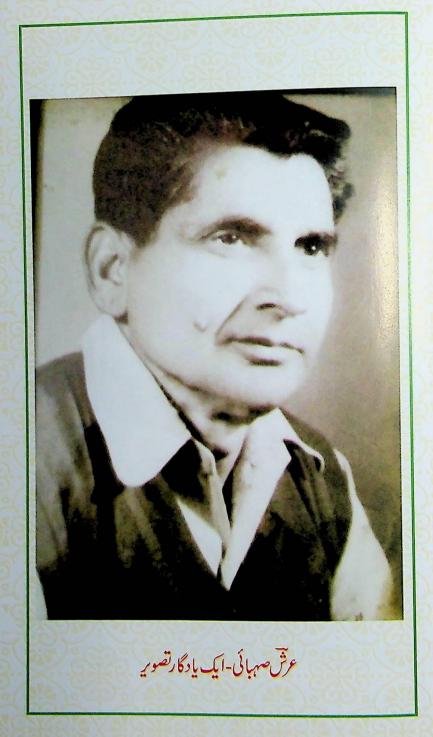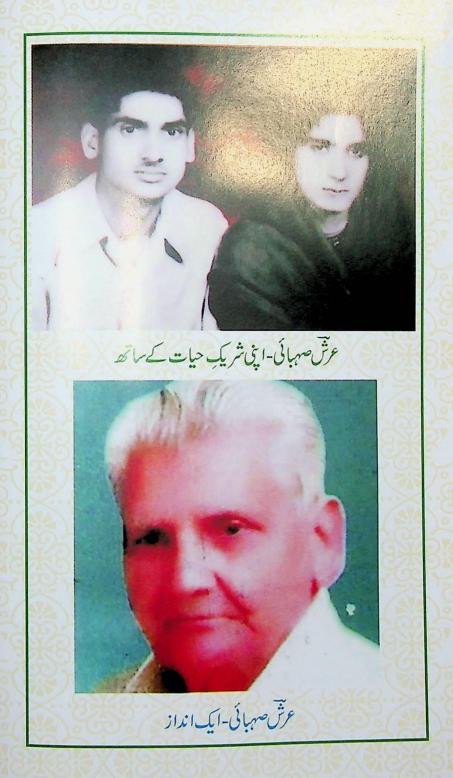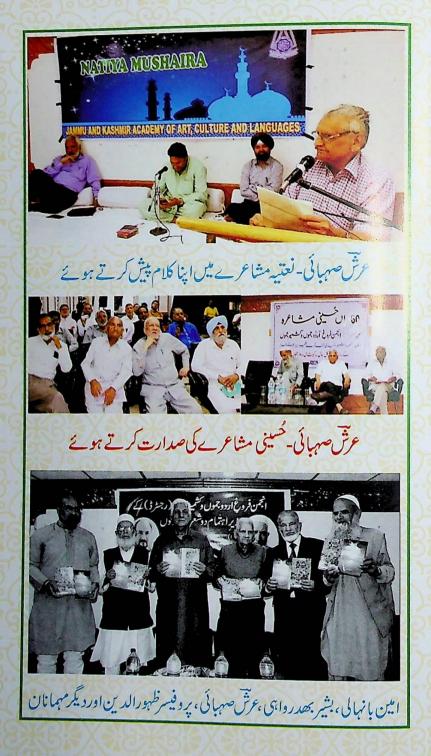
عرشؔ صہبائی، سیکریٹری اکیڈیمی ڈاکٹر عزیز حاجنی اور دیگر مہمان۔
کے ایل سہگل ہال میں منعقدہ ایک تقریب میں
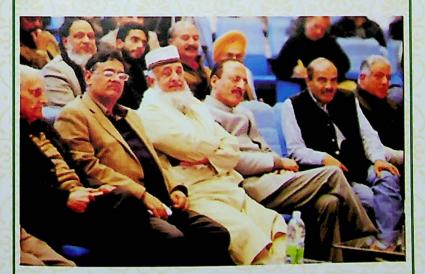
عرشؔ صہبائی، اوم ودیارتھی، جہانگیر میر، عبدالحق خان اور دیگر مہمان

عرشؔ صہبائی- کلام پیش کرنے کا انداز

عرشؔ صہبائی- جموں یونیورسٹی کے ایک مشاعرے میں

محمد اقبال لون، عرشؔ صہبائی اور محمد سلیم سالک (مدیر شیرازہ)

پرتپال سنگھ بے تاب، ڈاکٹر اصغر سامون، محمد فاروق نازکی، عرش صہبائی اور

پروفیسر محمد اسد اللہ وانی
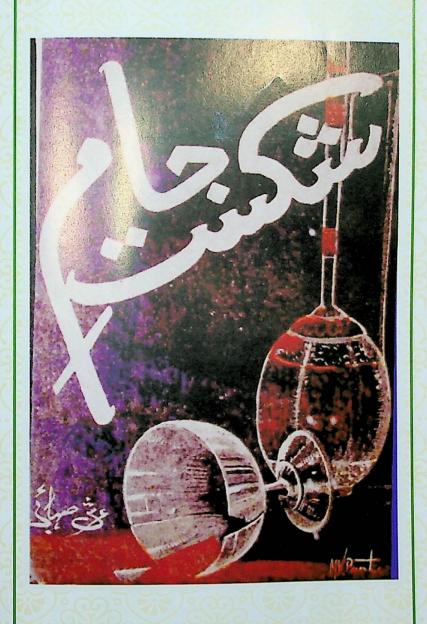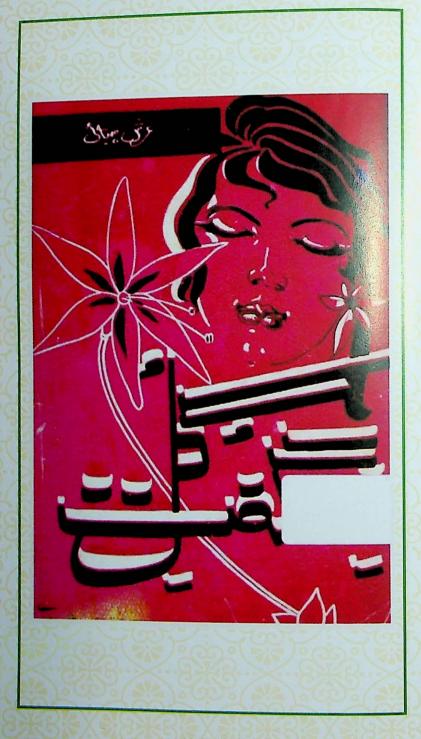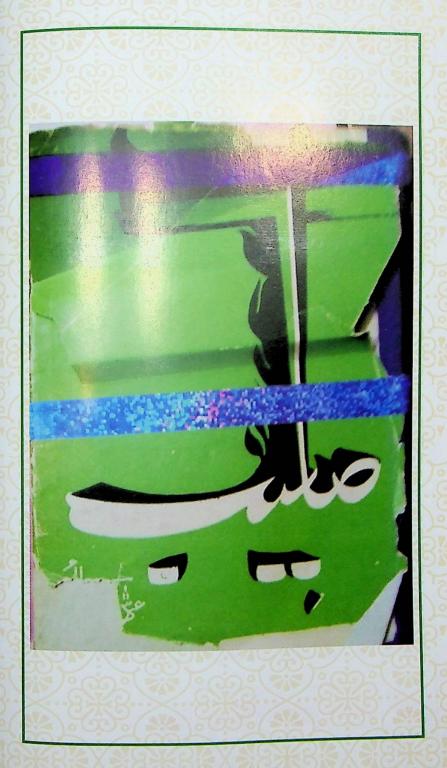
سلیم سالک، شمیمہ جانباز، پروفیسر قدوس جاوید، عرش صہبائی

سرکردہ ادبا کے ساتھ عرشؔ صہبائی کی ایک تصویر

عرشؔ صہبائی - نامور شعراء اور قلمکاروں کے ساتھ ایک یادگار تصویر

عرشؔ صہبائی اور ولی محمد اسیرؔ کشتواڑی

شکستہ جام
عرشی صہبائی

عرش صہبائی

اسلوب
عرش صہبائی

اساس
عرش صہبائی

توازن
عرش صہبائی

چشمِ نیم باز
عرشؔ صہبائی

خدوخال
عرش صہبائی

Urdu SHEERAZA

ISSN NO: 832-2277-9833
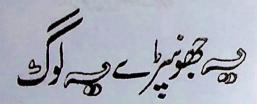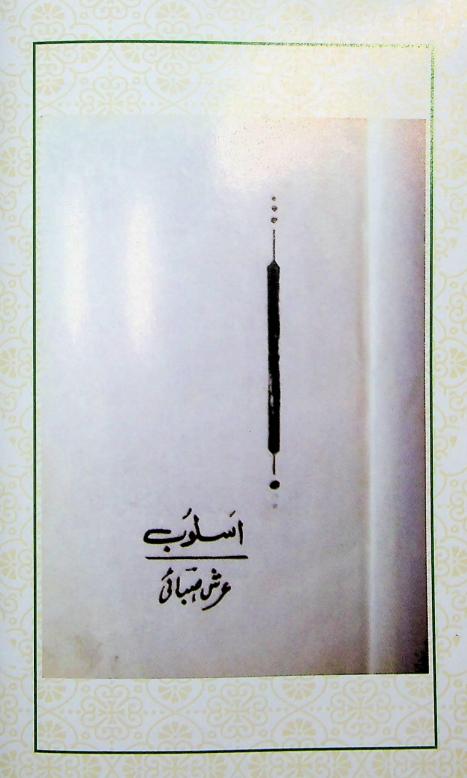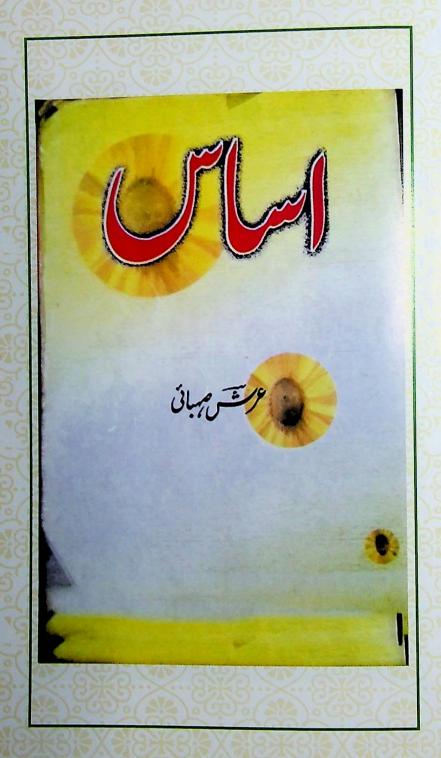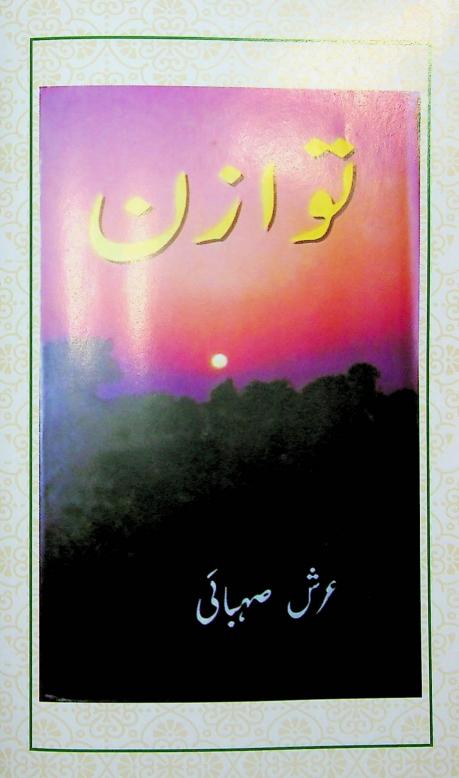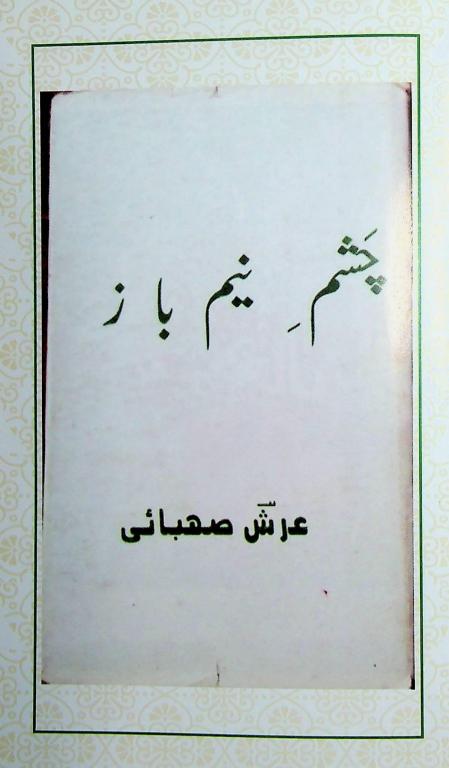
ARSH SEHBAI NUMBER

Volume: 56 Number: 3-4

Chief Editor:
M. Ashraf Tak

Published by:
J&K Academy of Art, Culture and Languages